طالبینِ حق اور مبلّغینِ اسلام کے لیے خصوصی ہدایات

خطباتِ غزالی رحمۃ اللہ علیہ

منبر

مؤلف

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

طالبینِ حق اور مبلغینِ اسلام کے لیے خصوصی ہدایات

الاربعین للغزالی رحمۃ اللہ علیہ

موسوم بہ

خطباتِ غزالی رحمۃ اللہ علیہ

مؤلف
حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

مترجم ڈاکٹر سید عامر گیلانی

شبیر برادرز ◎ اردو بازار ◎ لاہور

نام کتاب : ———— خطبات غزالی

مصنف : ———— حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

مترجم : ———— ڈاکٹر سید عامر گیلانی

سن طباعت : ———— جولائی ۱۹۹۳ء

ناشر : ———— شبیر برادرز اُردو بازار لاہور

پرنٹرز : ———— بک پرنٹرز لاہور

قیمت : ———— =/75 روپے

فہرست

عرضِ مترجم

حجتہ الاسلام حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ رحمتہ اللہ علیہ نے ایک سو سے زائد کتب تحریر فرمائیں جو ان کی زندگی ہی میں شہرت حاصل کر گئیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان تصانیف میں سے کچھ نایاب ہوتی چلی گئیں۔ ایسی کتابوں میں سے ایک **"الاربعین للغزالی"** بھی ہے۔ جس کا ایک قلمی نسخہ کافی کوشش کے بعد میں حاصل کرنے میں الحمد للہ کامیاب ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوا کہ اس کتاب کے ترجمے کی ہمارے عربی زبان سے ناواقف اسلامی بہن بھائیوں بالخصوص مبلغین کو کس قدر ضرورت ہو سکتی ہے لہٰذا ایک سال قبل میں نے اس نایاب کتاب کا ترجمہ شروع کیا جو اب آپ کے سامنے ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ مبلغینِ اسلام اس کتاب کے مطالعہ کے دوران یہ محسوس کریں گے کہ گویا حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ ہدایات پر مشتمل چالیس خطابات انہی کے لئے ارشاد فرمائے ہیں۔

ساتھ ہی میں ان تمام احباب بالخصوص استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرشید سیالوی القادری دامت برکاتہم العالیہ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس سلسلہ میں خصوصی توجہ فرمائی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس تعاون اور مجھ ناقص بندے کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور ہم سب کو اس غزالی گلدستے سے اپنی اپنی قسمت کے پھول چن کر دلوں کو معطر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ

ہماری عملیات اور وظائف کی مؤثر کتب

علامہ عالم فقری کی کتب	دیگر مصنفین کی کتب
فقری مجموعہ وظائف	شمع شبستان رضا مکمل چار حصے
خزینہ درود شریف	مجموعہ اعمال رضا مکمل تین حصے
روحانی وظائف	خزینہ عملیات
	حرز سلیمانی
روحانی عملیات	نقش سلیمانی مکمل چار حصے
اسم اعظم	مجرب عملیات و تعویزات
قرآنی عملیات الموسوم اذکار قرآنی	ذخیرہ عملیات

شبیر برادرز ۴۰ بی اردو بازار۔ لاہور

ابتدائیہ

اللہ عزّ و جلّ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن اور رحیم ہے

تمام تعریفیں سارے جہانوں کے پروردگار کے لئے ہیں۔ اتنی تعریفیں کہ جو مقابل ہوں اس کی نعمتوں کے اور اس کی ہر زائد شدہ نعمت کے لئے کافی ہوں اور درود و سلام ہو اس کے رسول پر جن کا نام نامی اسم گرامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین پر اور اچھی عاقبت ہے ان لوگوں کے واسطے جنہوں نے اپنی زندگیوں کو سیّد المرسلین والمتقین صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری میں سنوارا۔

ہم قرآن کے متعلق کتاب الجواہر کی تیسری قسم کے متعلق تحریر کر چکے ہیں جو کہ حجتہ الاسلام حضرت غزالی رحمتہ اللہ علیہ کی تصنیف ہے اور یہ ہم نے ان کی اجازت کے بعد لکھا ہے' چونکہ انہوں نے فرمایا ہے کہ جو چاہے اسے لکھ سکتا ہے اور انہوں نے اس کا نام "کتاب الاربعین فی اصول الدین" رکھا ہے اسی کو **"الاربعین للغزالی"** بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی یہ کتاب علوم و اعمال کی طرف منقسم ہے اگر علوم کو لیا جائے تو ان علوم کا ماحصل دس اصول ہیں اور اگر اعمال کو لیا جائے تو ان کی تقسیم ظاہر اور باطن کی طرف ہوتی ہے۔

بے شک اعمالِ ظاہرہ کا دارومدار دس اصولوں پر ہے جبکہ اعمالِ باطنہ دو شاخوں پر مشتمل ہے۔

(۱) اعمالِ باطنہ کی پہلی قسم صفاتِ بد سے اجتناب ہے جن کے اجتناب سے دل پاکیزہ ہوتا ہے اور ان صفات بد کا رجوع بھی دس اصول کی طرف ہوتا ہے۔

(۲) اعمالِ باطنہ کی دوسری قسم اچھے اخلاق اور صفات کو اختیار کرنا ہے جن سے دل مزیّن ہوتا ہے۔ ان اچھی صفات کا رجوع بھی دس اصول کی طرف ہے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ چار قسمیں ہیں اور ان چاروں میں سے ہر ایک کی دس شاخیں ہیں۔ جن سے چالیس اصول سامنے آتے ہیں۔ اب ہم ان چالیس اصولوں کے بارے میں حجتہ الاسلام رحمتہ اللہ علیہ کی ہدایات سنیں گے۔

توحید کے دس اصول

(۱) اللہ عزّ و جلّ کی ذات مبارک:۔

تمام تعریفیں اللہ عزّ و جلّ کے لئے ہیں جس نے پہچان کرائی اپنے بندوں کی اپنی کتاب میں جو نبی مرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر نازل کی گئی کہ بے شک واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ بے نیاز ہے اس کی کوئی ضد نہیں ہے۔ وہ ایک ہے اس کا کوئی ہم قرین نہیں اور یہ کہ وہ قدیم ہے اس کا آغاز نہیں وہ ازلی ہے اس کا وقتِ ابتداء نہیں۔ ہمیشہ رہنے والا ہے اس کی آخرت نہیں، دائم ہے اس کی اِنتہا نہیں، ہمیشہ بزرگی کی صفتوں سے موصوف رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ زمانوں کا گزرنا اسے ختم نہیں کر سکتا اور وقت کا آنا جانا اسے منتہٰی نہیں کر سکتا بلکہ وہ تو اول ہے آخر ہے اندر ہے باہر ہے۔

(۲) اللہ عزّ و جلّ کی ذات کی تقدیس:۔

اللہ تعالیٰ جسم نہیں ہے جس کی تصویر کشی کی گئی ہو اور نہ ہی وہ جوہر محدود ہے۔ اجسام کی طرح وہ تقدیر کا محتاج نہیں اور نہ ہی وہ جسموں کی طرح انقسام اور تجزیئے کو قبول کرتا ہے۔ نہ ہی وہ جوہر تاکہ اس میں جوہر ٹھکانہ پکڑیں اور نہ ہی وہ عرض ہے تاکہ اس میں اعراض سما جائیں بلکہ اس کی طرح کوئی موجود چیز نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس کی طرح ہے اور نہ ہی وہ کسی چیز کی طرح۔ اور عام جسموں کی طرح اس کی کوئی مقدار نہیں اور نہ ہی اس کی (دائری) قطر ہیں اور نہ ہی اس کو جہتیں گھیرتی ہیں اور تمام آسمان بھی اسے گھیر نہیں سکتے اور وہ (ذات باری تعالیٰ) عرش پر اسی طرح تشریف فرما ہے جس طرح کہ اس نے قرآنِ حکیم میں فرمایا ہے (**ثم اُستوی علی العرش**) اور جو معنیٰ مراد لیا وہ یہ ہے کہ ایسا بیٹھنا جو ٹھہراؤ، گھیراؤ، سماؤ اور نقل مکانی سے پاک ہے اور یہ کہ عرش نے اسے اپنے اوپر نہیں اٹھایا ہوا بلکہ عرش اور اس کے اٹھانے والے (فرشتے) اس ذات باری کی قدرت کے کرم میں سمائے

ہوئے ہیں اور اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ نہ صرف عرش کے اوپر ہے بلکہ ہر چیز کے اوپر حتیٰ کہ ہر رائی کے دانے اور ہر خاک کے ذرے کے اوپر۔ اس کی ان اشیاء پر فوقیت و برتری کم و بیش نہیں ہوتی اور اس کی ہر چیز پر برتری آسمان اور عرش کی برتری سے کم نہیں بلکہ وہ عرش پر ایسے ہی درجے پر برتری رکھتا ہے جیسے کہ رائی کے دانے پر برتری رکھتا ہے اور اس اعتبار سے وہ ہر موجود چیز کے قریب ہے۔ وہ بندے سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے کیونکہ اس کا قرب اجسام کے قرب کی طرح نہیں ہے جس طرح کہ اس کی ذات جسموں کی ذاتوں کی طرح نہیں ہے' وہ کسی چیز میں نہیں سماتا اور نہ ہی اس میں کوئی چیز سماتی ہے وہ اس بات سے برتر ہے کہ اسے کوئی جگہ گھیر لے اور اس بات سے پاک ہے کہ اسے کوئی زمانہ محدود کر دے بلکہ وہ تو زمان و مکان کی پیدائش سے قبل بھی تھا اور اب بھی اسی طرح ہے جس طرح کہ پہلے تھا۔ وہ اپنی تمام تجلیاتی صفات کے ساتھ اپنی مخلوقات پر ظاہر ہے اور اس کی ذات کے سوا دیگر صفات کی طرح اس کی صفت میں بھی کوئی شریک نہیں وہ تغیر اور انتقال سے پاک ہے۔ اسے حوادث زمانہ بے نقاب نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسے عارضات ظاہر کر سکتے ہیں بلکہ وہ تو اپنی بزرگی کی صفتوں میں ہر زوال سے پاک اور اپنی صفاتِ کمال میں ہر اضافی تکمیل سے پاک ہے۔ اس کی ذات ازروئے عقل موجود ہے اور ازروئے عیون و ابصار دیکھی گئی ہے۔ صرف ان پر نعمت و کرم کے طور پر جو نہایت نیک ہیں یا پھر وہ متصوّر اس لئے ہے کہ اپنے دیدار عام کی نعمت کو پورا کرے۔

(۳) اللہ عزّ و جلّ کی قدرت:۔

بے شک وہ زندہ ہے قادر و غالب ہے اتنا طاقتور ہے کہ اس کو کوئی قصور اور عجز لاحق نہیں ہوتا اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اس کو فنا اور موت عارض نہیں۔ بے شک وہ تمام بادشاہوں کے بادشاہوں کا مالک ہے وہ تمام جہانوں اور فرشتوں کا مالک ہے۔ ساری عزت و قدرت اسی کی ہے۔ اسی کے لئے تمام بادشاہتیں' تمام قہر' تمام پیدائشیں اور تمام امور کا ذمّہ ہے۔ وہی آسمانوں کو اپنے دستِ قدرت

سے لپیٹنے والا ہے اور تمام مخلوقات اس کی مغلوب ہیں۔ بے شک وہ پیدا کرنے اور ایجاد کرنے میں واحد و لاشریک ہے۔ تمام پیدائشی اور اختراعی عوامل میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی نے مخلوقات اور ان کے عوامل کو پیدا کیا اور ان کے رزق انہیں مہیا کئے اور ہر چیز ہر کام کا وقت مقرر کیا اس کے قبضے سے کوئی مخلوق کھسک نہیں سکتی اور اس کی قدرت سے تمام امور کو نپٹانا پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ بے شک اس کی قدرتوں کا شمار ہی نہیں اور اس کی معلومات کی کوئی حد نہیں۔

(۴) اللہ عزّ و جلّ کا علم:۔

بے شک وہ تمام معلومات کا جاننے والا ہے۔ احاطہ کرنے والا ہے ان چیزوں کا جو زمینوں کی جڑوں سے لے کر اعلیٰ آسمان تک ہیں۔ زمین و آسمان میں رائی کے دانہ کے برابر کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے بلکہ سخت اندھیری رات میں مضبوط سیاہ پتھر میں خاموشی سے حرکت کرتی ہوئی سیاہ چیونٹی کے حالات و حرکات سے واقف ہے بلکہ ہر ذرّے کا ہوا میں اڑنا بھی اس کے علم میں ہے وہ ہر راز اور پوشیدگی سے واقف ہے۔ اس کی ذاتِ اقدس ضمیروں کی آوازوں پر نظر رکھے ہوئے ہے اور وہ عقلی حرکات اور پوشیدہ راز بھی جانتا ہے۔ اس کا علم قدیم اور ازلی ہے اور وہ اس ابتدائی اور انتہائی علم سے ہمیشہ موصوف رہا ہے اور وہ (ہماری طرح) نقل مکانی کر کے اور حالات میں گھل مل کر علم حاصل نہیں کرتا۔

(۵) اللہ عزّ و جلّ کا ارادہ:۔

بے شک وہ کائنات کو ارادے کے ساتھ بنانے والا ہے۔ اس لئے تمام جہانوں میں کوئی کم یا زیادہ' چھوٹا یا بڑا' برائی یا بھلائی' نفع یا نقصان' کفر یا ایمان' معلوم یا مجہول' فتح یا شکست' کمی یا بیشی' فرمانبرداری یا نافرمانی اس کے حکم کے بغیر اور اس کی قدرت و مشیت کے خلاف ممکن نہیں ہو سکتا۔ وہ جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔ اس کے حکم کو کوئی رد کرنے والا نہیں اس کی قضا کو کوئی لوٹانے والا نہیں ہے اور کوئی بندہ اس کی نافرمانی کر کے بھاگ نہیں سکتا۔ اس کی فرمانبرداری کی

طاقت بھی کسی میں نہیں ہے مگر جسے وہ توفیق اور طاقت دے اگر تمام جن و انس، ملائکہ اور شیاطین اس بات پر جمع ہو جائیں کہ اس کے ارادے کے بغیر جہاں میں کسی چیز کو حرکت دیں تو ایک ذرے کو بھی حرکت نہیں دے سکیں گے یا ٹھہرانا چاہیں تو ٹھہرا نہ سکیں گے۔ بے شک اس کا ارادہ قائم ہونے والا ہے جو اس کی ذات کے ساتھ اس کی تمام صفات میں ہمیشہ موصوف رہا ہے اور وہ اپنے ارادے کے ذریعے شروع ہی سے جب کسی بھی چیز کا ہونا کسی بھی وقت میں چاہتا ہے وہ چیز اسی طرح اسی وقت موجود ہوتی ہے۔ اس کے ہونے میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی بلکہ وہ اسی طرح پائی جاتی ہے جیسے اس نے چاہا ہوتا ہے۔ تمام امور کی تدبیر اور تسخیر کے لئے اسے کسی سوچ و فکر کی حاجت نہیں ہوتی اور تخلیق کے عوامل میں وقتی حالات اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ کسی کام میں مشغول ہونا اسے دوسرے کام سے روک نہیں سکتا۔

(۶) اللہ عزّ و جلّ کی سماعت اور بصارت :۔

بے شک اللہ عزّ و جلّ دیکھنے والا اور سننے والا ہے اس کی سماعت سے کوئی سنی ہوئی چیز یا پوشیدہ چیز مخفی نہیں۔ اس کی نظر سے کوئی دیکھی گئی چیز پوشیدہ نہیں خواہ وہ کتنی ہی باریک کیوں نہ ہو۔ اس کی سماعت کو مسافتوں کی دوری ختم نہیں کر سکتی اور اس کی رؤیت کو اندھیرے ختم نہیں کر سکتے۔ وہ ذات بغیر تیزئ نظر اور پلکوں کے دیکھتی ہے اور اس کی سماعت بغیر کانوں یا پردوں کے سنتی ہے اسی طرح جیسے وہ ہر شے کو بغیر دل کے جانتا ہے اور اپنا غضب اور عذاب کسی آلے یا ذریعہ کے بغیر لاتا ہے۔ پیدا کرنے میں بھی اسے کسی آلے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ صفتوں میں عام مخلوقات کی طرح نہیں اور اس کی ذات بندوں کی ذات کی طرح نہیں ہے۔

(۷) اللہ عزّ و جلّ کا کلام :۔

بے شک وہ کلام کرنے والا، حکم دینے والا، منع کرنے والا، وعدہ کرنے والا اور وعدے پر عمل کرنے والا ہے۔ ایسی گفتگو کے ساتھ جو شروع سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ کلام کرنا اسی کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور یہ گفتگو بندوں کی گفتگو

جیسی نہیں اور اس کی یہ گفتگو ایک آواز نہیں ہے جو ہوا کے دوش کسی تک پہنچے' نہ ہی اس کی گفتگو حروف پر مشتمل ہے جو ہونٹوں کو بند کرنے' زبان کو ہلانے اور مختلف اندازوں سے خارج کئے جاتے ہیں اور یہ کہ قرآن' تورات' زبور' انجیل اس کی کتابیں ہیں جو اس کے پیغمبروں پر اتاری گئیں اور قرآن ایسی کتاب ہے جو اسی لغت میں پڑھی گئی جو مصاحف مشہور اور دلوں میں محفوظ ہے۔ اس کے باوجود وہ ذات باری تعالیٰ قدیم ہے۔ اپنی ذات میں قائم ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کو دلوں اور ورقوں پر منتقل ہونے کو قبول نہیں کرتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ عزّ و جلّ کا کلام آواز اور حرفوں کے بغیر سنا بالکل یونہی جیسے نیک لوگ ذات باری تعالیٰ کو شکل اور رنگ کے بغیر دیکھتے ہیں۔ تو جس کی یہ صفات ہوں وہ حقیقتاً زندہ ہے' عالم ہے' قادر ہے ارادہ رکھنے والا ہے' سننے والا ہے' دیکھنے والا ہے اور کلام کرنے والا ہے' زندگی کے بارے میں علم کے بارے میں' قدرت کے بارے میں' ارادے کے بارے میں' سننے اور دیکھنے کے بارے میں اور گفتگو کرنے کے بارے میں مگر تمام مذکورہ افعال اس کی اصل ذات سے سرزد نہیں ہوتے۔

(۸) اللہ عزّ و جلّ کے افعال :۔

بے شک نہیں ہے کوئی چیز موجود ہونے والی مگر اس حال میں کہ وہ پیدا ہونے والی ہو تو کرتا ہے اس کو اور فیضان کرنے والا ہے اپنے عدل سے اچھے طریقوں پر مکمل اور اتم اور اعلیٰ طریقوں پر اور بے شک وہ حکیم ہے۔ اپنے افعال میں اور عادل ہے اپنے فیصلوں میں۔ اس کے عدل کا بندوں کے عدل کے ساتھ قیاس کرنا بھی ممکن نہیں کیونکہ بندے سے ظلم متصوّر ہو سکتا ہے اور وہ دوسرے کی ملکیت میں تصرّف کر سکتا ہے جبکہ اللہ عزّ و جلّ سے ظلم متصوّر نہیں۔ پس بے شک وہ اپنے غیر کی ملکیت میں تصرف نہیں کرتا کیونکہ تمام ملک تو اسی کا ہے اور کسی غیر کا ملک ہونا اس کے نزدیک متصوّر ہی نہیں۔ جب اس کے نزدیک متصوّر ہی نہیں تو اس کا اس ملک میں تصرّف کرنا ظلم کیسے ٹھہر سکتا ہے۔ اور اس کے علاوہ ہر چیز خواہ وہ انسان ہو'

جن ہو' شیطان ہو یا فرشتہ ہو' آسمان ہو' زمین ہو' جانور ہو' نبات ہو' جوہر ہو' عرض ہو' مدرک ہو' محسوس ہو تمام کے تمام حادث ہیں (جو فنا کو قبول کرے) جن کو اس نے اپنی قدرت کے ساتھ عدم سے پیدا کیا اور اس کو پیدائش اس حالت میں بخشی کہ یہ وہ کچھ بھی نہ تھا کیونکہ ہر چیز کے پیدا کرنے سے پہلے' شروع ہی سے اللہ عزّ و جلّ موجود تھا' تنہا تھا' اس کا کوئی شریک نہ تھا۔ دریں اثناء اس نے مخلوقات کو قدم سے پیدا کیا تاکہ وہ اپنی قدرت کا اظہار کرے (اور اس پیدائش کے عمل میں) اس کا اپنا ارادہ کرنا مقصود تھا اور اس بات کو پورا کرنا مقصود تھا جو شروع سے ہی اس نے فرما رکھی تھی اور یہ کہ مخلوقات کی پیدائش اس لئے نہیں کہ وہ ان کا محتاج ہے اور ان کی اسے ضرورت ہے اور یہ کہ وہی پیدا کرنے' ایجاد کرنے اور تکلیف دینے کے لائق ہے اور یہ تمام مذکورہ افعال اس پر واجب بھی نہیں ہیں۔ وہی انعام دینے اور اصلاح بخشنے میں بہت سخی ہے اور یہ انعام دینا اس پر لازم نہیں ہے کیونکہ تمام کا تمام فضل' احسان' نعمت اور بخشش اسی کی ہے کیونکہ وہ چاہتا تو بندوں پر مختلف قسم کے دردناک عذاب ڈھاتا اور ان کی آزمائش مختلف تکالیف و آلام سے کرتا اور اگر وہ یوں کرتا تو یہ بھی اس کا عدل ہوتا اور یہ ہرگز برائی یا ظلم نہ ہوتا اور یہ کہ وہ اپنے بندوں کو اپنے کرم اور وعدے کے ذریعے فرمانبرداری پر ثابت قدمی بخشتا ہے۔ حق دینے اور لازم ہونے کی وجہ سے نہیں (بندے کو فرمانبرداری پر ثابت رکھنا اس پر لازم نہیں ہے) اس لئے کہ اس پر کوئی فعل واجب نہیں اور نہ ہی اس سے ظلم متصوّر کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پر کسی کا حق ہے بلکہ اس کا حق جو بندوں پر فرمانبرداری کے نام سے لازم ہے یہ اسی نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے اپنے بندوں پر لازم کیا ہے۔ یہ محض عقل کے ذریعے ہی نہیں کر دیا بلکہ پیغمبر بھیجے اور ان کی سچائی بذریعہ معجزات ظاہر کی حتیٰ کہ وہ حکم دینے' منع کرنے' وعدہ کرنے اور ڈرانے کے رتبے تک پہنچ گئے تو بندوں پر ان کی اور ان کے ساتھ آنے والی چیزوں کی تصدیق لازم ہو گئی۔

(۹) یوم آخرت:۔

بے شک اللہ عزّو جلّ موت کے ذریعے ارواح کو جسموں سے الگ کرتا ہے اور پھر حشر کے دن دوبارہ ان کو اجسام میں لوٹا دیتا ہے وہی قبروں کو الٹ پلٹ کرتا ہے اور سینے کے رازوں کو جانتا ہے اور ہر مکلّف شخص دیکھتا ہے اور اس کے اچھے بُرے عمل کو اپنے سامنے پاتا ہے اور وہی بندے کے ہر چھوٹے موٹے کام کو ایسی کتاب میں اپنے سامنے لاتا ہے جو کتاب کسی چھوٹی موٹی بات کو نہیں چھوڑتی بلکہ اسے شمار کرتی ہے اور ہر بندے کو اس کے کام کی مقدار دکھا دیتا ہے جو اس نے نیکی یا بدی سے کیا۔ ایک ایسے معیار کے ساتھ جو سچا ہے اور جس کا نام میزان ہے اور یہ میزان اعمال اجسام کے میزانوں کی طرح نہیں ہے اور یہ اضطراب کی طرح بھی نہیں ہے جو کہ وقت ماپنے کا آلہ ہے اور نہ ہی یہ مقداروں اور اشیاء کو ماپنے والے پیمانوں کی طرح ہے۔ پھر وہ بندوں کا حساب ان کے افعال' اقوال' راز' ضمیروں نیتوں اور عقیدوں کے لحاظ سے کرتا ہے خواہ انہوں نے اسے ظاہر کیا ہو یا نہ اس دن (یوم آخرت میں) بندوں کی بہت سی قسمیں ہیں کوئی تو حساب میں گفتگو کرنے والا ہوتا ہے' کوئی حساب میں بخش دیا جاتا ہے اور کوئی بغیر حساب کے ہی جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے پھر سب کو صراطِ مستقیم پر لے جایا جاتا ہے جو کہ ایک پُل ہے جو کم بختوں اور خوش بختوں کی منازل کے درمیان کھینچا گیا ہے' تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس پر وہ بندہ باآسانی گزر سکتا ہے جو دنیا میں اس صراط مستقیم پر گامزن رہا جو پُلِ صراط کی مانند مشکل اور دشوار گذار ہے۔ جبکہ بخش دیا گیا کرم باری تعالٰی سے (وہ پُل صراط کی تنگیوں سے بچ جائے گا) پھر ان سے پوچھا جائے گا ہاں اللہ عزّوجلّ پیغمبروں میں سے جس سے چاہے گا اُس کی تبلیغِ رسالت کے بارے میں پوچھے گا اور کافروں میں سے جس سے چاہے گا پیغمبروں کو جھٹلانے کے بارے میں اور مسلمانوں میں سے جس سے چاہے گا ان کے اعمال کے بارے میں پوچھے گا۔ بے شک وہ سچوں سے ان کی سچائی اور منافقوں سے ان کے نفاق کے بارے میں پوچھے گا۔ پھر نیک بخت رحمٰن کی طرف وفود کی شکل میں چلائے جائیں گے جبکہ مجرم جہنم کی طرف گروپوں کی شکل میں ہانکے جائیں گے پھر توحید پرستوں کو جہنم کی آگ سے

کے برے اعمال کی سزا دے کر نکالا جائے گا حتیٰ کہ جہنم میں کوئی ایسا بندہ باقی نہ رہے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو گا جبکہ بعض کو ان کی سزا پورا ہونے سے قبل ہی انبیاء علیہم السلام کی شفاعت (سفارش) کی وجہ سے جہنم سے نکالا جائے گا یا علماء و شہداء کی شفاعت سے یا اس بندے کی شفاعت سے جسے اس کا حق بخشا گیا۔ پھر نیک بخت لوگوں کو جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نعمتوں کے زیر سایہ رکھا جائے گا اور اللہ عزّ و جلّ کے وجۂ کریم کی نعمت سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے اور جہنمی ہمیشہ جہنم میں مختلف اقسام کے عذابوں سے گزرتے رہیں گے اور اللہ عز و جل کے وجہ کریم سے محجوب رہیں گے۔

(۱۰) نبوت :۔

بے شک اللہ عزّ و جلّ نے فرشتوں کو پیدا کیا اور انبیاء و رسل علیہم السلام بھیجے اور معجزات کے ذریعے ان کی تائید فرمائی اور یہ کہ تمام کے تمام فرشتے اللہ عزّ و جلّ کی عبادت کرتے ہیں اس سے روگردانی نہیں کرتے اور نہ ہی کتراتے ہیں بلکہ دن رات سجدے کرتے رہتے ہیں اور بھٹکتے نہیں تمام انبیاء علیہم السلام اس کے پیغامات پہنچانے والے (پیغمبر) ہیں۔ جنہیں اللہ عزّ و جلّ نے اپنے بندوں کی طرف بھیجا اور وہ فرشتوں کے ذریعے ان پر وحی نازل فرماتا رہا۔ انبیاء علیہم السلام جو بھی بات کرتے ہیں دراصل وحی ہوتی ہے ان کی طرف سے من گھڑت بات نہیں ہوتی اور یہ کہ اس نے سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کہ امی و قریشی ہیں اپنے پیغام کے ساتھ تمام عرب و عجم اور جن و انس کی طرف مبعوث فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شریعت سے تمام سابقہ شریعتوں کو منسوخ فرما دیا اور اس پروردگار نے سرکار شافعِ روز شمار صلی اللہ علیہ وسلم کو سیّد البشر بنایا اور ایمان کی تکمیل اپنے نام کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی ملائے بغیر نامکمل ٹھہرائی "لا الہ الا اللہ" اس وقت تک ہرگز مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے ساتھ "محمد رسول اللہ" کی گواہی نہ ملائی جائے۔ بندوں پر یہ لازم ٹھہرایا کہ وہ اس کی تمام باتوں میں تصدیق کریں جو سرکار صلی اللہ علیہ وسلم دنیا و آخرت کے بارے میں فرماتے ہیں اور

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع لازم ٹھہرائی اور یہ فرمایا **"ما آتٰکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا"** پس نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں تک ہر اس بات کو پہنچا دیا جو انہیں اللہ عزّ و جلّ کی طرف لے جاتی ہو اور بے شک اللہ عزّ و جلّ کی رضا کی طرف جانے کا راستہ بھی بتایا۔ اسی طرح کوئی ایسی بات نہ چھوڑی جو جہنم تک پہنچاتی ہو اور اللہ عزّ و جلّ سے دور کرتی ہو مگر ان سے لوگوں کو روکا اور برائی کا ہر راستہ واضح فرما دیا۔ ایسی باتوں پر دلالت کرنا مطلقاً عقل و ذہانت کا کام نہیں ہے بلکہ یہ بعض پوشیدہ رازوں کو اٹھا لینے سے ہی میسر آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے دربارِ اقدس سے انبیاء علیہم السلام کے مقدس دلوں پر ظاہر کئے جاتے ہیں۔

بے شک تمام تعریفیں اللہ عزّ و جلّ کے لئے ہیں اس بات پر کہ اس نے ہدایت بخشی اور رہنمائی فرمائی اور اپنے اسمائے حسنہ اور اعلیٰ صفات سے ہمیں روشناس فرمایا اور درود و سلام کے نذرانے مقبول ہوں اللہ عزّ و جلّ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دربارِ اقدس میں اور فیضانِ رحمت ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب و آل پر (رضوان اللہ اجمعین)

اس باب کی ضروری ہدایات

آخر میں ان کتابوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جن سے ان عقائد کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ خوب یاد رکھو کہ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ قرآن کریم کا ماحاصل ہے یعنی اللہ عزّ و جلّ پر ایمان' یومِ آخرت پر ایمان وغیرہ اور یہی اس عقیدے کی ترجمانی ہے جس پر ہر مسلمان کو حاوی ہونا چاہئے اس انداز میں کہ وہ اس عقیدے کی تصدیق بھی کرتا ہو ایسی تصدیق جس میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس عقیدے کے بعد دو مرتبے ہیں ایک تو یہ کہ اس عقیدے کی دلیلوں کو غور و فکر کئے بغیر تسلیم کرنا اور دوسرا یہ کہ اس کے اسرار کو معانی کے مغز کو اور اس کی حقیقتِ ظاہری کو جاننا اور یہ دونوں مرتبے تمام عوام پر واجب نہیں ہیں میری مراد یہ ہے کہ ان کی نجات کا ذریعہ یہی دو رتبے نہیں ہیں اور نہ ہی اس کا فیضیاب ہونا ان مرتبوں کا محتاج ہے بلکہ مکمل خوش بختی کے لئے آخرت میں سرخرو ہونا ہی ضروری ہے۔

مذکورہ نجات سے میری مراد عذابِ الٰہی سے بچنا ہے اور فیضیاب ہونے سے مراد اصل نعیم کو پانا ہے جبکہ سعادت مندی سے میری مراد نعمت کی اتاہ گہرائیوں کو پانا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے ایک بادشاہ کسی شہر کو اپنے قبضے میں لیتا ہے تو سب سے پہلے جبراً اسے فتح کرتا ہے اس کے بعد جسے وہ نہ قتل کرے اور نہ ہی ستائے نجات پانے والا کہا جاتا ہے خواہ اسے بادشاہ شہر بدر کر دے اور جسے اذیت نہیں دیتا بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو اپنے رہنے کے لئے جگہ دیتا ہے اور ہر ضرورتِ زندگی پوری کرتا ہے تو اس شخص کو نجات پانے والا کے ساتھ ساتھ کامیاب بھی کہا جاتا ہے اور جس پر بادشاہ اتنی کرم نوازی کرے کہ اسے اپنی بادشاہی میں شریک کرے اور امورِ مملکت و امارت کا خلیفہ بنا لے تو اسے نجات اور کامیابی کے ساتھ سعادت مند بھی کہا جائے گا اسی طرح سعادت مندی کے بھی بے شمار رتبے ہیں۔

خوب جان لے کہ آخرت میں خلقِ الٰہی ان مذکورہ بالا اقسام کے علاوہ بہت

ساری اقسام میں منقسم ہوں گے اس کی شرح ہم نے ممکن حد تک کتاب "التوبہ" میں کر دی ہے پس اس میں تلاش کرو اور دونوں مرتبوں میں سے پہلا مرتبہ جیسا کہ بیان کیا کہ اس عقیدہ کی ظاہری دلیلوں کی پہچان ہے تو اس کا بیان ہم نے بیس صفحات میں "رسالہ قدسیہ" میں لکھ دیا ہے اور یہ مرتبہ "قواعد العقائد" کی کتاب کی ایک پوری فصل ہے جبکہ قواعد العقائد کتبِ احیاء سے لی گئی ہے اور اس رتبے کے متعلق دلیلیں مزید تحقیق اور تنقید کے ساتھ بمعہ سوال و جواب کتاب "الاقتصار فی الاعتقاد" میں ہم نے تحریر کر دی ہیں جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ایک منفرد و مستقل کتاب ہے۔ جو علم کلام کے ماحصل کا مجموعہ ہے مگر تحقیق و تفصیل میں اور معرفتِ کلام کے دروازوں کو کھٹکھٹانے میں یہ دوسری کتابوں کی نسبت زیادہ قریب ہے۔ میری مراد مذکورہ کلام سے وہ کلام ہے جو متکلّمین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اور جس کا تعلق اِعتقاد سے ہے معرفت سے نہیں کیونکہ متکلّم اور عام شخص میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا کہ متکلّم تو عارف ہے اور عام شخص صرف اِعتقاد رکھنے والا ہے بلکہ وہ متکلّم بھی اِعتقاد رکھنے والا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ متکلّم اپنے اِعتقاد کے ساتھ ساتھ اِعتقاد کی دلیلوں کو بھی جانتا ہے تاکہ وہ اپنے اِعتقاد کو بڑھائے اور اس کی ہر گڑ بڑ اور بدعت سے حفاظت کرے اور اِعتقاد کی گرہ معرفت کی تفصیل و بسط سے نہیں کھلتی۔ تو اگر چاہے کہ معرفت کی خوشبوؤں میں سانس لے تو تجھے اس کی بعض مقدار "کتاب الصبر والشکر" میں اور "کتاب المحبۃ" اور "کتاب التوکل" کے باب التوحید سے مل سکتی ہے اور تمام کتب کتاب الاحیاء میں ہیں اور اس کی اچھی مقدار جو کہ تمہیں معرفت کے دروازوں پر دستک دینے کا طریقہ بتائے گی "کتاب المقصد الاقصیٰ فی معانی اسماء الحسنیٰ" سے مل سکتی ہے۔ بالخصوص ان اسماء میں جو افعال سے مشتق ہیں اور اگر تو اصل معرفت کو جاننا چاہتا ہے جو اس حقیقت کے متعلق ہے تو وہ تجھے بغیر کسی شک و شبہ اور مراقبت کی تکلیف اٹھائے ہماری صرف چند کتب ہی سے مل سکتی ہے اور خبردار! بچ جا تو اس سے کہ اترائے اور پیدا کرے اپنے دل میں اہلیت پس تو گردن بلند کرے اس کی طلب میں پس تو نشانہ بن جائے مشافہ کے لئے صریح رد کے

ساتھ مگر یہ کہ تو اپنے اندر تین خصلتیں جمع کرے۔

(۱) علومِ ظاہرہ میں مہارت رکھتا ہو اور ان میں اِمامت کے اعلیٰ رتبے پر فائز ہو۔

(۲) تیرا دل دنیا سے اکھڑا ہوا ہو حتیٰ کہ اس میں کوئی مذموم شہ باقی نہ رہی ہو جیسا کہ آگے مذمومہ عادات کے بیان میں آئے گا اور تو اتنا برائی سے پاک ہو کہ تیرے اندر حق کو پانے کی پیاس کے علاوہ کوئی اور پیاس نہ ہو اور تو حق کو پانے کے اہتمام کے علاوہ کوئی اہتمام نہ کرے۔ علاوہ ازیں تیرا کوئی عمل حصولِ حق کے علاوہ نہ ہو اور تیرا عروج صرف حق پانے میں ہو۔

(۳) یہ کہ سعادت مندی تیری فطرت میں ہو اور بے حد ذہانت و فطانت سے مزّین ہو ایسی سعادت مندی جو علم کے اسرار و رموز (پوشیدگیوں) کو فوراً پانے کی اہلیت رکھتی ہو۔

بے وقوف آدمی (اگر ان کتابوں اور معرفت کے بلند رتبوں کی طرف جائے گا) تو اپنا ذہن تھکا لے گا اور بڑے عزم کے بعد بہت لمبے عرصے میں بہت تھوڑی دلیلیں پائے گا جبکہ معرفت کو پانے سے عاجز آئے گا۔ معرفت صرف وہ پا سکتا ہے جس کا دل شیشے کی طرف چمکدار ہو اور یہ صرف فطرت کی پختگی کی وجہ سے اور تمام تر گندگیوں کو اتار کر صحیح ہونے سے ہی ممکن ہے کیونکہ گندگیوں والا دل زنگ آلود ہوتا ہے اور یہ وہ دل ہے جسے اللہ عزّ و جلّ محروم رکھتا ہے۔

اعمال ظاہری کے دس اصول

(ا) نماز

اللہ عزّ و جلّ فرماتا ہے کہ "نماز قائم کرو میری یاد کے لئے" اور سرکارِ دو عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "نماز دین کا ستون ہے" خوب جان لو کہ تم نماز میں اپنے ربّ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتے ہو لہٰذا خیال رکھا کرو کہ تم نماز کیسی پڑھ رہے ہو اور چونکہ اللہ عز و جل نے نماز کے درست کرنے کا حکم فرمایا ہے نماز اور اس کے متعلق ہر ضرورت کا بالخصوص ان تین باتوں کا خصوصی اہتمام کے ساتھ لحاظ رکھنا چاہئے۔

(i) نماز سے قبل وضو کی نگہداشت :۔

نماز سے قبل وضو کی نگہداشت کیا کرو۔ نگہداشت کا طریقہ یہ ہے کہ وضو کی تمام سنتوں اور مستحبات کو بھی بجا لایا جائے اور ہر عضو کے دھوتے وقت وہ دعا پڑھی جائے جو مسنون ہے۔ ساتھ ہی کپڑوں اور وضو کے پانی کی پاکی کا خیال رکھا جائے کہ دونوں پاک ہوں۔ لیکن اس میں اتنا بھی مبالغہ نہ ہو کہ وسواس تک نوبت پہنچ جائے کیونکہ یہ وسوسہ شیطانی ہے اور شیطان اکثر اوقات عبادت کرنے والے نیک بندوں کا وقت ضائع کرنے کے لئے وسوسوں کا سہارا لیتا ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ نمازی کے کپڑوں کی مثال ایسی ہے جیسے باہر کا چھلکا اور دل کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کی گری (مغز) ظاہر ہے کہ مقصود تو مغز ہی ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اس ظاہری طہارت سے بھی دل کا پاک ہونا اور اس کو نورانی بنانا مقصود ہے۔ یہاں تمہارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ کپڑوں کے دھونے سے دل کس طرح پاک ہو سکتا ہے لہٰذا جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر اور باطن میں ایک ایسا خاص تعلق رکھا ہے جس کی وجہ سے ظاہری طہارت کا اثر باطنی طہارت تک ضرور پہنچتا ہے۔ اس حقیقت کو دیکھنا چاہو

تو دیکھ سکتے ہو کہ جب تم وضو کر کے کھڑے ہوتے ہو تو اپنے دل میں ایسی صفائی اور فرحت (انشراح) پاتے ہو جو وضو سے پہلے نہ تھی۔ ظاہر ہے یہ وضو (یعنی ظاہری طہارت) ہی کا اثر ہے جو بدن سے دل تک پہنچتا ہے۔

(ii) نماز کے جملہ ارکان کی ادائیگی :۔

نماز کے جملہ ارکان خواہ سنتیں ہوں یا مستحبات ذکر ہو یا تسبیح سب کو اپنے قاعدے پر ادا کرو اور یاد رکھو کہ جس طرح بدن کی ظاہری طہارت نے دل کی باطنی صفائی میں اثر دکھایا اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نماز کے ارکان کا اثر دل پر ہوتا ہے اور نورانیت پیدا ہوتی ہے جس طرح مریض کو دوا پینے سے ضرور نفع ہوتا ہے اگرچہ دوا کے اجزاء کی تاثیر سے واقف نہ ہو' اسی طرح تمہیں نماز کے ارکان ادا کرنے سے ضرور نفع پہنچے گا اگرچہ تم اس کے اسرار و رموز سے ناواقف ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح جاندار مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے روح اور شکل عطا فرمائی ہے بالکل اسی طرح نماز کو بھی ایک صورت اور روح مرحمت فرمائی ہے چنانچہ نماز کی روح تو نیت اور دل ہے اور قیام و قعود نماز کی صورت (یعنی بدن) ہے اور رکوع و سجود نماز کے اعضا (سر اور ہاتھ پاؤں) ہیں۔ جس قدر اذکار و تسبیحات نماز میں ہیں وہ نماز کے آنکھ کان وغیرہ ہیں اور ان کے معنی کو سمجھنا گویا آنکھ کی بینائی اور کانوں کی سماعت وغیرہ ہے۔ نماز کے تمام ارکان کو اطمینان اور خشوع و خضوع (عاجزی و انکساری) کے ساتھ ادا کرنا نماز کا حسن یعنی بدن کا سڈول اور رنگ و روغن کا درست ہونا ہے۔ الغرض اسی طرح نماز کے اجزاء اور ارکان کو قاعدے کے مطابق لگن اور اہتمام کے ساتھ ادا کرنے سے نماز کی ایک حسین و جمیل اور پیاری صورت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے نمازی کو قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اس کی مثال ایسے سمجھو جیسے کوئی خادم اپنے بادشاہ (مالک) کی خدمت میں کوئی حسین و جمیل کنیز تحفہ کے طور پر پیش کرے اور اسے بادشاہ سے اس دوران قرابت حاصل ہو پس اگر تمہاری نماز میں خلوص نہیں ہے تو گویا مردہ اور بے جان یا بدصورت کنیز بادشاہ کی نذر کر رہے ہو' ظاہر ہے ایسا کرنا گستاخی اور بے باکی ہے کہ ایسا گستاخ شخص بادشاہ کے دربار سے

انعام و اکرام کی جگہ قتل کی سزا ہی پایا کرتا ہے۔ اگر نماز میں رکوع و سجود نہیں ہے تو گویا تم اپنے مالک کے حضور لنگڑی' لولی اور اپاہج کنیز پیش کر رہے ہو اور اگر ذکر و تسبیح نہیں تو گویا لونڈی کے آنکھ کان نہیں ہیں اور اگر سب کچھ موجود ہے مگر ذکر و تسبیح کے معنی نہیں سمجھے اور نہ دل متوجہ ہوا تو ایسا ہے جیسے کہ اعضاء تو سب موجود ہیں لیکن ان میں حسن و حرکت نہیں یعنی حلقہ چشم موجود ہے مگر بینائی نہیں ہے اور کان موجود ہیں مگر بہرے ہیں کہ سنائی نہیں دیتا۔ ہاتھ پاؤں ہیں مگر شل اور بے حس ہیں اب تم خود ہی سوچ سکتے ہو کہ اندھی بہری کنیز شاہی نذرانہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

شاید تمہیں یہ غلط فہمی ہو کہ نماز کے فرائض و واجبات ادا کر دیئے جاتے ہیں تو علمائے شریعت اس نماز کے درست ہونے کا فتویٰ دے دیتے ہیں خواہ معنی سمجھ میں آئے یا نہیں اور جب نماز صحیح ہو گئی تو جو مقصود تھا حاصل ہو گیا' اس سے معلوم ہوا کہ معنی کا سمجھنا نماز میں ضروری نہیں ہے لہٰذا جان لو کہ علماء طبیب کی طرح ہیں پس اگر کوئی لونڈی اپاہج اور کیسی ہی عیب دار کیوں نہ ہو اگر اس میں روح موجود ہے تو طبیب اس کو دیکھ کر یہی کہے گا کہ یہ زندہ ہے مردہ نہیں ہے تو کیا تم ایسی اپاہج لونڈی کو بادشاہ کی نذر کر کے انعام و اکرام پا سکو گے یا سزا کے حقدار ہو گے؟

اسی طرح نماز کی روح اور اعضائے رئیسہ کے موجود ہونے سے علماء کرام فتویٰ دے دیں گے کہ نماز صحیح ہے فاسد نہیں ہے ایسی صورت میں طبیب نے اور عالم نے اپنے منصب کے موافق جو کچھ کہا وہ بالکل درست ہے مگر نماز تو شاہی نذرانہ اور بادشاہ کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے لہٰذا عیب دار لونڈی اگرچہ زندہ ہو شاہی نذرانہ پیش کرنے کے قابل نہیں۔ اسی طرح اگر ناقص کے ذریعہ سے اللہ عزّوجلّ کا تقرب چاہو گے تو عین ممکن ہے کہ پھٹے کپڑوں کی طرح لوٹا دی جائے اور منہ پر ماری جائے الغرض نماز سے مقصود چونکہ پروردگار کی تعظیم ہے لہٰذا نماز کی سنّتوں' مستحبات اور آداب میں جس قدر کمی ہو گی اسی قدر احترام و تعظیم میں کوتاہی سمجھی جائے گی۔

(iii) نماز کی روح کا خیال رکھنا:۔

نماز کی روح کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہے یعنی نماز میں شروع سے آخر تک دل کو متوجہ رکھنا اور اخلاص پیدا کرنا اہمیت کے حامل ہیں نماز میں شروع سے آخر تک جو کام اعضاء سے کرتے ہو ان کا اثر دل میں بھی پیدا کرو یعنی جب رکوع میں بدن جھکے تو دل بھی عاجزی کے ساتھ جھک جائے اور جب زبان سے اللہ اکبر کہا جائے تو دل میں بھی یہی ہو کہ بے شک اللہ عزّوجلّ ہی سب سے بڑا ہے اور جب الحمدللہ کہو تو دل بھی ربّ ذُوالجلال کی نعمتوں کے شکر سے لبریز ہو جس وقت زبان سے **ایّاک نعبد وایّاک نستعین** نکلے تو دل بھی اپنے محتاج و ضعیف ہونے کا اقرار کرے یعنی دل میں بھی یہی ہو کہ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی چیز کا نہ مجھے کوئی اختیار ہے اور نہ کسی دوسرے کو الغرض تمام ازکار و تسبیحات اور جملہ ارکان میں ظاہر و باطن کو یکساں اور ایک دوسرے کے موافق ہونا چاہئے اور جان لو کہ نامۂ اعمال میں نماز وہی لکھی جاتی ہے جو سوچ سمجھ کر پڑھی گئی ہو پس جتنا حصہ بغیر سمجھے ادا ہو گا وہ درج نہ ہو گا ہاں یہ ضرور ہے کہ شروع میں مکمل طور پر حضورِ قلب (دل کی توجہ) قائم رکھنے میں تمہیں بہت دشواری معلوم ہو گی لیکن اگر عادت ڈال لو گے تو آہستہ آہستہ ضرور عادت ہو جائے گی اس لئے اس طرف توجہ کرو اور اس توجہ کو رفتہ رفتہ بڑھاتے جاؤ مثلاً اگر تمہیں چار فرض پڑھنے ہوں تو دیکھو کہ اس میں حضورِ قلب (دل کی توجہ) تم کو کس قدر حاصل ہوا؟ فرض کرو کہ ساری نماز میں دو رکعت میں تو دل متوجہ رہا اور دو رکعت میں غافل رہا تو غفلت والی دو رکعت کو نماز میں شمار ہی نہ کرو اور اتنی نفلی رکعتیں پڑھو کہ جن میں دو رکعت کے برابر حضورِ قلب کی دولت حاصل ہو جائے۔ الغرض جتنی غفلت زیادہ ہو اسی قدر نفلوں میں اضافہ کرتے جاؤ حتیٰ کہ اگر دس نفلوں میں چار فرض رکعتوں کا حضورِ قلب پورا ہو جائے تو امید کرو کہ اللہ عزّوجلّ اپنے فضل و کرم سے فرائض کا نقصان ان نفلوں سے پورا فرما دے گا اور اس کی کمی کا تدارک نوافل سے منظور فرما لے گا۔

(۲) زکوٰۃ، صدقہ اور خیرات

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانہ کی طرح ہے جس میں سات بالیں ہوں کہ ہر بال میں سو دانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنہوں نے اپنا مال دو ہتڑ بھر بھر کر راہ خدا میں لٹایا ہے وہی ہلاکت سے نجات پائیں گے (مضمون بخاری و مسلم) چونکہ صدقات و خیرات میں مخلوق کی ضرورتیں اور محتاجوں کے فاقے رفع ہوتے ہیں اس لئے یہ بھی دین کا ایک ستون ہے اور اس میں یہ حکمت ہے کہ چونکہ مخلوق کو اللہ عزّوجلّ سے محبت رکھنے کا حکم ہے اور مسلمان بندے اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کو اپنی محبت کا معیار اور آزمائش کی کسوٹی بنا دیا ہے تاکہ مدعیان ایمان کے دعوے کا جھوٹ سچ کھل جائے کیونکہ عام قاعدہ ہے کہ انسان اپنے اس محبوب کے نام پر جس کی محبت دل میں زیادہ ہوتی ہے اپنی تمام مرغوب اور پیاری چیزیں لٹا دیا کرتا ہے پس مال جیسی پیاری چیز کا حق اللہ تعالیٰ کے نام پر خرچ کرنا اس کے ساتھ محبت کے بڑھے ہونے کی علامت ہے اور بخل کرنا اس کی محبت نہ ہونے کی دلیل ہے صدقہ و خیرات دینے والے مسلمان تین طرح کے ہیں۔

اعلیٰ درجہ :۔

صدقہ و خیرات دینے والوں کے اعلیٰ درجہ میں شامل وہ مسلمان ہیں جنہوں نے جو کچھ پایا سب اللہ (عزّوجلّ) کی راہ میں دے دیا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کا دعویٰ سچ کر دکھایا مثلاً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کچھ بھی گھر میں تھا سب سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں لا کر پیش کر دیا اور جب سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اے ابو بکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اپنے لئے کیا رکھا تو عرض کیا "اللہ (عزّوجلّ) اور اللہ کا رسول

(صلی اللہ علیہ وسلم)" اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی خیرات کی غرض سے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مال لائے اور آپ رضی اللہ عنہ سے بھی حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی دریافت فرمایا کہ اے عمر (رضی اللہ عنہ) تم نے اپنے لئے کیا رکھا تو انہوں نے عرض کیا "جس قدر لایا ہوں اسی قدر چھوڑ آیا ہوں" تب آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم دونوں کے مرتبوں کا فرق تم دونوں کے جواب سے ظاہر ہے"

متوسط درجہ :۔

اس درجہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو سارا مال تو اللہ تعالیٰ کے نام پر لٹاتے مگر اس کے ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرتے بلکہ محتاج بندوں کی حاجتیں ظاہر ہونے کے منتظر رہتے ہیں اور جس وقت کوئی مصرف پاتے یا کسی کو محتاج دیکھتے ہیں تو بے حساب مال خرچ کر ڈالتے ہیں' یہ لوگ اپنے مال کی زکوۃ یعنی مقدار فرض پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ سارے مال کو اللہ عزوجل ہی کے لئے خرچ کرنے کی نیت رکھتے ہیں کہ مال پاس رکھنے سے ان کی غرض اس کو اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کرنے کی ہے البتہ موقع محل کا انتظار ہے۔ (یہ مضمون دو حدیثوں کے مضمونوں کا مجموعہ ہے اول کو ترمذی نے حسن و صحیح کہا اور دوم کو ابو نعیم نے مرسل و جید بیان کیا ہے)

ادنیٰ درجہ :۔

اس درجہ میں وہ کمزور مسلمان شامل ہیں جو زکوٰۃ ہی ادا کرنے کو غنیمت جانتے ہیں کہ اگر اس سے زیادہ خیرات نہیں کرتے تو مقدار واجب میں دانہ برابر کمی بھی نہیں کرتے۔ ان تینوں گروہوں کے مرتبوں کا فرق اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی مقدار ان کے خرچ کی حالت سے خود ہی سمجھ لو کہ پس اگر تم پہلے اور دوسرے درجہ تک نہ پہنچ سکو تو کم از کم تیسرے درجہ سے بڑھ کر متوسط لوگوں کے ادنیٰ درجہ تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرو کہ مقدار واجب کے علاوہ روزانہ کچھ نہ کچھ صدقہ کر دیا کرو

کہ اگرچہ روٹی کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو پس اگر ایسا کرو گے تو بخیلوں کے طبقہ سے اوپر چڑھ جاؤ گے۔ اگر تم مفلس اور غریب ہو تو یہ نہ سمجھو کہ صدقہ مال کی موجودگی پر ہی منحصر یا محدود ہے اور ہم اس سے معذور ہیں۔ نہیں بلکہ اپنی عزت و جاہ' آرام و آسائش' قول و فعل غرض جس پر بھی تمہیں قدرت ہو اس کو اللہ (عزّوجلّ) کے نام پر خرچ کرو۔ مثلاً بیمار کا پوچھنا' جنازہ کے ساتھ جانا اور حاجت کے وقت محتاج کی امداد کر دینا مثلاً کسی مزدور کا بوجھ بٹا لینا یا سہارا لگا دینا یا سعی و سفارش سے کسی کا کام نکلوا دینا اور نیک بات کہنا یعنی ہمت بندھانا ڈھارس دلانا وغیرہ۔ یہ سب کام صدقہ ہی میں شمار ہوتے ہیں اور ایسے صدقات ہیں جن کے لئے مالدار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

صدقہ و زکوٰۃ کے بارے میں پانچ اہم ہدایات :۔

زکوۃ و صدقات میں پانچ باتوں کا زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔

(i) جو کچھ بھی دیا کرو وہ لوگوں سے چھپا کر دیا کرو۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ چھپا کر خیرات دینا پروردگار کے غصہ کو بجھاتا ہے (ابن عساکر ضعیف ترمذی حسن) اور جو مسلمان اپنے دائیں ہاتھ سے اس طرح خیرات کرے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو تو وہ ان سات بندوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا جن پر اللہ تبارک وتعالیٰ بروز قیامت سایہ فرمائے گا جب کہ اس کے سائے کے سوا کہیں سایہ نہ ہو گا۔ (مضمون بخاری و مسلم) اس میں حکمت ہے کہ صدقہ سے مقصود بخل کی بدخصلت کا دور کرنا ہے مگر اس میں ریا کے خطرناک مرض کا اندیشہ ہے اس لئے چھپا کر دینے کے سبب سے ریا سے نجات مل جائے گی کیونکہ مسلمان جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو ریا سانپ کی صورت اور بخل بچھو کی صورت بن کر اس کو تکلیف پہنچاتا ہے پس جس نے خیرات کرنے سے جی چرایا اور بخل اختیار کیا تو اس نے اپنی قبر میں کاٹنے کے لئے بچھو بھیج دیئے اور اگر کسی نے خیرات تو کی مگر دکھاوے کی غرض سے کی ہے تو بچھو کو گویا سانپ کی غذا بنا دیا' اس صورت میں بچھو سے تو نجات ہو گئی مگر سانپ کی زہریلی قوت اور زیادہ ہو گئی کیونکہ بخل کا منشا پورا ہوا تو بچھو کا زور بڑھے گا اور ریا کا

منشاء ہوا تو سانپ کا زور زیادہ ہو گا۔

(ii) جسے خیرات دو اس پر احسان نہ سمجھو اور اس کی شناخت یہ ہے کہ مثلاً تم نے کسی محتاج کو خیرات کے طور پر کچھ دیا اور اس سے شکر گذاری کی توقع رکھی یا مثلاً وہ تمہارے ساتھ بدسلوکی سے پیش آیا تمہارے دشمن کے ساتھ محبت کرنے لگا تو تمہیں یہ اتنا ناگوار گزرا کہ اگر صدقہ دینے سے پہلے یہی صورت پیش آتی تو یقیناً اتنا ناگوار نہ گزرتا تو اس سے صاف ظاہر ہوا کہ تم نے اس محتاج پر اپنا احسان سمجھا جبھی تو اس بدسلوکی پر اتنا طیش آیا' اس کا علاج یہ ہے کہ تم اس محتاج کو اپنا محسن سمجھو کہ جس نے تم سے صدقہ کا مال لے کرتمہیں حقِ الہٰی سے سبکدوش کر دیا اور اور تمہارے مرض بخل کا طبیب بن گیا کیونکہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ زکوٰۃ و خیرات سے مقصود بخل کا دور کرنا ہے پس مال زکوۃ گویا بخل کا دھوون ہوا یہی وجہ ہے کہ اُمت کے غم خوار شفیع روز شمار صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ و صدقہ کا مال اپنے خرچ میں نہ لاتے اور فرمایا کہ یہ مال کا میل ہے (مسلم) تو جس مسلمان نے تمہارے مال کا میل لے کر تمہیں اور تمہارے مال کو پاک و صاف بنا دیا تو بھلا بتاؤ کہ اس کا تم پر احسان ہوا یا تمہارا اس پر احسان ہوا۔ بھلا اگر کوئی جراح مفت فصد کھول کر تمہارا وہ ناقص خون نکال دے جو تمہاری دنیوی زندگی کے لئے نقصان دہ ہے تو کیا تم اس کو اپنا محسن نہیں سمجھتے؟ اسی طرح جو شخص دل سے بخل کے فاسد مادہ کو کہ جس کے ضرر کا حیات اخروی میں اندیشہ ہے بلا معاوضہ یعنی مفت نکال دے تو اس کو بدرجہ اولیٰ اپنا محسن و خیر خواہ سمجھنا چاہیے۔

(iii) صاف ستھرا یعنی پاکیزہ اور عمدہ مال خیرات کرو کیونکہ جو چیز ناپسند ہو اس کا اللہ (عزّوجلّ) کے نام پر دینا کیسے مناسب ہو سکتا ہے تم سن ہی چکے ہو کہ اس سے مقصود دعوائے محبتِ الہٰی کا امتحان ہے پس جیسی بری یا بھلی چیز اللہ (عزّوجلّ) کے نام پر خیرات کرو گے۔ اس سے خود معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس قدر محبت ہے۔

(iv) تمہیں جو کچھ صدقہ و خیرات یا زکوٰۃ کی صورت میں دینا ہو خوشی خوشی اور

خندہ رو ہو کر دیا کرو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک درہم لاکھ درہم سے بڑھ جاتا ہے۔ (نسائی ابن خزیمہ ابن حبان اور حکم نے مسلم کی شرط پر یہ صحیح بتایا ہے)اس کا مطلب یہی ہے کہ جو ایک درہم نیک نیتی سے اور خوشی کے ساتھ دیا گیا ہے وہ ان لاکھ درہموں سے بڑھا ہوا ہے جو ناگواری کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔

(۷) صدقہ کے لئے محل و مصرف عمدہ تیار کیا کرو یعنی یا تو کسی پرہیزگار عالم کو دیا کرو کہ تمہارا مال کھانے سے اس کو اللہ تعالٰی کی اطاعت اور تقویٰ پر قوت اور اعانت ہو یا کسی عیال دار نیک بخت مسلمان کو دو اور اگر یہ تمام اوصاف ایک شخص میں جمع نہ ہوں تو جس میں ایک وصف بھی پایا جائے وہ بھی تمہارا صدقہ پاک ہو جانے کے لئے کافی ہے البتہ نیک بختی کا لحاظ سب سے مقدم ہے کیونکہ دنیا کا مال و متاع بندوں کے لئے اسی واسطے مہیا کیا گیا ہے کہ ان کی ایام گزاری ہو سکے اور ان چند روزہ ایام میں آخرت کا توشہ ان کو حاصل ہو جائے تو جو لوگ درحقیقت سفرِ آخرت میں مشغول ہیں اور اس عالم فانی کو راستہ کا پڑاؤ اور مسافر خانہ سمجھے ہوئے ہیں وہی تمہارے پیسے کے مصرف ہونے چاہئیں۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ "پرہیز گاروں کو کھانا کھلایا کرو اور اپنا تبرع و سلوک ایمان داروں ہی کو پہنچایا کرو" (ابو یعلی۔ابن ابی الدنیا۔ حسن ہے)

(۳) روزہ

اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ ہر نیکی کا دس گناہ سے سات سو گنا تک نامہ اعمال میں ثواب لکھا جاتا ہے ۔ (بخاری، مسلم اور نسائی کی احادیث کے مضمون کے مطابق) مگر روزہ خاص میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کا صلہ جو چاہوں گا دونگا (ابن السبارک، مرسل و حسن) اور سرورِ کائنات آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شے کا ایک دروازہ ہوتا ہے اور عبادات کا دروازہ روزہ ہے۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

روزہ پر اتنے اجر و ثواب کے اسباب :۔

روزہ پر اس قدر اجر و ثواب کا سبب دو باتیں ہیں۔

(i) روزہ کھانے پینے اور مباشرت چھوڑنے کا نام ہے اور ایسا پوشیدہ کام ہے کہ جس پر اللہ تعالٰی کے سوا کوئی آگاہ نہیں ہو سکتا اور اس کے علاوہ جتنی عبادتیں ہیں مثلاً نماز، تلاوت، زکوٰۃ، حج یہ سب ایسی عبادتیں ہیں جن پر دوسرے لوگ بھی واقف ہو سکتے ہیں پس روزہ وہی مسلمان رکھے گا جس کو لوگوں میں اپنے عابد و زاہد کہلائے جانے کا شوق اور ریا نمود کی محبت نہ ہو گی۔

(ii) روزہ سے اللہ عزّوجلّ کا دشمن یعنی شیطان مغلوب ہوتا ہے کیونکہ جس قدر نفسانی خواہشیں ہیں سب پیٹ بھرنے پر اپنا زور دکھاتی ہیں اور شیطان انہیں خواہشات کو واسطہ بنا کر مسلمان کا شکار کرتا ہے اور جب روزہ کی وجہ سے مسلمان بھوکا رہا اور تمام خواہشیں کمزور پڑ گئیں تو شیطان مجبور اور بے دست و پا ہو گیا۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماہ رمضان میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، شیاطن کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا ہے اور ہاتفِ غیبی پکارتا ہے کہ اے بھلائی کے طلب گارو آگے بڑھو اور اے بدکارو باز آؤ۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

مقدار کے اعتبار سے روزہ کے درجات :۔

(i) ادنیٰ درجہ :۔

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صرف رمضان المبارک کے فرض روزے ہر سال رکھ لیا کرے۔

(ii) اعلیٰ درجہ :۔

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام روزہ رکھتے تھے اسی طرح ایک دن تو روزہ رکھے اور دوسرے دن نہ رکھے پھر تیسرے دن رکھے اور چوتھے دن نہ رکھے روزمرہ روزہ رکھنے کی بہ نسبت یہ صورت بدرجہا بہتر ہے (مضمون حدیث بخاری و مسلم) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنے سے بھوکا رہنے کی عادت ہو جاتی ہے اور عادت ہوئے پیچھے شکستگی اور قلب میں صفائی اور خواہشات نفسانی میں ضعف و کمزوری محسوس نہ ہو گی حالانکہ روزہ سے یہی مقصود ہے دیکھو مریض جب دوا کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر دوا کچھ بھی نفع نہیں دیتی۔ یہی سبب ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روزہ کی بابت دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ایک دن روزہ رکھو اور دوسرے دن کھاؤ پیو" انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے بھی اعلیٰ درجہ چاہتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ اس سے اعلیٰ درجہ کوئی نہیں ہے۔ (بخاری و مسلم) ایک مرتبہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی کہ فلاں شخص ہمیشہ روزہ رکھتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا روزہ رکھنا نہ رکھنا دونوں برابر ہے۔

(iii) متوسط درجہ :۔

متوسط درجہ یہ ہے کہ عمر کا تہائی حصّہ روزہ میں صرف ہو جائے لہٰذا مناسب ہے کہ ماہ رمضان کے علاوہ ہر ہفتہ میں دو شنبہ و پنجشنبہ کا روزہ رکھ لیا کرو۔ اس حساب

سے سال بھر میں چارہ ماہ اور چار یوم کے روزے ہو جائیں گے مگر چونکہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ اور ایامِ تشریق میں روزہ رکھنا حرام ہے اور ممکن ہے کہ دونوں عیدیں دو شنبہ یا پنجشنبہ کو پڑیں اور ایامِ تشریق میں سے ایک دن تو ضرور پیر یا جمعرات کو ہو گا۔ اس لئے چار مہینے اور ایک دن کے روزے ہو جائیں گے اور بارہ مہینے کے تہائی یعنی چار مہینے سے صرف ایک دن زیادہ رہے گا یہ تہائی عمر کا حساب غور کرنے سے باآسانی سمجھ میں آجائے گا اس مقدر سے روزوں کا کم کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس میں آسانی بھی ہے اور ثواب بہت زیادہ ہے۔

کیفیت کے اعتبار سے روزہ کی اقسام:۔

روزہ کی کیفیت کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں۔

(i) ایک تو عام روزہ ہے صرف روزہ توڑنے والی چیزوں یعنی کھانے پینے اور جماع سے بچتے ہیں اگرچہ بدن سے گناہ کئے جائیں چنانچہ یہ تو نام ہی کا روزہ ہے۔

(ii) بدن کے کسی عضو سے بھی کوئی کام خلافِ شرع نہ ہو' یعنی زبان غیبت سے محفوظ رہے اور آنکھ نامحرم کو بُری نگاہ کے ساتھ دیکھنے سے بچی رہے وغیرہ وغیرہ۔

(iii) خاص روزہ خاص بندوں کا ہے کہ اعضائے بدن کے ساتھ ان کا قلب بھی فکر و وسواس سے محفوظ رہتا ہے اور سوائے ذکرِ الٰہی کے کسی چیز کا بھی ان کے دل میں گزر نہیں ہونے پاتا یہ کمال کا درجہ ہے۔ اور چونکہ اس کا حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے اس لئے کم سے کم اتنا خیال تو ضرور رکھنا چاہئے کہ ایسے کھانے پر روزہ افطار کیا کرو جو بلاشبہ حلال اور پاک ہو اور وہ بھی اتنا نہ کھاؤ کہ جس سے معدہ بھاری اور بدن ست ہو جائے کہ تہجد کو بھی آنکھ نہ کھلے یعنی ایسا نہ کرو کہ دن کے چھوٹے ہوئے کھانے کی بھی تلافی افطار کے وقت کرنے لگو کیونکہ ایسا کرنے والوں کو روزہ کا اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا کہ سستی کی وجہ سے نقصان ہوجاتا ہے۔

(۴) حج

اللہ (عزّوجلّ) فرماتا ہے کہ لوگوں پر اللہ (عزّوجلّ) کے واسطے حج بیت اللہ شریف فرض ہے۔ جس کسی میں وہاں تک پہنچنے کی طاقت ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صاحب استطاعت مسلمان بغیرحج کئے مرگیا تو اسے اختیار ہے کہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی۔ (ابن عدی اور ترمذی کچھ فرق کے ساتھ)

آدابِ سفرِ حجِ بیت اللہ شریف :۔

حج بھی دین کا ایک ستون ہے حج کے اعمال و ارکانِ ظاہری کا بیان چونکہ احیاء العلوم میں ہو چکا ہے لہٰذا اس جگہ حج کے رموز اور آداب بیان کرنے مقصود ہیں پس جاننا چاہئے کہ آدابِ حج سات ہیں۔

(i) سفر سے پہلے حلال زاد راہ اور کوئی نیک بخت ساتھی تلاش کرلو کیونکہ حلال توشہ سے قلب میں نور پیدا ہو گا اور رفیقِ صالح تمہیں گناہوں سے روکتا اور نیک کام یاد دلاتا رہے گا۔

(ii) اس سفر میں تجارت کا خیال بالکل نہ رکھو۔ کیونکہ طبیعت کے تجارت کی جانب متوجہ ہو جانے سے زیادہ حرمین شریفین کا ارادہ خالص اور بے لوث نہ رہے گا۔ (یہاں یہ سوسوسہ دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم میں تو تجارت کی اجازت دی گئی ہے دراصل اول تو مولف رحمتہ اللہ علیہ دوران حج تجارت کو ممنوع نہیں فرما رہے جو خلاف قرآن ہو۔ دوم ہم میں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں یہ فرق ہے کہ ہم حج کو بھی تجارت کے لئے کرلیں گے اور وہ نفوس قدسیہ تجارت بھی اعانت دین کے لئے فرماتے تھے)

(iii) راستہ میں کھانے کی اندر وسعت کرو اور رفقائے سفر اور نوکروں چاکروں اور کرایہ داروں کو خوش رکھو اور کسی کے ساتھ سختی سے بات نہ کرو بلکہ نہایت اخلاق و محبت سے اور نرم گفتاری سے سفر ختم کرو۔

(iv) فحش گوئی، جھگڑے، فضول بکواس اور دنیا کے معاملات کی بات چیت کو بالکل چھوڑ دو اور ضروری حاجتوں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی زبان کو تلاوتِ کلام اللہ اور ذکر الٰہی میں مشغول رکھو۔

(v) شغدف یا تبری یعنی شان کی سواری پر سوار نہ ہو بلکہ باربرداری کے اونٹ پر بیٹھ جاؤ تاکہ دربارِ الٰہی میں پراگندہ حال غبار آلودہ اور مسکینوں محتاجوں کی سی ذلیل و خستہ حالت سے حاضری ہو، اس سفر میں بناؤ سنگار اور زیادہ آرام طلبی کا خیال بھی نہ لاؤ۔

(vi) کبھی کبھی سواری سے اتر کر پیدل بھی ہو لیا کرو کہ اس میں سواری کے مالک کا بھی دل خوش ہو گا اور سواری کو بھی آرام ملے گا نیز تمہارے ہاتھ پاؤں بھی حرکت کرنے سے چست و چالاک رہیں گے۔

(vii) جو کچھ بھی اس سفر میں خرچ ہو جائے یا جس قسم کا بھی مالی نقصان یا تکلیف یا مصیبت اٹھانی پڑے تو اس پر خوش دل رہو اور اس کو اپنے حج کے مقبول ہونے کی علامت سمجھو اور اپنے پروردگار سے ثواب کی امید رکھو۔

عبادتِ حج میں حکمت:۔

اگرچہ حج کی عبادت میں بہت سی پوشیدہ حکمتیں ہیں مگر ہم صرف دو حکمتوں کا بیان یہاں ضروری سمجھتے ہیں۔

(i) حج اس رہبانیت کا بدل ہے جو پہلی امتوں میں رائج تھی حدیث میں آیا ہے کہ امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رہبانیت اللہ تعالیٰ نے حج کو بنا دیا ہے، اول بیتِ عتیق یعنی سب سے پہلے بنے ہوئے مکان کو اللہ تعالیٰ نے شرف عنایت کیا یعنی اس کو اپنی جانب منسوب فرمایا اور بیت اللہ نام رکھ دیا پھر اس کے گرد و نواح کو حرم گردانا۔ میدان عرفات کو حرم کا صحن بنایا اور اس کا شرف اس طرح فرمایا کہ نہ وہاں شکار جائز ہے نہ درخت کاٹنا حلال۔ سو یہ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ مکان سے منزہ ہے اور گھر یا مکان کا محتاج نہیں ہے وہ سب کو محیط ہے اور اسے کوئی جگہ اپنے احاطہ میں نہیں لے سکتی۔ پس اس نے خانہ کعبہ کو جو اپنی جانب منسوب کیا اور اس کے طواف

کا لوگوں کو حکم دیا تو اس میں حکمت یہ ہے کہ بندوں کی غلامی کا اظہار اور ان کی بندگی کا امتحان ہو جائے اور فرمان بردار غلام اپنے آقا کے دربار میں دور دراز جگہوں سے بالقصد زیارت کرنے کو جوق در جوق ایسی حالت سے آئیں کہ بال بکھرے ہوئے ہوں غبار آلود ہوں' شاہی ہیبت و جلال سے سراسیمہ و پریشان حال ہوں' ننگے سر ننگے پاؤں مسکین و محتاج بنے ہوئے ہوں اور اسی مصلحت سے اس عبادت میں جس قدر بھی اعمال و ارکان مقرر کئے گئے ہیں وہ سب بعید از عقل ہیں تاکہ ایسے اعمال کا ادا کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل سمجھ کر ہو اور کوئی طبعی خواہش یا عقلی حکمت کا اتباع اس کا باعث نہ ہو چنانچہ حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے باری تعالیٰ ! ہم اپنی عبودیت و غلامی کا اظہار کرنے کو عبادت حقہ یعنی حج کے لئے حاضر ہیں۔

(ii) سفرِ حج کی وضع بالکل سفرِ آخرت کی سی ہے اور مقصود یہ ہے کہ حجاج کو اعمال حج ادا کرنے سے مرنے کا وقت اور مرنے کے بعد پیش آنے والے واقعات یاد آئیں مثلاً شروع سفر میں بال بچوں سے رخصت ہوتے وقت سکرات موت کے وقت اہل و عیال سے رخصت ہونے کو یاد کرو اور وطن سے باہر نکلتے وقت دنیا سے جدا ہونے کو اور سواری کے جانوروں پر سوار ہوتے وقت جنازہ کی چارپائی پر سوار ہونے کو یاد کرو' احرام کا سفید کپڑا پہنتے وقت کفن میں لپٹنے کو یاد کرو اور پھر میقات حج تک پہنچنے میں جنگل و بیابان قطع کرتے وقت اس دشوار گزار گھاٹی کے قطع کرنے کو یاد کرو جو دنیا سے باہر نکل کر میقات قیامت تک عالم برزخ یعنی قبر میں تمہیں کاٹنی ہے راستہ میں راہزنوں کے ہول و حراس کے وقت منکر نکیر کے سوالات اور اس بیکسی میں ہول و ہراس کا خیال کرو۔ جنگلی درندوں سے قبر کے سانپ بچھو کیڑوں مکوڑوں کو یاد کرو اور میدان میں رشتہ داروں اور عزیز و اقارب سے علیحدہ تن تنہا رہ جانے کے وقت قبر کی تنہائی اور وحشت کو یاد کرو اور جس وقت چیخ چیخ کر **لبیک اللھم لبیک** پڑھو تو زندہ ہونے اور قبروں سے اٹھنے کے وقت کے اس جواب کو یاد کرو جو اللہ تعالیٰ کی ندا کے وقت میدانِ حشر میں حاضری کے لئے تم عرض کرو گے غرض اسی طرح ہر

عمل میں ایک عبرت اور معاملہِ آخرت کی یاد دہانی ہے جس سے ہر شخص جس قدر بھی اس میں قلب کی صفائی اور دین کی ضروریات کے خیال رکھنے کی وجہ سے استعداد ہو گی آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔

(۵) تلاوتِ قرآن حکیم

سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے لئے سب سے بہتر عبادت کلام اللہ کی تلاوت ہے (بیہقی ۔ حسن) حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ قرآنِ حکیم کی تلاوت میں مشغول ہو کر دعا نہیں مانگ سکا میں اس کو بن مانگے اتنا دوں گا کہ مانگنے والوں کو اتنا نہ دوں گا۔ (ترمذی ۔ حسن غریب)

تلاوتِ قرآنِ حکیم کے ظاہری آداب:۔

تلاوتِ قرآنِ حکیم کے تین ظاہری آداب ہیں۔

(i) تلاوت کرتے وقت دل میں بھی کلام اللہ کا احترام رکھے اور چونکہ ظاہر کو باطن تک اثر پہنچانے میں بہت دخل ہے اس لئے جب ظاہری صورت احترام کی پیدا کی جائے گی تو قلب میں بھی احترام پیدا ہو جائے گا اور ظاہری احترام کی صورت یہ ہے کہ وضو کر کے نہایت سکون کے ساتھ گردن جھکائے ہوئے قبلہ کی طرف منہ کر کے دوزانو اس طرح بیٹھو جیسے استاد کے سامنے ہیں اور تجوید کے موافق حروف قرآنیہ کو مخارج سے نکالو اور ایک حرف کو دوسرے سے علیحدہ ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میں سورۃ انا انزلنا اور القارعۃ یعنی چھوٹی سورتیں سوچ کر تلاوت کروں تو اس سے زیادہ بہتر ہوں کہ سورۂ بقرہ اور آل عمران فر فر پڑھ جاؤں۔

(ii) کبھی کبھی تلاوت کی فضیلت کے انتہائی درجہ کے حاصل کرنے کا شوق تم بھی کیا کرو کیونکہ تم آخرت کی تجارت کے لئے دنیا میں آئے ہو اس لئے جہاں تک ممکن ہو زیادہ نفع کمانے کی کوشش کرو ۔ یوں تو تلاوتِ کلام اللہ سے کسی طرح بھی کیوں نہ ہو خواہ بیٹھے ہو' لیٹے ہو باوضو ہو یا بے وضو اور خلوت میں ہو یا جلوت میں بہرحال نفع ہی نفع ہے مگر بڑا نفع اس میں ہے کہ شب کے وقت مسجد میں بحالت نماز کلام اللہ پڑھو' حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جو شخص نماز میں کھڑے ہو کر

قرآن شریف پڑھے گا، اس کو ہر حرف کے بدلے سو نیکیاں ملیں گی، اب تم خود ہی سوچو کہ سوداگر بن کر زیادہ نفع کی حرص کیوں نہ کی جائے۔ (مضمون دیلمی)

(iii) تلاوت کی مقدار کا بھی لحاظ رکھو ادنیٰ درجہ تو یہ ہے کہ ہر مہینے میں ایک مرتبہ ختم کرو اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ تین دن میں ختم کرو کہ مہینہ بھر میں دس ختم ہوں اور متوسط درجہ یہ ہے کہ ہر ہفتہ پورا قرآن شریف ختم کر لیا کرو۔ تین دن سے کم میں کلام مجید ختم کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ سمجھ نہ سکو گے اور بلا سمجھے پڑھنا گستاخی ہے یہ نہ سمجھو کہ جب تلاوت کلام اللہ نافع ہے تو جس قدر بھی تلاوت زیادہ ہو گی اسی قدر ثواب زیادہ ہو گا یہ تمہارا قیاس غلط ہے پروردگار کے بھید کا سمجھنا انبیاء علیہم السلام ہی کا کام ہے۔ پس جب سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ تین دن سے کم میں ختم مستحب نہیں ہے تو تمہارے لئے اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) لازم ہے اور اپنی رائے کو دخل دینا جہالت اور کم عقلی ہے چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ دوا بیمار کو نفع دیتی ہے لیکن اگر طبیب کی بتائی ہوئی مقدار سے زیادہ دو گے تو دیکھ لو یہ مریض مرے گا یا اچھا ہو جائے گا؟ اسی طرح نماز حالانکہ عبادتوں میں اصل ہے مگر وہ طلوع و غروب اور استوائے آفتاب کے وقت ناجائز اور صبح و عصر کے فرضوں کے بعد مکروہ ہے جب مرض کی دوا میں جسمانی طبیب کی بات بے چوں و چرا مان لی جاتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ روحانی علاج اور روحانی طبیب کی بتلائی ہوئی دوا میں اس کی مقدار کا علاج نہ رکھا جائے اور اس کے بڑھانے میں عقل کو دخل دے کر سوال کیا جائے کہ تین دن سے کم میں ختم کرنا کیوں ناجائز ہے۔

تلاوت قرآن حکیم کے باطنی آداب :۔

تلاوت قرآن حکیم کے پانچ باطنی آداب ہیں۔

(i) جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت و جلال دل میں ہے اسی طرح اس کے کلام کی بھی عظمت دل میں ہونی چاہئے۔ مثلاً جب تم گوناگوں مخلوقات یعنی عرش و کرسی، لوح و قلم، آسمان و زمین، حیوان و انسان، جنات اور نباتات و جماعات کے پیدا ہونے کا تصور کرو گے تو ضرور خیال ہو گا کہ اس عالم کا پیدا کرنے والا واحدہٗ لا

شریک نہایت زبردست اور ایسا مدبّر ہے کہ اس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے' تمام عالم کی بقا اسی کے فضل و کرم پر موقوف ہے ایسے شہنشاہ عالی شان کے فرمان واجب الاذعان یعنی قرآن مجید کی کیا عظمت و وقعت ہونی چاہئے؟ یاد رکھو کہ جس طرح اس کے الفاظ کو ہاتھ لگانے کے لئے طہارت اور وضو کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس کے معنی کے دل میں لانے کے لئے قلب کی طہارت اور تمام اخلاق رذیلہ سے پاکی لازم ہے۔ پس جو قلب باطنی گندگی اور نجاست میں آلودہ ہے وہ اس محترم شاہی فرمان کے حقائق کو کیونکر سمجھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ قرآن شریف کھولتے تو اکثر بے ہوش ہو جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ "یہ میرے پروردگار (عزّوجلّ) کا کلام ہے" اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اس نے اپنے باعظمت کلام ازلی کے انوار و تجلیات کو حروف کے لباس میں چھپا کر تمہارے حوالہ کیا ہے ورنہ اس کی نورانی شعاعوں کا کوئی بشر متحمل نہ ہو سکتا دیکھ لو کہ طور جیسا پہاڑ بھی کلام الٰہی کی تجلیات کا تحمل نہ کر سکا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اگر اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ سنبھال لیتا تو ان میں بھی حرف اور آواز کے لباس سے مجرد کلامِ الٰہی کے سننے کی طاقت نہ تھی۔

(ii) اگر قرآنِ حکیم کے معنی سمجھ سکتے ہو تو کوئی آیت بھی بلا سمجھے تلاوت نہ کرو کیونکہ ترتیل میں جس کا قرآن حکیم میں حکم ہے تدبر یعنی غور و فکر اور سمجھنے اور سوچنے ہی سے حاصل ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اس تلاوت سے کیا نفع جس میں سمجھنے سے واسطہ نہ ہو' ختم قرآن کی تعداد بڑھانے کا خیال مت کرو کہ چاہے سمجھو نہ سمجھو مگر نام ہو جائے کہ اتنے قران مجید ختم کئے یاد رکھو کہ اگر تم سوچ سمجھ کر ایک ہی آیت کو رات بھر پڑھتے جاؤ گے تو یہ (بلا سوچے سمجھے) پچاس قرآن ختم کرنے سے بہتر ہو گا۔ غور کرو کہ سرکار ابد قرار شافع روزِ شمار صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بیس مرتبہ دہرایا اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام رات ایک ہی آیت کو بارہا پڑھا اور وہ آیت یہ تھی **ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفرلھم**

فانک انت العزیز الحکیم (ابن ماجہ و نسائی) حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ آیت **ام حسب الذین اجترحوا السّیئات** کو تمام شب بارہا پڑھتے رہے اور حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ نے آیت **وامتازوا الیوم ایھا المجرمون** کو بار بار پڑھنے میں تمام رات ختم کر دی۔ ایک عارف فرماتے ہیں کہ میں ہر ہفتہ میں ایک ختم پڑھتا ہوں اور ایک ختم ہر مہینے میں اور ایک ایسا ہے کہ جس کو سال بھر میں ختم کرتا ہوں اور ایک تلاوت ایسی بھی ہے جس کو تین سال سے شروع کر رکھا ہے اور اب تک پورا کلام مجید نہیں ہوا۔ یہ فرق ظاہر ہے کہ فکر و فہم اور غور و تدبر ہی سے ہوتا ہے کیونکہ انسان کا دل ہر وقت یکساں نہیں رہتا اور نہ ہمیشہ مساوی درجہ کے غور و فکر کا عادی ہوتا ہے اس لئے اگر خصوصیت کے ساتھ ایک ختم علیحدہ طور پر تم بھی ایسا شروع کر لو جس میں سوچ سمجھ کر تلاوت کی جائے اور صرف اسی وقت پڑھا جائے جب کہ قلب فارغ ہونے کی وجہ سے غور و فکر کر سکو اور معنی اچھی طرح سمجھ سکو تو بہت اچھا ہے کیونکہ اس صورت میں تلاوت کے معمول میں بھی فرق نہ آئے گا اور یہ فضیلت کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔

(iii) اس فہم و تدبیر کی حالتِ مذکورہ میں معرفت الٰہی کی گوناگوں شاخوں سے پھل اور پھول بھی چنتے رہو کیونکہ ہر پھل کے لئے جدا شاخ اور ہر جوہر کے لئے جدا معدن ہے کہ جہاں موتی پیدا ہوتے ہیں وہاں تریاق کا تلاش کرنا فضول ہے اور جہاں مشک وعود دستیاب ہوتا ہے وہاں موتیوں کی جستجو بے فائدہ ہے۔ اسی طرح قرآنِ حکیم کی آیتوں میں جس قسم کا تذکرہ ہو اسی قسم کا عرفان حاصل کرنا چاہئے۔ مثلاً جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات یا افعال کا تذکرہ فرمایا ہے وہاں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کی معرفت حاصل کرو اور جس جگہ راہ مستقیم کی تعلیم مذکور ہو وہاں رحمت و کرم اور فضل و حکمت کی معرفت حاصل کرو اور جہاں کافروں کے ہلاک کرنے کا بیان ہو اس جگہ سے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور غلبہ و قہر کی صفت معلوم کرو اور جن آیتوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کے تذکرے ہوں وہاں سے اللہ تبارک و تعالیٰ کے لطف و کرم کا علم حاصل کرو الغرض جیسا موقع ہو ویسا عرفان حاصل کیا جائے۔

(iv) قرآنِ حکیم کا مطلب سمجھنے سے جو امور مانع ہیں ان کو جہاں تک ہو سکے دفع کرو کیونکہ ضعیف الایمان بندوں کے لئے تو خواہشاتِ نفسانی اور وساوسِ شیطانی حجاب بن جاتی ہیں کہ ان کے نفوس دنیوی تعلق سے وابستہ اور ان کے قلوب شبہات و شک سے ملوث ہوتے ہیں اور یہی قلب کے وہ پردے ہیں جن کے سبب قرآنِ حکیم کی باریکیاں سمجھ میں نہیں آسکتیں لہٰذا ان کے اٹھانے کی کوشش ہونی چاہئے اور جن لوگوں کا ایمان قوی ہو جاتا ہے کہ رب کی محبت ان کے قلب میں پیدا ہوئی اور ان کو اطاعت میں لذت آنے لگتی ہے ان پر بھی قلبی وسواس اپنا اثر کرتے ہیں مثلاً نماز کی حالت میں ان کا دل اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ ہماری نیت کیسی ہے اور جو خلوص شروع نماز کے وقت تھا وہ اب بھی قائم ہے یا نہیں یا مثلاً حرف کے مخارج سے ادا ہونے میں شبہ پڑتا ہے اور آیت کو اس نیت سے بار بار دہراتے ہیں حالانکہ قلب کے لئے یہ بھی حجاب ہے کیونکہ حروف اور الفاظ کی درستی کے پیچھے پڑ جانا اور مخارج حروف یعنی دانتوں، ہونٹوں، تالو اور حلق کی طرف مشغول ہونا کہ یہ حرف کہاں سے نکلا اور ٹھیک نکلا یا نہیں نکلا؟ ان کا کام نہیں جن کو عالم علوی کی سیرت و سیاحت اور ملکوتی امور کا مشاہدہ کرنا منظور ہے۔

(v) آیاتِ کلامِ الٰہی سے صرف تجلیات اور معرفت ہی کے حاصل کرنے پر اکتفا نہ کرو بلکہ اس کے ساتھ حالت اور اثر بھی ظاہر ہونا چاہئے مثلاً اگر ایسی آیت پڑھو جس میں رحمت کا ذکر اور مغفرت کا وعدہ ہو تو جسم پر خوشی اور مسرت کی حالت پیدا ہو جائے اور غیظ و غضب اور عذاب الٰہی کا تذکرہ ہو تو تمہارا بدن لرز اٹھے اور اللہ تعالیٰ کا نام آئے یا اس کی عظمت و جلال کا ذکر ہو تو جھک جاؤ اور ذلت اختیار کرو کہ گویا جلال الٰہی کے مشاہدے سے نیست و نابود ہوئے جاتے ہو اور اگر کافروں کی ان خرافات کا بیان ہو جو انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھے ہیں مثلاً مخلوق میں سے کسی کو نعوذ باللہ خدا کا بیٹا یا بیٹی یا بیوی بتایا ہے تو اس کی نقل سے بھی شرماؤ اور ایسی آیت کی تلاوت میں اپنی آواز کو پست کر دو کہ گویا ان کے الفاظ کا اپنی زبان پر لانا بھی گراں گزرتا ہے۔ غرض جس آیت میں جیسا مضمون ہو اس کے مطابق ایک

خاص حالت پیدا اور جسم پر وہی اثر ظاہر ہو جانا چاہئے کہ خوف کے وقت آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں اور شرم کے وقت پیشانی پر پسینہ آجائے اور ہیبت کے وقت رونگٹے کھڑے ہو جائیں' کپکپی چھوٹے اور مژدۂ بشارت کے وقت آواز و زبان اور اعضاء میں انبساط و بشاشت پیدا ہو جائے۔

(٦) ہر وقت ذکرِ الٰہی

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے "اللہ کا کثرت سے ذکر کرو تاکہ فلاح پاؤ" اور حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کا ذکر جہاد اور صدقات و خیرات سب سے افضل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے۔ ذکر الٰہی کے لئے ایک مغز اور تین پوست ہیں اور مغز تو مقصود بالذات ہے مگر پوست اس لئے مقصود اور محبوب ہیں کہ وہ مغز تک پہنچنے کے ذرائع اور اسباب ہیں۔

پہلا پوست صرف زبان سے ذکر کرنا ہے۔

دوسرا پوست قلب ہے ذکر کرنا اور جبراً بہ تکلف اس کا خوگر ہونا ہے یاد رکھو کہ قلب کو اپنی حالت پر چھوڑنا نہ چاہئے کیونکہ اس کو تفکرات اور تخیلات میں پڑنے سے پریشانی ہوتی ہے لہٰذا مناسب ہے کہ اس کی مرغوب شئے یعنی ذکرِ الٰہی اس کے حوالہ کر دی جائے تاکہ اس کو اطمینان حاصل ہو جائے۔

تیسرا پوست یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی دل میں جگہ کر لے اور ایسا گڑ جائے کہ اس کا چھڑانا دشوار ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے درجہ میں جس طرح دل کو ذکر کی عادت ڈالنے میں دقت پیش آئی ہوئی تھی۔ اس تیسرے درجہ میں دل سے ذکرِ اللہ کی عادت چھڑانا اس سے زیادہ دشوار ہو۔

چوتھا درجہ جو مغز اور مقصود بالذات ہے وہ یہ ہے کہ دل میں ذکر کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ بلکہ مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ذات رہ جائے کہ نہ قلب کی طرف توجہ رہے نہ ذکر کی جانب التفات اور نہ ہی خبر ہو نہ کسی دوسرے کی۔ الغرض ذات الٰہی میں استغراق ہو جائے اسی حالت کا نام فنا ہے اور اس حالت پر پہنچ کر بندہ کو نہ اپنی ظاہری حس و حرکت کا کوئی علم ہوتا ہے اور نہ باطنی عوارض کا یہاں تک کہ اپنے فنا ہو جانے کا علم بھی باقی نہیں رہتا کیونکہ فنا ہو جانا بھی تو اللہ کے علاوہ دوسری ہی چیز ہے اور غیر اللہ کا خیال میل کچیل اور کدورت ہے پس فنا کا علم بھی اس درجہ میں پہنچ کر کدورت اور بعد ہوا یہی وہ حالت ہے جس میں اپنے وجود کے فنا

کے ساتھ خود فنا سے بھی فنائیت ہوتی ہے ایسی محویت سمجھ میں آنی مشکل ہے بلکہ بظاہر ناممکن اور دعویٰ بلادلیل معلوم ہوگا لیکن اگر تمہیں کسی حسین صورت پر عاشق ہونے یا کسی عاشق صادق کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو گا تو اس حالت کو کبھی دشوار نہ سمجھو گے۔ کیا حسن پرست فریفتہ انسان اپنی معشوقہ کے فکر اور خیال میں ایسے محو و مستغرق اور بے خود نہیں ہو جاتے کہ بسا اوقات زبان سے کوئی بات کرتے ہیں اور اس کو خود بھی نہیں سمجھتے۔ پاؤں ڈالتے کہیں ہیں اور پڑتا کہیں ہے اس کے سامنے سے آدمی گزر جاتا ہے حالانکہ ان کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں مگر وہ ان کو نظر نہیں آتا۔ دوسرا شخص ان سے بات کرتا ہے مگر یہ سنتے ہی نہیں' اگر ان سے پوچھا جائے کہ کیوں بھائی کیا دیکھا اور کیا سنا تو وہ کچھ بھی جواب نہیں دے سکتے' پس معلوم ہوا کہ ان کو ایسی محویت ہو گئی کہ اپنی محویت کا بھی ان کو علم نہیں رہا کہ دیوانہ بن گئے اور ایسے دیوانہ بنے کہ اپنی دیوانگی کی بھی خبر نہیں رہی مجنوں ہو گئے اور جنوں کی بھی اطلاع نہیں یہ سب اس معشوقہ مطلوبہ کے خیال میں مستغرق ہو جانے کا اثر ہے اس کو بھی جانے دیجئے اس سے بھی آسان طریقے سے فنا کی فنائیت سمجھ میں آسکتی ہے دیکھو تمہیں اپنی آبرو اور مال کے ساتھ محبت ہے پس اگر خدانخواستہ کسی دشمن کی طرف سے تمہارے مال یا آبرو پر حملہ ہو تو اس کے غصہ اور طیش میں جو کچھ تمہاری حالت ہو گی اس پر غور کرو کہ وہ کیسی بے خودی کی حالت ہے ظاہر ہے کہ غیظ و غضب میں نہ تم کو اپنی خبر رہتی ہے اور نہ دوسرے کی اور تم ایسے بے خود ہو جاتے ہو کہ اس وقت اپنی بے خودی کا بھی تمہیں احساس نہیں رہتا پھر بھلا اگر کوئی بندہ اپنے مولا کے خیال میں ایسا محو ہو جائے کہ خود فنا سے فنا اور بے خود ہو جائے تو کیا تعجب ہے سمجھانے کی غرض سے یہ مثالیں ہم نے بیان کی ہیں ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ جس وقت اللہ عزّوجلّ کے فضل سے اس حالت پر پہنچو گے تو فنائیت اور فناء الفنا کی اصل وقعت معلوم کر سکو گے۔

(۷) طلبِ حلال

اسلام میں حلال روزی کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے اسی لئے جہاں کہیں عبادت کا حکم دیا گیا حلال اشیاء کھانے کا بھی حکم دیا گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "پاک چیز کھایا کرو اور نیک کام کرو" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایمان لانے اور نماز پڑھنے کی فرضیت کے بعد رزقِ حلال کی تلاش فرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر تم نمازیں پڑھتے کمان کی طرح جھک جاؤ اور روزے رکھتے رکھتے تانت کی طرح دبلے بھی ہو جاؤ تو بغیر تقویٰ اختیار کئے اور مالِ حرام سے بچے کچھ بھی قبول نہ ہو گا۔ رزق حرام کھا کر عبادت کرنا ایسا بیکار ہے جیسا گوبر پر مکان تعمیر کرنا۔ یاد رکھو کہ رزقِ حلال کو قلب کی نورانیت میں بڑا اثر ہے۔ لہٰذا مال حرام سے بچنا اور تقویٰ اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔

تقویٰ کے چار درجات :۔

(i) جن چیزوں یا جس مال کی حرمت پر علمائے دین اور فقہائے شریعت کا فتویٰ ہے ان کا استعمال نہ کرو کیونکہ ان کے استعمال سے آدمی فاسق بن جاتا ہے اور ثقاہت باقی رہتی ہے یہ تو عام مومنین کا تقویٰ کہلاتا ہے۔

(ii) یہ صلحا کا تقویٰ ہے یعنی مشتبہ چیز سے بھی پرہیز کرنا کیونکہ علمائے شریعت نے ظاہری حالت دیکھ کر اگرچہ مشتبہ کو حلال کر دیا ہے مگر چونکہ اس میں حرکت کا احتمال ہے اور اسی وجہ سے وہ شئے مشتبہ کہلاتی ہے لہٰذا صلحا اس کو بھی استعمال نہیں کرتے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس میں شبہ ہو اس کو چھوڑ دو اور اس کو اختیار کرو جس میں کچھ بھی شبہ نہ ہو"

(iii) یہ اتقیاء کا تقویٰ ہے سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے کہ مسلمان جب تک خطرہ والی چیزوں میں مبتلا ہونے کے اندیشے سے بے خطرہ چیزوں کو بھی ترک نہ کرے گا اس وقت تک اتقیاء کے درجے کو ہرگز نہ پہنچے

گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "حرام کے مرتکب ہو جانے کے اندیشہ سے ہم حلال کے بھی دس حصوں میں سے نو حصے ترک کر دیتے ہیں" اسی بناء پر اللہ تعالٰی کے پرہیز گار بندے جب سو روپیہ کے مستحق ہوتے ہیں تو ایک کم سو لیتے ہیں اور جس وقت دوسرے کا حق دیتے ہیں تو ایک حبہ زیادہ دیتے ہیں اور جب اپنا حق لیتے ہیں تو ایک حبہ کم لیتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے کہ بیت المال کا مشک ان کے پاس آتا تو اپنی ناک بند کر لیتے اور فرمایا کرتے کہ اس کی خوشبو سونگھنا بھی تو اس کا استعمال ہی کرنا ہے۔ لہٰذا بیت المال کے مشک کی خوشبو کو میں سونگھنا نہیں چاہتا۔ مزہ دار حلال چیزوں کے کھانے اور جائز زینت اور آرائشگی سے پرہیز کرنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ زبان کو مزہ لگنا اچھا نہیں ہے کیونکہ آج حلال کا مزہ پڑا ہے تو کل حرام کی لذّت حاصل کرنے کا شوق ہو جائے گا قرآنِ حکیم میں کافروں کی کثرت مال و متاع اور دنیا داروں کے جاہ و حشم کی جانب نظر کرنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ بھی اسی لئے آئی ہے کہ اس چمک دمک سے ایمان کی شیرینی کم ہو جائے گی اس لئے کہ دنیا کے مال و متاع کی رغبت اور محبت سے قلب میں ایمان کی محبت نہیں رہا کرتی۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ جس کا کپڑا پتلا اس کا ایمان بھی پتلا' غرض اتقیاء کے نزدیک وہی مال حلال اور قابل استعمال ہے جس میں نہ بالفعل کسی قسم کا شبہ ہو اور نہ آئندہ کسی آفت کا خطرہ یا احتمال ہو۔

(iv) یہ صدیقین کا تقویٰ ہے یعنی جس چیز کے کھانے سے عبادات اور طاعت پر قوت حاصل نہ ہو اس سے پرہیز کرنا مثلاً ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انہوں نے دوا پی تو ان کی بیوی نے کہا کہ چند قدم ٹہل لیجئے انہوں نے جواب دیا کہ فضول و عبث حرکت جائز نہیں ہے میں اپنے نفس سے تمام حرکات و سکنات کا محاسبہ کیا کرتا ہوں بھلا اس چہل قدمی کو کس حساب میں شمار کروں گا اسی طرح جس شئے کے اپنے نفس تک پہنچنے کے وسائل میں سے کسی ایک سبب کے اندر بھی کچھ معصیتِ الٰہی کو دخل ہو اس سے بھی پرہیز کرنا اس درجہ میں ضروری ہے' حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ ایک مرتبہ جیل خانے میں قید تھے۔ کسی نیک بخت عورت نے ان کو بھوکا پا کر

اپنی حلال معاش میں سے کچھ کھانا پکایا اور داروغہ جیل کے ہاتھ ان تک پہنچایا مگر شیخ نے قبول نہ کیا اور یہ کہہ کر اس کو واپس کر دیا کہ کھانا اگرچہ حلال ہے لیکن طباق نجس ہے طباق سے مراد جیل خانے کے داروغہ کا ہاتھ ہے کہ وہ ظالم ہے اور ظالم کا ہاتھ پڑنے کی وجہ سے کھانا اس قابل نہ رہا کہ میں اس کو کھا لوں۔ حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ شہروں کی ان نہروں کا پانی بھی نہ پیتے تھے جن کو غیر محتاط اور ظلم پسند بادشاہوں نے کھدوایا تھا۔ ایک بزرگ کا غلام کسی فاسق شخص کے گھر سے چراغ روشن کر لایا تو انہوں نے بجھا دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نافرمان بندہ کے چراغ سے روشنی کیے ہوئے چراغ کی روشنی نفع اٹھانے کے لائق نہیں ہے غرض قل اللّٰہ ثم ذرھم کے پورے عامل صرف یہی لوگ تھے کہ کہو اللہ اس کے بعد سب کو چھوڑ دو" انہوں نے کبھی ایسی چیز کا استعمال نہیں کیا جو اللہ واسطے نہ تھی۔

یہ درجہ حاصل کرنا تو چونکہ آسان نہیں ہے اس لئے صرف ثقہ مسلمانوں کا تقویٰ تو ضرور حاصل کرو کہ ان چیزوں کے پاس تک نہ جاؤ جن کی حرمت پر علمائے دین کا فتویٰ ہے۔

اس کے ساتھ مندرجہ ذیل دو باتوں کا بھی خیال رکھو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض فقہاء نے مسائل شرعیہ کے متعلق جو حیلے بیان کئے ہیں ان کی جانب التفات نہ کرو مثلاً یہ حیلہ کہ سال ختم ہونے سے پہلے اپنا تمام مال اپنی بیوی کے نام اور بیوی کا سارا مال اپنے نام منتقل کر لیا کہ چونکہ مملوکہ مال سال بھر اپنی ملک میں نہیں رہا اس لئے زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی اس قسم کا حیلہ کبھی مت اختیار کرنا بات یہ ہے کہ فقہائے شریعت کا کام چونکہ دنیوی انتظام و سیاست ہے اس لئے اس حیلہ کی صورت میں زکوٰۃ ساقط ہونے کا فتویٰ دینے سے ان کی مراد یہ ہے کہ دنیا کا منتظم اور حکم وقت سلطان اسی مسلمان سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرے گا جس کا مال پورے سال بھر تک اس کے قبضہ مالکانہ میں دیکھ لے گا اور اس حیلہ کرنے والے مالدار مسلمان کے پاس سلطانی محصل تحصیل زکوٰۃ کے لئے نہیں آئے گا کیونکہ جتنی بات بندوں کے دیکھنے کے متعلق تھی یعنی مالکانہ قبضہ وہ ختم سال سے قبل بیوی کے

نام منتقل ہو جانے کی وجہ سے جاتا رہا مگر تم کو چونکہ معاملہ اپنے پروردگار سے رکھنا ہے اور وہ دلوں کے حالات سے واقف ہے۔ اس لئے یہ مکرو فریب آخرت میں کام نہ آئے گا۔ تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ زکوۃ سے مقصود بخل کی عادت کا دور کرنا ہے اور جب زکوٰۃ تک سے بچنے کے حیلے کرنے لگو گے تو بخل کہاں دور ہوا بلکہ بخل کو تو سر چڑھا کر اپنا امام اور پیشوا بنا لیا کیونکہ اس کا یہاں تک کہنا مانا کہ اس بخل کو نجات دہندہ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخرو کر دینے والا سمجھ بیٹھے تو اس صورت میں زکوۃ کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو مصلحت اس میں رکھی تھی اس کی جانب توجہ بھی نہیں کی اور برعکس معاملہ کیا کہ بخل کو دور کرنے کی جگہ اس میں ترقی کی مثلاً مسلمان اپنی بیوی کو اس غرض سے تکلیف میں رکھتے ہیں کہ وہ تنگ آکر اپنا مہر معاف کر دے اور جب وہ بے چاری مصیبت سے گھبرا کر زبان سے معاف کرنے کا لفظ نکال دیتی ہے تو مطمئن ہو جاتے اور اس کو حلال سمجھتے ہیں بھلا ایسا مال شوہر کو کیونکر حلال ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ **فان طبن لکم** میں خود فرماتا ہے کہ ہاں وہ مہر جو عورتیں برضائے نفس معاف کر دیں تمہارے لئے حلال ہے اب تم ہی بتاؤ کہ جس مہر کی معافی برے برتاؤ اور ایذا رسانی سے ہوئی ہو کیا وہ بخوشی خاطر سمجھی جائے گی۔ جان لو کہ رضائے قلب اور رضائے نفس دو مختلف چیزیں ہیں۔ مثلاً پچھنے لگوانے، تلخ دوا پینی، فصد کھلوانی، پھوڑے پھنسی میں شگاف لگوانا یہ سب تکلیفیں ایسی ہیں کہ ان کو قلب تو پسند کرتا ہے مگر نفس پسند نہیں کرتا اس لئے کہ نفس تو اسی بات کو پسند کرتا ہے جس میں اس وقت لذت حاصل ہو البتہ قلب اس چیز کو پسند کرتا ہے جس میں اس وقت اگرچہ تکلیف ہو مگر آئندہ نفع کی امید ہو کیونکہ نفس کا یہ کام نہیں ہے کہ بعد میں آنے والی راحت کے خیال سے اس وقت تکلیف گوارا کرے۔ پس اگر بیوی نے تکلیف سے تنگ آکر اور خاوند کی ایذاؤں سے گھبرا کر اپنی آئندہ مصلحت اور باقی ماندہ عمر کی آسائش کے خیال سے دوائے تلخ پی لی یعنی دین مہر کی معافی گوارا بھی کر لی تو اس کا نام رضائے قلب ہوا نہ کہ رضائے نفس اور دین مہر کے حلال ہونے میں اعتبار رضائے نفس کا ہے جیسا کہ اوپر کی آیت سے معلوم ہوا

کہ نہ رضائے قلب کا پس اگر اس رضا کے حیلہ سے حکومت و سلطنت دنیوی میں کوئی شخص تقاضا کرنے والا نہیں رہا تو کیا اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی اس کی بدولت سرخرو ہو جاؤ گے؟ احکم الحاکمین کو کیا جواب دو گے جب کہ رضائے قلب اور رضائے نفس سے بحث پیش ہو اور پوچھا جائے کہ ہماری اجازت کے خلاف حیلہ جوئی سے ایک بے کس اور ضعیفہ کا حق کیوں ہضم کیا؟ اسی طرح کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ تاکہ بھیک مانگنا بری بات ہے اور اگر سخت ضرورت کے وقت سوال کرنے کی نوبت آئے تو اس کا ضرور خیال رکھو کہ مجمع میں سوال نہ کرو کیونکہ اکثر ایسی حالت میں دینے والا جو کچھ بھی تم کو دے گا وہ اپنے مجمع میں ذلت اور رسوائی اور ہم چشموں میں سبکی خیال سے دے گا اور اس کو بخوشی خاطر دینا نہیں کہتے۔ پس ایسا دیا ہوا مال استعمال کے قابل نہیں ہے کیونکہ کسی کے بدن پر مار کر لینا یا کسی کے دل پر شرم اور دباؤ کا کوڑا مار کر لینا دونوں برابر ہیں نیز اپنے دین کو ذریعہ کسب نہ بناؤ مثلاً صلحا فقراء کی سی صورت اس نیت سے نہ بناؤ کہ ہمیں بزرگ سمجھ کر لوگ دیں گے حالانکہ تم بالکل کورے ہو اور تمہارا دل گندگی سے آلودہ ہے یاد رکھو کہ دوسرے کا دیا ہوا مال تمہیں اس وقت حلال ہے جب کہ تمہاری چھپی ہوئی حالت ایسی نہ ہو کہ اگر دینے والا اس سے آگاہ ہو جائے تو ہرگز نہ دے اس سے معلوم ہوا کہ اگر تم نے صورت بزرگوں کی سی بنائی اور تمہارے دل میں خواہشات نفسانی کا ہجوم ہے اور ظاہر ہے کہ دینے والے نے جو کچھ تم کو دیا ہے وہ صرف تمہاری صورت دیکھ کر دیا ہے کہ اس کو تمہاری باطنی گندگی کی بالکل خبر نہیں ہے تو اگرچہ علمائے شریعت جو ظاہری انتظام کے ذمہ دار ہیں اس مال کو حلال بتلائیں گے۔ مگر صاحبِ بصیرت ضرور حرام کہے گا اور اس کو استعمال میں لانے کی ہرگز اجازت نہ دے گا۔

دوسری بات جس کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ علماء کے فتوے پر اکتفا نہ کیا کرو بلکہ اپنے دل سے بھی پوچھا کرو کہ اس معاملہ میں دل کیا کہتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "تم اپنے دلوں سے بھی فتوے لیا کرو اگرچہ مفتی فتوے دے چکیں" بات یہ ہے کہ گناہ مسلمان کے دل میں ضرور چبھا کرتا ہے کیونکہ

جو چیز ضرر پہنچانے والی ہو گی وہ دل میں کھٹکے بغیر نہ رہے گی پس جو شئے درحقیقت حرام رہے گی یا جو کام فی الواقع گناہ ہو گا اس کو تمہارا دل بے کھٹکے ہرگز قبول نہ کرے گا اور ہر چیز کی اصلیت اس طرح پر دل کے فتوے سے معلوم ہو جایا کرے گی۔ نفس پر زیادہ تشدد بھی نہ کرو مثلاً کہنے لگو کہ ایسا مال کہاں ہے جو مشتبہ بھی نہ ہو اور کسی ظالم یا فاسق کے ہاتھ میں نہ ہو کر آیا ہو؟ اور جب ایسا مال نہیں مل سکتا تو یا تو انسان جوگی بن کر گھاس پات کھانے پر قناعت کرے اور ایسا نہ کر سکے تو بے باک ہو کر جو چاہے کھائے پئے ایسا خیال کرنا گمراہی ہے۔ حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان کے بین بین (درمیان) کی چیز مشتبہ کہلاتی ہیں مگر تم کو صرف اتنی تکلیف دی گئی ہے کہ جو مال شرعاً" حلال ہے اور اس کے حرام اور نجس ہونے کا کوئی ظاہری سبب تم کو معلوم نہیں ہے اس کو حلال سمجھ کر کھاؤ پیو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مشرک آدمی کے مشکیزہ سے اور حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ نے ایک عیسائی عورت کے گھڑے سے وضو فرمایا اور اگر اس وقت پیاس ہوتی تو نوش بھی فرماتے اس سے معلوم ہوا کہ خواہ مخواہ وہم کرنا کہ اللہ جانے پانی پاک ہے یا ناپاک جائز نہیں ہے۔ جب پانی کے ناپاک ہونے کی بظاہر کوئی وجہ تمہیں معلوم نہیں ہے تو اس کو پاک ہی سمجھنا چاہئے اسی طرح جو حلال شے کسی ایسے آدمی کے ہاتھ میں پاؤ جس کا حال تم کو معلوم نہ ہو تو اس کو پاک سمجھو اور مسلمانوں کے ساتھ حُسنِ ظن رکھو اور یہ سمجھ کر کہ مسلمانوں کے پاس جو کچھ مال ہے حلال اور پاک ہی کمائی کا ہو گا اس کی دعوت بھی قبول کر لیا کرو خصوصاً" جب کہ مسلمان صالح اور دیندار ہو۔ ہاں البتہ ظالم بادشاہ یا سود خور' شراب بیچنے والے کا مال جب تک یہ نہ پوچھ لو کہ کس حلال طریقہ سے کمایا ہے حلال نہ سمجھو پس اگر تحقیق کے بعد معلوم ہو جائے کہ سود یا ظلم کی کمائی اور شراب کی قیمت نہیں ہے تو اس کا لے لینا بھی حرام نہیں ہے اور اگر کسی کے اس غالب حصہ حلال آمدنی کا ہے اور کم حصہ حرام کا تو اس کا کھانا بھی حلال ہے البتہ اگر نہ کھاؤ تو تقویٰ ہے۔ حضرت شیخ ابن المبارک رحمتہ اللہ علیہ کے کارندہ متعینہ بصرہ نے بذریعہ خط ان سے دریافت کیا تھا

کہ جو شخص ظالم بادشاہ سے لین دین رکھتا ہو اس سے لین دین کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو شیخ نے لکھا کہ اگر اس شخص کا اس کے علاوہ اور بھی کوئی ذریعہ کسب ہو تو اس سے معاملہ کرنا جائز ہے ورنہ ناجائز۔

دنیا میں چھ قسم کے آدمی :۔

غرض کہ دنیا میں چھ قسم کے آدمی ہیں اور ہر ایک کے ساتھ معاملہ کا جدا حکم ہے۔

پہلی قسم وہ آدمی جن کی صورتِ کسب اور دینداری اور بددینی کا حال کچھ بھی معلوم نہیں ہے ایسے لوگوں کا دیا ہوا مال حلال ہے اور اس سے پرہیز کرنا ضروری نہیں۔ البتہ احتیاط کے خیال سے نہ کھایا جائے تو تقویٰ میں داخل ہے۔

دوسری قسم وہ صلحا جن کی دینداری کھلی ہوئی اور کمائی کا مشروع طریقہ ظاہر ہے ان کے مال میں شبہ کرنا وسوسہ شیطانی ہے بلکہ اگر ان کو اس کے پرہیز کرنے سے رنج ہو تو ایسا تقویٰ بھی حرام اور باعثِ گناہ ہے۔

تیسری قسم وہ لوگ جن کا سارا مال یا نصف سے زیادہ مال ظلماً یا سود یا شراب کی بیع و شراء سے حاصل ہوا ہے اس کا دیا ہوا مال یقیناً حرام ہے اور اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

چوتھی قسم وہ لوگ جن کا نصف سے کم مال حرام کے ذریعہ سے کمایا ہوا ہے اور تمہیں معلوم بھی ہے کہ زیادہ مقدار کسب حلال ہی کی ہے' مثلاً دو ذریعہ تو حلال کے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کوئی مشروع تجارت کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ ترکہ میں کچھ جائیداد پائے ہوئے ہے جس کی آمدنی اس کو ملتی ہے اور ایک ذریعہ حرام ہے مثلاً کسی ظالم بادشاہ کا نوکر ہے اور تنخواہ لیتا ہے مگر اس ایک ذریعہ کی نسبت ان دو ذریعوں کی آمدنی زیادہ ہے' تو چونکہ اس کے پاس زیادہ مال حلال ہے اس لئے کثرت کا اعتبار کیا جائے گا اور اس کے دیئے ہوئے مال کو حلال ہی سمجھا جائے گا البتہ اس سے پرہیز کرنا تقویٰ میں شمار ہو گا۔

پانچویں قسم وہ لوگ ہیں جن کے کسب کا ذریعہ اگرچہ معلوم نہیں ہے مگر ظلم و

تعدی کی علامتیں ان پر نمایاں ہیں مثلاً جابر حکام کی سی شکل و لباس اور وضع اختیار کئے ہوئے ہیں تو چونکہ یہ ظاہری حالت یوں بتا رہی ہے کہ ان کا مال بھی ظلماً ہی حاصل ہوا ہو گا لہٰذا اس سے احتیاط کرنی چاہئے اور اس کی تفتیش کئے بغیر حلال نہ سمجھو۔

چھٹی قسم وہ لوگ ہیں جن پر علامتِ ظلم تو کوئی نمودار نہیں ہے البتہ فسق و فجور کے آثار نمایاں ہیں مثلاً داڑھی منڈی ہوئی ہے یا مونچھیں بڑھی ہوئی ہیں یا فحش بک رہا ہے اور گالیاں دے رہا ہے یا اجنبی عورت کی طرف دیکھ رہا ہے یا اس سے باتیں کر رہا ہے تو اگرچہ یہ فعل سب حرام ہیں مگر مال کے حاصل کرنے میں چونکہ ان کو کچھ دخل نہیں ہے لہٰذا مال کو حرام نہیں سمجھا جائے گا۔ پس اگر تم کو معلوم ہو کہ یہ مال اس نے ترکہ پدری میں پایا ہے یا کسی حلال ذریعہ سے کمایا ہے تو اس کو حلال سمجھو دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے مشرک کے پانی کو نجس نہیں سمجھا پس جب مجوسیت اور نصرانیت کے سبب پانی مشتبہ یا ناپاک نہیں ہوا تو مسلمان کا مال محض اس کے فسق و فجور کی وجہ سے کیسے ناپاک ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر اس کے مال کا حلال ذریعہ کسب بھی تم کو معلوم نہ ہو تو ایسی صورت میں اس مال کے استعمال میں تامل اور احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔

اس تشریح کے بعد پھر ہم یہی کہتے ہیں کہ اپنے دل سے بھی فتویٰ لے اور جس مال سے دل کھٹکے اس کا ہرگز استعمال نہ کر البتہ یہ ضرور دیکھ لے کہ دل کے فتویٰ پر عمل کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے سے اس شخص کو رنج تو نہ ہو گا پس اگر رنج کا اندیشہ ہو تو ایسا تقویٰ کرنا بھی جائز نہیں ہے مثلاً کسی نامعلوم الحال مسلمان نے کوئی چیز تحفتہ" تمہیں دی یا تمہاری دعوت کی اور تم نے تقویٰ کی بنا پر اس کے مال کی تفتیش شروع کر دی تو ظاہر ہے کہ یا تو خود اسی سے پوچھو گے یا اس سے خفیہ دوسرے لوگوں سے تحقیق کرو گے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ گر اس سے پوچھا تو اس کو ضرور رنج ہو گا یا اگر دوسروں سے پوچھا اور اس کو خبر ہو گئی تو مسلمانوں کو رنج پہنچانے کے علاوہ مسلمان کے ساتھ بدگمانی رکھنے اور بعض دفعہ غیبت اور تہمت میں

مبتلا ہونے کا بھی اندیشہ ہے اور یہ سب حرام ہیں اور تقویٰ کا چھوڑنا حرام نہیں ہے پس ایسے موقع پر اس مسلمان کا دل خوش کرنا واجب ہے دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باندی حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا وہ کھانا جو کسی مسلمان نے ان کو صدقہ دیا تھا بلا تامل کھا لیا اور صدقہ دینے والے کے مال اور حال کا تجسس نہ فرمایا۔ البتہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو شروع شروع جو چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرور پوچھ لیا کہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اور یہ بھی صرف اس وجہ سے کہ صدقہ کا مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حلال نہ تھا اور اس سوال میں کسی کو رنج یا ایذاء بھی نہیں ہوتی تھی کیونکہ صدقہ اور ہدیہ دونوں کی ایک ہی صورت ہے صرف دینے والے کی نیت اور محل و مصرف کا فرق ہوتا ہے باقی اس سے زیادہ تفتیش نہیں فرمائی کہ کس طرح اور کہاں سے حاصل کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ اگر کوئی مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلا تامل قبول فرما لیتے اور کہیں بھی منقول نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں دریافت فرمایا ہو کہ تمہارا مال کس ذریعہ سے آیا ہے البتہ کبھی کبھار کسی غالب شبہ کے موقع پر تحقیقِ حال فرما لی ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سفر میں بازار سے تمام ضروریات کی چیزیں شامل فرماتے اور خرید بھی فرماتے۔ حالانکہ یہ بھی جانتے تھے کہ سود اور لوٹ اور مال غنیمت میں خیانت کئے ہوئے مال بھی بازاروں ہی میں فروخت ہوتے ہیں مگر ان توہمات کی طرف کبھی توجہ نہیں فرمائی بلکہ غالب اور کثرت کی بناء پر بازار میں فروخت ہونے والے سارے مال کو تفتیش و تحقیق کے بغیر حلال سمجھا۔ اسی طرح تم بھی بازار کی چیزوں کو حرام نہ سمجھو البتہ اگر ناجائز اور حرام طریقہ سے حاصل کی ہوئی چیزیں کسی شہر یا بازار میں بکثرت فروخت ہونے لگیں تو اس وقت تفتیش و تحقیقِ حال کئے بغیر خریدنا اور استعمال میں لانا بے شک جائز نہیں ہے۔

(۸) حقوق العباد

بے شک تمام مخلوق عمر کی کشتی پر سوار ہو کر دنیا کا سفر مکمل کر رہی ہے اور دنیا ایک مسافر خانہ ہے اس لئے آخرت کے مسافروں یعنی مسلمانوں کا اپنی سرائے کے ہم جنس مسافروں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا بھی دین کا ایک رکن ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کی تین حالتیں ہوتی ہیں کیونکہ یا تو مجرد اور تن تنہا ہوگا یا اہل و عیال اور دوست احباب وغیرہ سے تعلقات رکھتا ہوگا یا درمیانی حالت ہوگی۔ یعنی تعلق تو ہوگا مگر صرف اقرباء اور رشتہ داروں یا پڑوسیوں سے ہوگا عام مخلوق سے نہ ہوگا۔ پس تینوں حالتوں کے حقوق اور حسن سلوک سے تمہیں واقف ہونا چاہئے جن میں سے دو حالتوں کو ہم بیان کرتے ہیں۔

(i) پہلی حالت :۔

پہلی حالت میں چونکہ آدمی کو صرف اپنی ہی ذات سے تعلق ہے اس لئے اپنے نفس کی اصلاح اور اس خدائی لشکر کے حقوق ادا کرنے ضروری ہیں جو اس کے اپنے اندر بسنے والی مختصر سی دنیا میں (یعنی انسان میں) اللہ عزّوجلّ نے پیدا فرمایا ہے اور چونکہ یہاں ہمیں اختصار مقصود اس لئے انسانی جسم میں خدائی لشکر کے صرف سرداروں کا تذکرہ کرتے ہیں اور ہوشیار کئے دیتے ہیں کہ ہر مجرد و تنہا مسلمان کے لئے بھی ان کی حفاظت اور نگہداشت ضروری ہے

یاد رکھو! تمہارے اندر ایک خواہش پیدا کی گئی ہے جس کی وجہ سے تم ہر مفید اور پسندیدہ یعنی مرغوب شئے کو حاصل کرنے کی سعی کرتے ہو اور ایک غصہ پیدا کیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے تم ہر مضر اور مکروہ چیز کو دفع کرنے کی کوشش کرتے ہو اور تیسری عقل پیدا کی گئی ہے اس سے تم اپنے معاملاتْ کا انجام سوچتے اور اپنی رعیت کی حفاظت کرتے ہو پس غصہ کو کتاب سمجھو' خواہش کو گھوڑا اور عقل کو بادشاہ اس کے بعد معلوم کرو کہ یہ تینوں قوتیں تمہاری ماتحت بنائی گئی ہیں کہ ان میں عدل و

انصاف کرنا اور اس قدرتی سپاہ سے مدد لے کر ابدی (ہمیشہ رہنے والی) سعادت حاصل کرنا تمہارا فرض ہے۔ پس اگر تم کتّے کو مہذّب اور گھوڑے کو شائستہ کر کے بادشاہ عقل کا مطیع و فرمانبردار بنائے رکھو گے اور عقل کا حق ادا کرو گے تو ضرور مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ اگر محکوم کو حاکم کی مسند پر بٹھا دیا اور حاکم بادشاہ کو تابعدار غلام بنا دو گے تو انصاف کھو بیٹھو گے اور ظالم کہلاؤ گے کیونکہ کسی شئے کا بے محل رکھنا ہی تو ظلم کہلاتا ہے لہٰذا جب خواہشِ نفسانی کوئی چیز حاصل کرنی چاہے یا غصہ کسی شئے کو دفع کرنا چاہے تو عقل سے سوچا کرو کہ اس کا انجام کیا ہے؟ اگر انجام اچھا ہو تو عقل کو چاہئے کہ اس کام کے کرنے کی ان کو اجازت دے دے اور اگر انجام برا دیکھے تو ہرگز اجازت نہ دے بلکہ اپنے ماتحت غلاموں سے اس کو پکڑوائے مثلاً نفس اگر بے جا خواہش کرتا ہے تو غصہ کو اس پر حملہ کرنے کا حکم دے کہ وہ اس بدخواہ نادان خادم کو پا بہ زنجیر کر دے اور اگر غصہ بھڑکنا اور بے راہ چلنا چاہے تو شدت کا اس پر حملہ کرائے کہ وہ اس کو ٹھنڈا کر دے اور اس کا خیال پورا نہ ہونے دے اور اگر تم نے اپنی عقل سے دریافت ہی نہیں کیا یا دریافت تو کیا مگر اس کے حکم پر کان نہ دھرے اور نہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی بلکہ اس کو خادم اور تابعدار غلام بنا لیا کہ شہوت و غصہ جو کچھ کرنا چاہیں عقل ان کی ہاں میں ہاں ملا کر ان کا منشا پورا کرنے میں حیلے اور تدبیریں سوچے تو گویا تم نے قدرتی سپاہ میں رد و بدل کر دیا اور جن میں عدل و انصاف رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا ان میں ظالمانہ کاروائی کی پس قیامت کے دن جب تمام اعراض کو اجسام عطا کئے جائیں گے اور شہوت نفسانی کو کتّے کی اور غصہ کو گھوڑے کی صورت مرحمت ہو گی اور عقل شاہانہ لباس پائے گی تو اس وقت یہ راز کھل جائے گا اور تم کہو گے ہائے افسوس ہم نے کیسا ظلم کیا کہ بادشاہ کو کتّے اور گھوڑے کے سامنے سربسجود رکھا کاش شکاری مرد کی طرح اس کتّے اور گھوڑے کو بوقت ضرورت کام میں لاتے کہ بے موقع نہ ان کو بھگاتے اور نہ خلافِ عقل ان سے کوئی کام لیتے اور نہ عقل کی ماتحتی سے ان کو باہر نکالتے بلکہ ان کو عقل کا ایسا تابعدار بنائے رکھتے کہ جہاں وہ چاہتی وہاں ان سے کام لیتی ورنہ بیکار اپنی جگہ پڑے

رہتے گویا ہیں ہی نہیں۔

(ii) دوسری حالت :۔

دوسری حالت یہ ہے کہ جب تمہیں عام مخلوق سے تعلق ہو تو اس وقت اس کا ضرور لحاظ رکھو کہ مخلوق کو تم سے کسی قسم کی ایذا نہ پہنچے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق محفوظ رہے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ مخلوق کو نفع پہنچاؤ اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ صدیقین کا ہے کہ جن سے ایذاء اٹھاؤ ان کے ساتھ اچھا سلوک اور احسان کرو کیونکہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو نصیحت فرمائی تھی کہ ''اے علی (کرم اللہ وجہہ) اگر صدیقین کا درجہ حاصل کرنا چاہو تو جو تم سے قطع تعلق کرنا چاہے تم اس سے تعلق رکھو اور جو تم پر ظلم کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو''

مخلوق کے حقوق کی بجا آوری کے لئے ہدایات

مخلوق کے حقوق ادا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا خصوصی لحاظ رکھا کرو۔

۱۔ جو کچھ اپنے لئے بہتر سمجھو وہی دوسروں کے لئے بہتر سمجھو کیونکہ حدیث شریف میں ایسے شخص کے لئے بشرطیکہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو جائے، جہنم سے محفوظ رہنے کی بشارت آئی ہے۔ (بخاری)

۲۔ ہر کسی کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ مغرور اور متکبّر کو پسند نہیں کرتا پس اگر کوئی دوسرا شخص تمہارے ساتھ تکبّر سے پیش آئے تو اس کو برداشت کرو۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نصیحت فرماتا ہے کہ عفو و درگذر کی خصلت اختیار کرو بھلائی کی ترغیب دو اور جاہلوں سے پہلو تہی کرو۔

۳۔ بڑوں کی تعظیم کرو اور چھوٹوں پر شفقت کی نظر رکھو۔ حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو جوان کسی بوڑھے کی تعظیم اس کے بڑھاپے کی وجہ سے کرے

گا تو اس جوان کے بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ اس کی تعظیم کرنے والا شخص پیدا فرمائے گا۔ (ترمذی حسن غریب) اس حدیث میں اشارۃً درازئ عمر کی بھی بشارت آگئی ہے کہ اس کو بوڑھا ہونا نصیب ہو گا۔

۴۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے پیش آؤ کیونکہ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو دوزخ سے بچنے اور اللہ عزّوجلّ کے محبوب ہونے کی بشارت مرحمت فرمائی (ابن حبان صحیح)

۵۔ دو مسلمانوں میں رنجش ہو جائے تو صلح کرا دو۔ شریعت میں ایسے مواقع الفت پیدا کرنے (تالیف قلوب) کے لئے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت ہے اور شرعاً اس کا درجہ نفل نماز اور نفلی روزہ سے بھی افضل ہے۔

۶۔ سلوک اور احسان کرتے وقت اہل اور نااہل مت دیکھا کرو کیونکہ اگر کوئی نااہل بھی ہو تو تم اس کے ساتھ کیوں نااہل بنتے ہو بلکہ سلوک کے لئے تو تمہارا اہل ہونا کافی ہے۔

۷۔ لوگوں سے ان کی حالت کے موافق برتاؤ کیا کرو یعنی جاہل میں اس کمال اور تقویٰ کو مت ڈھونڈو جو علماء میں ہوا کرتا ہے اور عوام کی طبیعتوں میں خواص کی سی سمجھ اور سلیقہ کی توقع مت رکھو کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ الٰہی مجھے وہ راستہ بتا دے جس سے کہ مخلوق بھی مجھ سے محبت کرے اور تو بھی راضی رہے تو حکم ہوا کہ اے داؤد (علیہ السلام) دنیا داروں سے ان کی حالت کے موافق برتاؤ کرو اور دینداروں سے ان کے حال کے مطابق۔ لوگوں سے برتاؤ کے وقت ان کے مرتبوں کا بھی لحاظ رکھا جائے یعنی اگر کوئی دنیا دار باعزت آدمی تمہارے پاس آجائے تو اس کو عزت دو۔ دیکھو ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دنیا دار ذی عزت لوگوں (جیسا کہ جریر بن عبداللہ) کے لئے چادر مبارک بچھا دی اور فرمایا کہ جب کوئی قوم کا کوئی بڑا شخص (یعنی باعزت شخص) تمہارے پاس آئے تو اس کی عزت کیا کرو۔ (طبرانی، ابن عدی، حاکم)

۸۔ مسلمانوں کے عیب ہرگز ظاہر نہ کرو کیونکہ پردہ پوشی کرنے والے جنت میں

جائیں گے۔ (طبرانی) کسی کی غیبت ہرگز نہ کرو اور دوسروں کے عیوب کی ٹوہ میں بھی نہ رہو۔ یاد رکھو کہ اگر آج تم کسی مسلمان کی عیب جوئی کرو گے تو کل اللہ تعالیٰ تمہارا عیب ظاہر فرمائے گا اور جس کو وہ رسوا کرے اسے امان کہاں؟ (ابوداؤد)

۹۔ تہمت کی جگہ سے بھی بچو ورنہ لوگ بدگمان ہوں گے اور تمہاری غیبت کیا کریں گے اور چونکہ ان کی غیبت میں مبتلا ہونے کا سبب تم بنے ہو کہ نہ تہمت کے موقع پر تم جاتے اور نہ ان کو غیبت کا موقع ملتا لہٰذا گناہ تم پر بھی ہو گا اس لئے کہ گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ازواجِ مطہرات میں سے کسی (حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا) کے ساتھ کھڑے کچھ گفتگو فرما رہے تھے کہ کسی شخص کا اس جانب سے گزر ہوا چونکہ موقع تہمت کا تھا اس لئے حضورِ پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً آواز دے کر اس شخص سے فرمایا کہ اے شخص! جس عورت سے میں باتیں کر رہا ہوں یہ میری بیوی صفیہ (رضی اللہ عنہا) ہے۔ اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توبہ ہے کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بھی بدگمانی ہو سکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تعجب ہی کیا ہے شیطان تو بنی آدم کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے یعنی شاید تمہارے دل میں یہ وسوسہ پیدا کرتا اور وہ تمہاری بربادی کا سبب بنتا اس لئے مجھے اطلاع دینی ضروری ہوئی۔

۱۰۔ مسلمانوں کی حاجت روائی میں کوشش کیا کرو' حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر کسی کو کچھ دینے دلانے میں تاخیر فرماتے اور یوں فرمایا کرتے کہ میں صرف اس وجہ سے جلدی حکم نہیں دیتا کہ تمہیں سفارش کرنے کا موقع مل جائے اور تم زبان سے کلمۃ الخیر نکال کر ثواب حاصل کر لو۔ مسلمانوں کی حاجت روائی کے لئے کوشش کرنا بہرحال نافع ہے خواہ تمہاری کوشش سے اس کی حاجت پوری ہو یا نہ ہو۔ حدیث شریف میں اس کوشش کا اجر و ثواب سال بھر کے اعتکاف سے زیادہ آیا ہے۔ (حاکم کی روایت کے مطابق دو ماہ)

۱۱۔ ہر اسلامی بھائی سے سلام اور مصافحہ کرنے میں پیش قدمی (پہل) کیا کرو۔ حدیث

شریف میں آیا ہے کہ جب دو مسلمان آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو رحمت الٰہی کے ستر حصوں میں سے انہتر حصے تو اس کو ملتے ہیں جس نے مصافحہ میں ابتداء کی ہوتی ہے اور ایک حصہ دوسرے کو ملتا ہے۔ (ترمذی)

۱۲۔ اسلامی بھائی کی عدم موجودگی میں بھی اس کی مدد کرو یعنی اس کی آبرو یا مال پر اگر دھبہ یا نقصان آئے تو اس کو مٹاؤ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جہاں کسی مسلمان کی آبرو ریزی ہو رہی ہو تو جو مسلمان ایسے وقت میں اس کی مدد فرمائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت اس کی مدد فرمائے گا اور جو مسلمان اس کی کچھ پروا نہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی اعانت کے موقع پر اس کی کچھ پروا نہ فرمائے گا۔ (ابو داؤد)

۱۳۔ شریر لوگوں سے بھی اس نیت سے مدارات کرلیا کرو کہ اس طرح ان کے شر سے محفوظ رہو گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے نبئ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کی اجازت چاہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اچھا آنے دو برا شخص ہے" اور جب وہ اندر آگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی نرمی و حلاوت کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بڑی قدر فرماتے ہیں۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی وجہ پوچھی تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدتر شخص قیامت کے دن وہ ہے جس کی بدی سے بچنے کے لئے لوگ اس کو چھوڑ دیں (بخاری) نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس طریقے سے بھی انسان اپنی آبرو بچائے وہ صدقہ میں شمار ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں سے ان کے اعمال کے موافق میل جول رکھو۔ البتہ بدکاروں کو دل میں جگہ نہ دو۔ (حاکم حسن و صحیح)

۱۴۔ زیادہ تر مسکینوں کے پاس اٹھو بیٹھو اور امراء کی محبت سے پرہیز کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ یا الٰہی! میرا جینا اور میری موت مسکینوں کی سی حالت میں رکھ اور بروزِ محشر مجھے مسکینوں کی جماعت میں اٹھانا۔ (ابن عساکر) حضرت

سلیمان علیہ السلام باوجود اس جاہ و اقتدار کے جب کبھی مسجد میں کسی مسکین کو بیٹھا دیکھتے تو اس کے پاس بیٹھ جاتے اور فرمایا کرتے کہ مسکین اپنے ہم جنس مسکین کے پاس بیٹھ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ یا اللہ (عزّوجلّ) میں تجھے کہاں تلاش کروں؟ تو حکم ہوا کہ شکستہ دل لوگوں کے پاس۔

۱۵۔ جنہیں دینی فائدہ پہنچا سکو یا جن سے دینی فائدہ حاصل کر سکو ان کے پاس بیٹھنے کی کوشش کیا کرو اور غافل لوگوں سے دور اور علیحدہ رہو کیونکہ سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ برے ہم نشین سے تنہائی بہتر ہے اور تنہائی سے نیک بخت ہم نشین بہتر ہے۔ (بیہقی)

یہ خیال کرو کہ اگر تم ایسے شخص کے پاس آتے جاتے رہو جو ہر دفعہ تمہارے کپڑے کا ایک تار داڑھی کا ایک بال نوچ لیا کرے تو ضرور تمہیں اندیشہ ہو گا کہ اس طرح تو عنقریب کپڑا ختم اور داڑھی ندارد ہو جائے گی اور تم اس کے پاس آمد و رفت ترک کر دو گے پس اسی طرح جس کی صحبت میں حبہ برابر بھی دین کی کمی ہو تو اس سے پرہیز کرو ورنہ تھوڑا تھوڑا ہو کر سارا دین برباد ہو جائے گا۔

۱۶۔ مسلمان بھائی اگر بیمار ہو تو اس کی عیادت کیا کرو اور انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ اور اس کے بعد بھی کبھی کبھی قبرستان ان کی قبر پر ہو کر آیا کرو اور ان کے لئے ایصالِ ثواب اور استغفار و طلبِ رحمت کرتے رہا کرو۔

۱۷۔ اگر ان کو چھینک آئے تو **یرحکم اللہ** کہو اور اگر وہ تم سے کسی بات میں مشورہ کریں تو نیک صلاح دیا کرو' المختصر جو اہتمام اپنے نفس کو نفع پہنچانے اور ضرر سے بچانے کا کر سکتے ہو وہی مسلمانوں کے لئے محفوظ رکھو

متعلقین کے حقوق :۔

متعلقین میں نسبی (جو نکاح کی وجہ سے ہوں) اور مہری رشتہ دار یعنی بیوی' بچے' ماں' باپ' ہمسایہ' غلام و نوکر وغیرہ شامل ہیں۔ نبیٔ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جن کا مقدمہ پیش ہو گا وہ ہمسایہ ہوں گے لہٰذا پڑوس کے حقوق کا زیادہ خیال رکھنا چاہئے کیونکہ ہمسایہ کے پلے ہوئے کتے کے اگر

ڈھیلا بھی مارو گے تو ہمسایہ کے ایذا رساں سمجھے جاؤ گے۔ ایک عورت نہایت پارسا تھی مگر اس کے پڑوسی اس سے نالاں رہتے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دوزخی فرمایا ہے (ابن ابی شیبہ) ایک مرتبہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے فرمایا کہ جانتے ہو ہمسایہ کا کتنا حق ہے۔ اگر ہمسایہ مدد چاہے تو مدد کرو اور قرض مانگے تو قرض دو اگر تنگ دست ہو جائے تو سلوک کرو اگر بیمار پڑے تو عیادت کرو اور انتقال کر جائے تو جنازہ کے ساتھ جاؤ اگر اس کو کوئی خوشی حاصل ہو تو مبارک باد دو اور رنج پہنچے تو تسلی دو۔ اس کی اجازت کے بغیر اپنا مکان اتنا اونچا نہ بناؤ کہ اس کو خاطر خواہ ہوا نہ پہنچ سکے اگر کوئی پھل خرید کر لاؤ تو اس میں سے بقدر مناسب اس کو بھی دو اور اگر نہ دے سکو تو چپکے سے گھر لے جاؤ تاکہ دیکھ کر اس کو حرص نہ ہو' اس کے بعد مناسب ہے کہ تمہارا بچہ بھی پھل لے کر باہر نہ نکلے کیونکہ ہمسایہ کے بچہ کو حرص ہو گی تو اس کو رنج ہو گا اس طرح اگر ہانڈی چڑھے تو ایک چمچہ پڑوسی کو بھی پہنچاؤ' جانتے ہو کہ پڑوسی کا حق کس قدر ہے بس یہ سمجھ لو کہ پڑوسی کے حق وہی پورے کر سکتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو۔

رشتہ داروں کے حقوق:۔

رشتہ داروں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھو رحم جس کے معنی قرابت یعنی رشتہ داری کے ہیں رحمان سے مطابقت رکھتا ہے۔ اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ جو شخص رحم سے میل رکھے گا میں اس سے میل رکھوں گا اور جو اس سے قطع تعلق کرے گا میں اس سے قطع تعلق کروں گا۔ صلہ رحمی کرنے والے کی عمر میں برکت ہوتی ہے۔ جنّت کی خوشبو جو پانچ سو برس کی مسافت سے آتی ہے وہ قاطع رحم کو ہرگز نہ آئے گی۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ماں باپ کی خدمت کرنا نماز' روزہ' حج و عمرہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے بھی افضل ہے اور ماں کا حق باپ کی بہ نسبت دو چند ہے (طبرانی) حدیث شریف میں حکم ہے کہ جو کچھ دینا ہو ساری اولاد کو مساوی دیا کرو۔ (طحاوی)

غلاموں کے حقوق :۔

غلاموں یعنی خادموں کے بارے میں امت کے غم خوار آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو کچھ خود کھاؤ انہیں بھی کھلاؤ اور جو تم پہنو وہی انہیں بھی پہناؤ تحمل سے زیادہ ان سے کام نہ لو اور یہ سمجھو کہ صاحب قدرت ربّ نے ان کو تمہارا غلام بنا دیا ہے اگر وہ چاہتا تو تمہیں ان کا غلام بنا دیتا جب کھانا لا کر تمہارے سامنے رکھے تو چونکہ آگ کی تپش اور دھوئیں کی کلونس اسی نے برداشت کی اور تمہیں ان تکلیفوں سے بچایا ہے اس لئے اس کی دل دہی کرو اور اس کو شفقت کے ساتھ کھلاؤ یا کم از کم ایک لقمہ اس کے ہاتھ پر رکھ دو اور پیار کے لہجے میں کہو کہ کھا لو ایسا کرنے سے اس کا دل خوش ہو جائے گا اور تمہاری عزت میں فرق نہ آئے گا اگر وہ کوئی خطا کر بیٹھے تو درگذر کرو' اس کو غرور اور حقارت کی نظر سے مت دیکھو۔ (مسلم)

بیوی کے حقوق :۔

بیوی کے حقوق غلام یا نوکر سے کئی حصے زیادہ ہیں اس لئے بیوی کی تمام ضروریات کو پورا کرو اور حسنِ معاشرت اور خوش کلامی سے برتاؤ کرو کیونکہ بیبیوں کے ساتھ نیک برتاؤ رکھنے والے کے بڑے درجے ہیں دیکھو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کے ساتھ کیسی خوش طبعی' محبت و نرمی کا برتاؤ فرماتے اور ان کی دل جوئی فرماتے رہتے تھے۔ احادیث میں حسنِ معاشرت کی بڑی تاکید آئی ہے۔

اسلامی بھائی بنانے کی فضیلت :۔

اپنے لئے کچھ اسلامی بھائی (دینی دوست) تجویز کر لو جن سے محض اللہ عزّوجلّ ہی کے واسطے محبت ہو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آواز دے گا کہاں ہیں وہ جو خاص میرے واسطے محبت باہم رکھتے تھے آج جب کہ میرے سایہ کے سوا کہیں سایہ نہیں

ہے میں ان کو اپنے سایہ میں لے لوں گا (مسلم) حدیث شریف میں آیا ہے کہ عرش کے گرد نور کے منبر ہیں جن پر ایک جماعت بیٹھے گی جن کے لباس اور چہرے سر تا پا نور ہوں گے اور وہ لوگ نہ نبی ہیں نہ شہید مگر انبیاء (علیہم السلام) و شہداء ان کی حالت پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون لوگ ہوں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزّوجلّ کے مخلص بندے جو باہم اللہ عزّوجلّ کے واسطے محبت کرتے اور اللہ عزّوجلّ کے واسطے ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے اٹھتے اور آتے جاتے ہیں (نسائی، ابن حبان) یاد رکھو کہ ایمان کے بعد اللہ عزّوجلّ کے واسطے محبت کا مرتبہ ہے تم کسی شخص سے اس بنا پر محبت کرتے ہو کہ دنیا میں تمہیں اس کے ذریعہ سے ایسی چیز حاصل ہے جو آخرت میں مفید ہے مثلاً شاگرد کو اپنے استاد کے ساتھ علم دین حاصل کرنے کے سبب محبت ہے اور مرید کو اپنے مرشد سے راہ طریقت معلوم کرنے کی وجہ سے محبت ہے بلکہ استاد کو اپنے شاگرد کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ بھی اسی بنا پر ہوتی ہے کہ دین کا سلسلہ اس کی وجہ سے مدتوں تک میری طرف منسوب ہو کر جاری رہے گا اور مجھے آخرت میں صدقہ جاریہ کا اجر ملے گا اس طرح اپنے خادم اور محسن کے ساتھ اسی نیت سے محبت ہوتی ہے کہ ان کی خدمت اور احسان کی وجہ سے فارغ البالی ہوتی ہے اور اطمینان کے ساتھ عبادت و طاعت کا وقت نصیب ہوتا ہے پس یہ اللہ عزّوجلّ ہی کے واسطے محبت ہے کیونکہ کوئی دنیاوی غرض اس محبت سے مقصود نہیں ہے مگر پھر بھی چونکہ خاص اللہ عزّوجلّ کی ذات مطلوب نہیں ہے اس لئے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی اللہ عزّوجلّ کے پیارے اور نیک بندے سے بغیر کسی دینی غرض کے صرف اس وجہ سے محبت ہو کہ یہ شخص اپنے محبوب یعنی اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے کیونکہ معشوق کے کوچہ کا کتّا بھی دوسرے کتّوں سے ممتاز ہوتا ہے پھر بھلا کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہو اور اس کے محبوب بندوں سے محبت نہ ہو۔ یاد رکھو کہ رفتہ رفتہ یہ تعلق یہاں تک قوی ہو جاتا ہے کہ اللہ عزّوجلّ کے محبوب بندوں کے ساتھ اپنے نفس کا سا برتاؤ ہونے لگتا ہے بلکہ اپنے نفس پر بھی ان

کو ترجیح ہوتی ہے پس جتنا بھی یہ علاقہ مضبوط ہو گا اسی قدر کمال میں ترقی ہو گی۔ اسی طرح اللہ تعالٰی کے نافرمان بندوں سے بغض یعنی عداوت ہونی چاہئے جن کو یہ درجہ نصیب ہوتا ہے ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اللہ عزّوجلّ کے نافرمان بندوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان سے بات کرنا تک چھوڑ دیتے ہیں اور ان کی صورت نظر آتی ہے تو آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ یا الٰہی! کسی فاسق شخص کا مجھ پر احسان نہ کرائیو کہ اس کے احسان کی وجہ سے میرے دل میں اس کی محبت آجائے حُبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ اسی کا نام ہے اور جس مسلمان کو اپنے مولا سے اتنی بھی محبت نہیں جس کا یہ اثر ہو کہ اللہ عزّوجلّ کے محبوب بندے اس کے محبوب بن جائیں اور اللہ عزّ و جلّ کے دشمنوں کو وہ اپنا دشمن سمجھے تو سمجھنا چاہئے کہ اس شخص کے ایمان میں ضعف ہے اور اس کو اپنے رب ہی کے ساتھ محبت نہیں ہے۔

(۹) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے "اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور بری سے منع کریں اور یہی لوگ مراد کو پہنچے" سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب لوگ گناہوں کا ارتکاب کرنے میں مبتلا ہو جائیں اور ان میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو ان کو معصیت (گناہگاری) سے روک سکتے ہیں مگر وہ کاہلی (سستی) کریں اور ان کو گناہ کے کاموں سے منع نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان پر عذاب جلد نازل فرمائے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک ایسے قصبہ پر عذاب نازل ہو چکا ہے جس میں اٹھارہ ہزار مسلمان آباد تھے اور ان کے اعمال انبیاء علیہم السلام جیسے تھے (یعنی بہت نیک تھے ورنہ انبیاء علیہم السلام تک کسی کا عمل نہیں پہنچ سکتا) مگر اتنا نقص تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں دیکھ کر ان کو غصہ نہ آتا تھا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑے ہوتے تھے لہٰذا ہلاک کر دیئے گئے اگر تم کسی جگہ پر کوئی ناجائز کام ہوتا ہوا دیکھو گے اور خاموش بیٹھے رہو گے تو اس گناہ میں تم بھی شریک سمجھے جاؤ گے کیونکہ غیبت کرنے والا سننے والا گناہ کے اندر دونوں برابر ہیں۔

گناہگاروں سے میل جول رکھنا کیسا ہے؟

جس طرح غیبت کرنے والا سننے والا گناہ میں برابر کے شریک ہیں بالکل اسی طرح ریشمی لباس یا سونے کی انگوٹھی پہننے والے جس قدر گناہ گار ہیں اسی قدر ان کے وہ یار دوست یعنی ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے مسلمان بھی گناہ گار ہیں جو ان کو ریشمی لباس اور طلائی انگشتری پہنے دیکھتے ہیں اور منع نہیں کرتے۔ اسی طرح ایسے مکانوں میں بیٹھنا جس کی دیواروں پر تصویریں ہوں' یا ایسی مجلس میں شریک ہونا جہاں کوئی بدّعت ہو رہی ہو یا کسی مباحثہ یا مناظرہ کے ایسے جلسے میں جانا جہاں سب لغو مشغلہ ہو سب گناہ ہے پس خوب سمجھ لو کہ ان گناہوں کے موقعوں سے صرف بچنا ہی ضروری

نہیں ہے بلکہ جب تک بلا تامل نصیحت نہ کرو گے اور گناہوں سے انہیں روک نہ دو گے اس وقت تک عہدہ برآ ہرگز نہ ہو سکو گے یہی سبب ہے کہ گوشہ نشینی بہتر سمجھی گئی ہے اور جتایا گیا ہے کہ زیادہ میل جول سے ضرور معصیت ہوتی ہے کیونکہ مسلمان کیسا ہی متقی کیوں نہ ہو جب تک ملامت کرنے والوں کو ملامت کا خوف دل سے نہ نکال دے اور گناہ ہوتا دیکھے تو اس کو روک نہ دے گناہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا غرض مداہنت حرام ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب ہے دو حالت میں اس کا وجوب قائم نہیں رہتا۔ وہ دو حالتیں مندرجہ ذیل ہیں

اگر مبلغ کی بات کی لوگ پرواہ نہ کریں تو؟

مبلغ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں اس گناہ سے منع کروں گا تو مجھے حقارت کی نظر سے دیکھا جائے گا اور نہ میری بات کی یہ لوگ پرواہ کریں گے اور نہ اس گناہ کو چھوڑیں گے تو ایسی حالت میں نصیحت کرنا واجب نہ رہے گا اور یہ حالت اکثر ان معصیتوں کے متعلق پیش آتی ہے جن کے مرتکب فقہاء و علماء یا ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو دیندار اور متقی سمجھتے ہیں کیونکہ اگر کوئی شخص ان کو نصیحت کرے تو ان کو سخت ناگوار گزرتا ہے اور وہ گناہ چھوٹتا نہیں جس کو انہوں نے اختیار کیا ہے ایسے موقع پر بے شک سکوت جائز ہے البتہ زبان سے پھر بھی نصیحت کر دینا مستحب ہے اس کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھو کہ ایسی جگہ نصیحت کرنا واجب نہیں رہا مگر خود وہاں سے اٹھ آنا ضرور واجب ہے کیونکہ بیٹھا رہنا اختیاری فعل ہے اور باختیارِ خود معصیت کا دیکھنا بھی معصیت ہے پس جہاں دورِ شراب جاری ہو یا غیبت ہو رہی ہو یا داڑھی منڈے بددین خلافِ شرع عمل کرنے والے فاسق و فاجر بیٹھے ہوں وہاں ہرگز نہ بیٹھو۔

سخت ایذا کے قوی اندیشہ کے باوجود ہمت کرنا مستحب ہے :۔

ایسا بھی ممکن ہے کہ ناجائز فعل سے باز رکھنے پر قدرت تو ہو مگر اس بات کا غالب اندیشہ ہو کہ اگر دست اندازی کی تو یہ لوگ ضرور میری پٹائی کریں گے مثلاً کسی

جگہ شراب کی بوتل یا ستار وغیرہ یا کوئی اور سامان لہو و لعب رکھا دیکھو اور ممکن ہے کہ آگے بڑھ کر اسے توڑ ڈالو مگر غالب گمان ہو کہ ایسا کرنے سے ان چیزوں کا مالک تمہیں ایذا ضرور دے گا تو ایسی صورت میں چپ رہنا جائز ہے مگر ہمت کرنا پھر بھی مستحب ہے کیونکہ ایسے امر خیر میں جو بھی ایذا پہنچے گی اس کا بہت بڑا اجر ملے گا۔ ایسی حالت میں سکوت کا جائز ہونا اس شرط پر ہے کہ بدنی تکلیف یعنی مار پیٹ یا مالی نقصان یا سبکیت یا آبروریزی یا ایذا رسانی کا یقین یا غالب گمان ہو نہ کہ نصیحت کرنے سے ان کو میری محبت نہ رہے گی یا ناگوار گزرے گی اور مجھے زبان سے کچھ برا بھلا کہنے لگیں گے یا مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگیں گے اور آئندہ کوئی تکلیف پہنچانے کی فکر کریں گے یا جو کچھ دیتے ہیں وہ بند کر لیں گے یا آئندہ کوئی دینی مصلحت و بہبودی کی توقع ہے اور نصیحت کرنے سے وہ مصلحت ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ تو خوب جان لو کہ ایسی موہوم باتوں کی شریعت میں کچھ وقعت نہیں ہے اور نہ ان خیالات سے خلاف شرع امر پر نصیحت کئے بغیر چپ ہو رہنا جائز ہے

مبلغ کی خوبیاں :۔

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ مبلغ کا بردبار طبیعت رکھنے والا یعنی حلیم الطبع اور نرم مزاج ہونا نہایت ہی ضروری ہے کیونکہ اپنی نیک بختی جتانے اور دوسروں پر اعتراض کرنے کی نیت سے تبلیغ یا وعظ کرنے کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا بلکہ اس سے لوگوں کو صدمہ ہوتا اور برافروختگی بڑھتی ہے اور لوگ گناہوں سے باز آنے کی بجائے ضد اور اصرار کرتے ہوئے گناہوں کا مزید جرات و سراعت کے ساتھ ارتکاب کرنے لگتے ہیں اور جب ضد بند گئی تو پھر نصیحت کرنا اللہ عزّوجلّ کے واسطے نہ رہا بلکہ اپنے دل کی جلن نکالنے اور پھپھولے پھوڑنے کی غرض سے ہو گیا لہٰذا جب وعظ و نصیحت کی غرض سے بیان کرو تو نہایت نرمی سے کرو اور نیت یہی رکھو کہ کاش اللہ عزّوجلّ جس شخص کو میں تبلیغ کر رہا ہوں اس کی گناہوں کی عادت چھوٹنے میں آسانی پیدا فرما دے اور میں نہیں تو کوئی دوسرا ہی مبلغ اس کی ان بری عادات کو چھڑا دے تو کافی ہے کیونکہ خود معترض اور ناصح بننے کی عزت کا خواست گار ہونا خلوص کے

خلاف ہے۔ ایک مرتبہ مامون رشید کو ایک مبلغ نے کسی بات کی سختی کے ساتھ نصیحت
کی تو مامون رشید نے مبلغ سے کہا ذرا نرمی سے نصیحت کیا کرو دیکھو تم سے بہتر ناصح
حضرت کلیم اللہ (علیہ السلام) پیغمبر مجھ سے بدتر بندہ فرعونِ مصر کی جانب ناصح بنا کر
بھیجے گئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا **وقولا لہ قولا لیّنا** " کہ اے موسیٰ علیہ
السلام اور اے ہارون علیہ السلام فرعون سے نرمی کے ساتھ باتیں کیجئے۔ حضرت امامہ
رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ ایک نوجوان شخص رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے زنا کرنے کی اجازت دیجئے' اس
شخص کا یہ کلمہ سن کر لوگ اس کو ڈانٹنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ اس کو چھوڑ دو پھر اس شخص کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا کہ یہاں آؤ اور جب وہ
شخص پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم سے ایک بات پوچھتا
ہوں۔ بھلا اگر تمہاری ماں سے کوئی شخص زنا کرے تو کیا تمہیں ناگوار نہیں گزرے
گا۔ اس نے عرض کیا کیوں نہیں گزرے گا' ضرور گزرے گا۔ اس پر آپ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم ہی بتاؤ کہ دوسروں کو اپنی ماؤں کے ساتھ ایسا ہونا کیوں
کر گوارا ہو گا اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا تمہاری بیٹی کے
ساتھ اگر کوئی ایسا فعل کرے تو کیا تمہیں پسند ہے اس نے جواب دیا کہ نہیں آپ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر دوسرے اپنی بیٹیوں کے ساتھ اس کو کیوں پسند
کریں گے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہن اور پھوپھی اور خالہ سب
ہی کا نام لے کر دریافت فرمایا اور یوں ہی جواب دیتے رہے کہ پھر دوسرے لوگ
اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ایسی بے حیائی کیوں پسند کریں گے' آخر یہ عورت کہ
جس سے زنا کیا جائے کسی کی ماں یا بیٹی یا پھوپھی یا خالہ ضرور ہو گی اور جب تمہیں
اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کے ساتھ بھی کسی کا زنا کرنا گوارا نہیں ہے تو
دوسرے مسلمان کو ان کے کسی رشتہ دار سے تمہارا زنا کرنا کیوں کر گوارا ہونے لگا
ہے۔ اس کے بعد سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دست اقدس اس کے سینے پر
رکھا اور دعا فرمائی کہ اے پروردگار! اس کا دل پاک فرما دے اور اس کے گناہ بخش

دے اور اس کی شرم گاہ کی حفاظت فرما۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ گناہ اس کے نزدیک زنا ہی تھا" (احمد' طبرانی صحیح)

ایک مرتبہ مجمع میں حضرت فضیل رحمتہ اللہ علیہ سے شکایت کی گئی کہ حضرت سفیان بن عینیہ رحمتہ اللہ علیہ نے شاہی تحفہ قبول فرما لیا ہے آپ رحمتہ اللہ علیہ نے سن کر اجتماع میں تو صرف یہ فرما کر ٹال دیا کہ نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے سفیان (رحمتہ اللہ علیہ) نے اپنا حق لیا ہو گا اور وہ بھی ناتمام مگر خلوت میں حضرت سفیان رحمتہ اللہ علیہ کو پاس بٹھا کر نہایت نرمی سے نصیحت فرمائی کہ اے ابو علی (رحمتہ اللہ علیہ) ہم اور تم اگر بزرگ نہیں ہیں تو بزرگوں کو محب اور دوست رکھنے والے تو ضرور ہیں یعنی ہم بزرگوں کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں اور اولیاء کرام علیہم رحمتہ الرحمٰن سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اس لئے تمہیں ایسے کاموں سے بچنا چاہئے جنہیں لوگ حجت پکڑیں اور (نعوذ باللہ) بزرگوں کے نام پر عیب لگائیں۔

کیا مبلغ کا عالم باعمل ہونا ضروری ہے؟

مبلغ کو پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے کیونکہ نصیحت کا اثر اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ناصح خود بھی باعمل ہو ورنہ لوگ ہنستے اور مذاق اڑایا کرتے ہیں ہاں یہ ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ نصیحت کرنے کا جواز یا وجوب عامل ہونے پر موقوف نہیں ہے۔ اگر کوئی عالم خود عامل بھی ہو تب بھی اس کو نصیحت اور تبلیغ کا چھوڑ دینا اور گناہوں کو ہوتے ہوئے دیکھ کر سکوت اختیار کرنا جائز نہ ہو گا۔ خوب سمجھ لو کہ یہ خیال بھی ایک شیطانی وسوسہ ہے کہ جب تک خود پورے عامل نہ ہو جائیں اس وقت تک دوسروں کو کیا نصیحت کریں گے۔ اگر ایسا خیال معتبر سمجھا جائے تو تبلیغ' وعظ اور نصیحت کا سلسلہ مفقود اور دروازہ بالکل مسدود ہو جائے گا۔ یاد رکھو کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب اور بے حد ضروری ہے اور عاصی و گنہگار شخص کے لئے بھی تبلیغ کرنا اور وعظ کہنا جائز ہے البتہ مبلغین اور واعظین پر یہ دوسرا وجوب مستقل ہے کہ اپنے علم پر عمل کریں اور جس کام کی بھی دوسروں کو نصیحت کریں اس پر خود بھی کاربند ہوں۔ پس اگر ایک واجب کو ترک کیا اور خود بھی عامل نہ بنے تو دوسرا واجب ترک کرنا کیوں جائز ہونے لگا کہ دوسروں کو نصیحت بھی نہ کریں۔

(۱۰) اتباعِ سنت

مسلمان کے لئے سعادت مندی کی معراج یہی ہے کہ اس کی تمام حرکات و سکنات میں سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نمایاں ہو اس لئے جان لو کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال یعنی سُنّتوں کی دو قسمیں ہیں۔

(i) عبادات یعنی نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج وغیرہ

(ii) عادات یعنی کھانا' پینا' سونا' اٹھنا' بیٹھنا وغیرہ

تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ دونوں قسم کے افعال میں آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء و پیروی کریں کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس آیت قرآنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم فرمایا ہے اس میں اِتباع کے لئے کسی قسم کی کوئی شرط عائد نہیں فرمائی بلکہ ارشاد فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی تمہیں عنایت فرمائیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے باز آجاؤ۔

حضرت شیخ محمد بن اسلم رحمتہ اللہ علیہ نے عمر بھر صرف اس وجہ سے تربوز نہیں کھایا کہ انہیں سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کے تربوز تناول فرمانے کا انداز معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اسی طرح ایک بزرگ نے ایک مرتبہ غلطی سے بائیں پاؤں میں موزہ پہن لیا (جبکہ دائیں پاؤں میں پہلے موزہ پہننا مسنون ہے) تو اس غلطی کے کفارہ میں جب تک ایک گون گیہوں خیرات نہ کر لئے اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے۔ معلوم ہوا کہ کامل اتباع اور پوری سعادت مندی یہی ہے کہ عادتوں میں بھی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتداء کیا جائے کیونکہ اس میں بے شمار فائدے ہیں اور ذرا سی سستی کی وجہ سے ایسی عظیم نعمتِ دارین کو کھونا بے وقوفی اور بدنصیبی ہے۔ اب اس کا سبب اور کامل اِتباع کے چند فوائد بیان کئے جاتے ہیں۔

اتباعِ سنت کے فائدے:۔

(i) دل اور اعضاء کا آپس میں بڑا گہرا اور خاص تعلق ہے اور اعضائے بدن

کے تمام افعال کا اثر دل کے اندر پہنچتا ہے لہٰذا جب تک اعضاء کی حرکات و سکنات حد اعتدال پر نہ ہوں گی تب تک دل کو کبھی بھی صلاحیت اور نور حاصل نہ ہو سکے گا کیونکہ انسانی دل مثلِ آئینہ ہے اور آئینہ سورج کی روشنی سے اس وقت روشن ہو سکتا ہے جب کہ اس میں تین باتیں موجود ہوں۔ اول یہ کہ اس کو صاف کیا جائے' دوم یہ کہ اس کا جسم صاف و شفاف ہو اور تیسرا یہ کہ اس میں ٹیڑھا پن ہرگز نہ ہو۔ اسی طرح جب دل کے اندر تینوں اوصاف موجود ہوں گے کہ خواہشاتِ نفسانی کے ترک کر دینے سے اس کی صفائی ہو جائے' ذکر الٰہی کی وجہ سے اس میں پاکیزگی پیدا ہو جائے اور افعال اعضاء کو اعتدال پر رکھنے کی وجہ سے اس میں کجی نہ آسکے تو اس وقت بے شک اس میں تجلیاتِ الٰہی کا عکس ظہور پذیر ہو گا۔

اعتدال کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کو اس کے موقع اور مقام پر رکھا جائے مثلاً چار سمت میں سے ایک سمت یعنی جانب قبلہ کو اللہ تعالیٰ نے عزت بخشی ہے اس لئے تمام نیک کاموں میں خواہ ذکرِ الٰہی یا تلاوتِ قرآن اور وضو ہو یا دعاء قبلہ کی جانب منہ کیا جائے اور جو افعال گھنیانے کے قابل ہوں مثلاً قضائے حاجت یعنی بول و براز (پیشاب اور پاخانہ وغیرہ) اور جماع میں ستر کھولنا وغیرہ اس وقت اس جانب سے رخ پھیر لیا جائے۔ ایسا کرنا چونکہ سمت قبلہ کی عزت کا قائم رکھنا ہے' لہٰذا یہی اعتدال ہے یا مثلاً اللہ تعالیٰ نے داہنی جانب کو بائیں جانب پر شرف بخشا ہے' اس لئے تمہیں بھی اس کے شرف کا ہر وقت خیال رکھنا چاہئے کہ اگر اچھے کام کرو مثلاً کلام مجید اٹھانا یا روٹی کھانی ہو تو داہنا ہاتھ اور میلے کام مثلاً استنجا کرنا' ناک سنکنا یا بضرورت کسی ناپاک چیز کو ہاتھ لگانا ہو تو بایاں ہاتھ آگے بڑھاؤ' کپڑا پہنو تو اول دائیں طرف اور جوتہ پہنو تو اول داہنے پاؤں میں پہنو۔ مسجد میں جاؤ تو اول داہنا پاؤں رکھو اور جب باہر نکلو تو اول بایاں پاؤ نکالو۔ الغرض ہر شے کے مرتبے کا خیال رکھنا عدل اور انصاف کہلاتا ہے اور اس ظاہری اعتدال سے قلب بھی معتدل اور مستوی ہو جائے گا۔ اگر یہ رمز تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہے تو تجربہ کر کے دیکھو اور اس کا تو تم نے بھی تجربہ کیا ہو گا کہ جو لوگ سچ بولنے کے خوگر ہوتے ہیں ان کے خواب بھی اکثر سچے

ہوتے ہیں اور جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں ان کی خوابیں بھی زیادہ جھوٹی ہوتی ہیں۔ کیونکہ راست گوئی سے قلب میں اعتدال اور درستی و استقامت آجاتی ہے اور دروغ گوئی سے اس میں کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھو چونکہ شاعر اکثر جھوٹے اور لغو تخیلات کے عادی ہو جاتے ہیں اس لئے ان کے قلب میں کجی پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا جہاں تک ہو سکے قلب میں جھوٹے خیالات کو جگہ نہ دو ورنہ دل کا اعتدال ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

(ii) دوائیں دو قسم کی ہوتی ہیں بعض وہ کہ جن کے اثر و تاثیر میں مناسبت مثلاً شہد چونکہ گرم ہے اس لئے گرم مزاج والوں کو نقصان دیتا ہے اور سرد مزاج والوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ ایسی دوائیں تو بہت کم ہیں کیونکہ اکثر دوائیں دوسری قسم میں داخل ہیں یعنی وہ دوائیں کہ جن کی تاثیر کسی مناسبت سے نہیں ہوتی اس کا نام خاصیت ہے اور ظاہر ہے کہ ہر شئے کی خاصیت یا تو الہام سے معلوم ہوتی ہے یا وحی سے یا تجزیہ سے، مثلاً سقمونیا دست آور ہے اور رگوں سے صفرا کو کھینچ لیتا ہے یا مقناطیس کی یہ خاصیت ہے کہ لوہے کو اپنی جانب کھینچتا ہے یہ دونوں تاثیریں تجربہ ہی سے معلوم ہوئی ہیں۔ اسی طرح اعمال و افعال کی تاثیریں بھی دو ہی طرح کی ہیں یعنی اعمال میں اور ان کی تاثیروں میں تو مناسبت کھلی ہوئی موجود ہے مثلاً نفس کی خواہشوں کا پورا کرنا اور دنیوی لذتوں کے پیچھے پڑ جانا مضر ہے کیونکہ جب مرتے وقت دنیا سے روانگی ہو گی اور ظاہر ہے کہ یہ ایک نہ ایک دن ضرور ہونا ہے تو اس وقت ضرور ان لذتوں کو چھوڑتے ہوئے حسرت ہو گی اور جب کچھ نہ بن پڑے گا تو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا رخصت ہو گا پس لذتوں میں پڑنے اور ان کے نقصان و ضرر میں مناسبت کھلی ہوئی ہے یا مثلاً ذکرِ الٰہی مفید ہے کیونکہ ذکر کے سبب اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو گی اور معرفت کی بدولت محبتِ الٰہی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آخرت کی پائیدار لذتوں کا شوق ہو گا' لہٰذا دنیا سے جاتے وقت کچھ بھی حسرت نہ ہو گی بلکہ اپنے محبوب سے ملنے کے شوق میں ہنسی خوشی روانہ ہو گا پس ذکر اللہ اور اس کے ثمرو اثر میں بھی مناسبت ظاہر ہے البتہ دوسری قسم کے اعمال اور ان کی تاثیر میں کچھ مناسبت

معلوم نہیں ہوتی اور یہ وہی خاصیت ہے جو وحی اور نورِ نبوت کے علاوہ کسی طرح بھی معلوم نہیں ہو سکتی اور اکثر اعمال شریعت چونکہ اسی قسم میں داخل ہیں لہٰذا جب تم دیکھو کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مباح کاموں میں سے باوجود دونوں پر قدرت ہونے کے ایک کو ترجیح دی ہے مثلاً استنجا دائیں ہاتھ سے بھی کر سکتے تھے مگر پھر بائیں ہاتھ کو ہی اس کام میں لگایا اور سیدھے ہاتھ کو علیحدہ رکھا ہے۔ تو یہ علامت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خاصیت معلوم فرما کر ہی ایسا کیا ہے اور ضرور اس میں کوئی خاص نفع ہے جس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا تعجب کی بات ہے کہ محمد بن ذکریا طبیب پتھروں اور بوٹیوں کی جو خاصیتیں بتائے وہ تو بلا چون و چرا اور بے سوچ سمجھے صحیح مان لی جائیں اور سیّد المرسلین حضرت محمد بن عبداللہ علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام نُورِ نبوت اور وحیٔ ربانی سے اعمال و افعال کی جو خاصیتیں بیان فرمائیں ان کو نہ مانا جائے اور خلافِ عقل بتایا جائے۔ مسلمانو! یقین جانو کہ طبیبِ روحانی جو کچھ بھی کرے گا ضرور اس میں نفع ہو گا اگرچہ اس کی مصلحت تمہاری عقل اور علم میں نہ آسکے۔

(iii) انسان جانوروں کی طرح آزاد و بیکار نہیں پیدا کیا گیا بلکہ اس کو اشرف المخلوقات اور شریعت کا پابند بنایا گیا ہے اس لئے تمہارے لئے مناسب ہے کہ جو کام کرو سنت کے موافق کرو تاکہ نفس محکوم اور مطیع بنا رہے اور فرشتہ خصلت بن جاؤ اور یوں سمجھو کہ بندگی بے چارگی کا نام ہے اس لئے بندہ کو لازم ہے کہ جو حرکت بھی کرے وہ اتباعِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نیت سے کرے۔ حکمِ آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بجا آوری کرنے سے آثارِ بندگی ہر وقت ظاہر ہوتے رہیں گے اور ہر وقت ہر ہر ادا میں یعنی تمام تر حرکات و سکنات میں ریاضت و اطاعت کا اجر ملتا رہے گا۔ حکمِ شرعی کی ہر وضع سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں خواہ کسی طرح حکم مقرر ہو جائے کیونکہ اس کا جو اصل مقصد ہے کہ ایک خاص طرز کی پابندی ہو ہر طور پر حاصل ہے تو شرائع مختلفہ کے احکام بدل جانے پر بھی یہ فائدہ خاصہ محفوظ رہا بخلاف اول اور دوسرے فائدہ کے کہ حکمت اور خاصیت ایک معین چیز ہے اور وہ اختلاف

شرائع سے بدل نہیں سکتی پس اگر تم مندرجہ بالا تینوں فوائد سے واقفیت حاصل کر لو گے تو تمہاری تمام تر حرکات و سکنات میں اتباعِ سنت کی ضرورت تمہیں واضح ہو جائے گی۔

عبادات میں بلا عذر اتباعِ سنّت ترک کرنا کفر خفی ہے:۔

جو کچھ اتباعِ سنّت کے بارے میں بیان کیا جا چکا وہ امور عادیہ میں اتباع سنت کی ترغیب کے لئے بیان کیا گیا۔ عبادات میں بلا عذر اتباعِ سنّت چھوڑ دینا تو محض کفرِ خفی یا حماقت جلی ہے اس کے علاوہ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی مثلاً سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ "جماعت سے نماز پڑھنے میں تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ فضیلت ہے" (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مالک، احمد وغیرہم)

اس کے ماننے کے بعد اگر کوئی مسلمان بلا کسی معقول عذر کے جماعت کی نماز ترک کرے تو اس کا سبب یا تو اس کی حماقت ہے کہ اگر کوئی شخص دو پیسے چھوڑ کر ایک پیسہ لے تو اس کو احمق بنا دے اور خود ستائیں فضیلتیں چھوڑ کر ایک پر اکتفا کرے تو بے وقوف نہ ہوا؟ یا نعوذ باللہ یہ خیال ہے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد محض انتظامی مصلحت کی بناء پر ہے تاکہ اس رغبت سے لوگ ایک جگہ جمع ہو جایا کریں کیونکہ ستائیں کے عدد اور جماعت سے نماز پڑھنے میں کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی پس اگر خدانخواستہ ایسا خیال ہے تو یہ کفر ہے۔ اور کفر بھی ایسا خفی کہ اس کی اطلاع اپنے آپ کو بھی نہیں ہے۔ لوگوں کا ایسا حال ہو گیا ہے کہ اگر کوئی طبیب یا نجومی کوئی بات بتائے تو اس کی وجہ خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کو فوراً تسلیم کر لیں گے لیکن نبیُ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ عالیشان میں مناسبت ٹٹولتے ہیں۔ بھلا اگر کوئی نجومی یوں کہے کہ ستائیں دن گزرنے پر تمہیں ایک مصیبت کا سامنا ہو گا کیونکہ تمہارے طالع اور زحل میں ستائیس درجہ کا بعد ہے اور ہر روز ایک درجہ کم ہو گا اس لئے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو گھر میں بیٹھے رہو اور باہر نہ نکلا اس کو سن کر بے شک تم گھر کے پیوند ہو جاؤ گے اور سب کاروبار چھوڑ بیٹھو

گے اور اگر کوئی سمجھائے بھی کہ ارے میاں ایک درجہ کو اور ایک دن کو مناسبت کیا ہے؟ اور مصیبت اور زحل میں کیا تعلق ہے؟ نیز باہر نہ نکلنے اور مصیبت کے ٹل جانے میں کیا علاقہ ہے یہ سب واہیات باتیں اور نجومی پنڈتوں کے ڈھوسلے ہیں اس کا خیال ہی مت کرو تو تم اس کا کہنا کبھی نہ مانو گے اور اس کو احمق و بے وقوف اور علم نجوم کا منکر سمجھو گے پھر افسوس صد افسوس کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اعمال میں تمام مناسبتوں کو سمجھنا چاہتے ہو اور اگر نہ سمجھ میں آئیں تو منکر و بد اعتقاد بنے جاتے ہو تم ہی بتاؤ کہ کیا یہ کفر اور انکارِ رسالت نہیں ہے؟ حالانکہ ان عبادات کا موثر ہونا تجربہ سے بھی معلوم ہو چکا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ حضورِ پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبروں کی مناسبتیں اور مصلحتیں سب ہی کو معلوم ہو جایا کریں بھلا میں تم سے پوچھتا ہوں کہ اگر طبیب کوئی دوا بتائے اور اس کی خاصیت تم سے نہ بیان کرے یا نجومی کسی آئندہ واقعہ پر کوئی حکم لگائے اور اس کی مناسبت تمہیں نہ بتائے تو کیا اس کی بات منظور نہیں کرتے مگر افسوس کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی روحانی علاج فرمائیں اور اس کی مناسبت اور خاصیت نہ بتائیں تو اس کو منظور نہیں کرتے' اس کا سبب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ نجومی اور طبیب چونکہ موجودہ زندگی کے متعلق علاج بتا رہے ہیں اور اس زندگی کے ساتھ تمہیں محبت ہے لہٰذا آنے والی مصیبت یا مرض کے فکر میں اس کی وجہ اور مناسبت پوچھنے کا ہوش تک نہیں رہتا بلکہ دس برس بعد آنے والی مصیبت کا آج ہی سے فکر و انتظام شروع ہو جاتا ہے حالانکہ وہ محض موہوم اور ایسے لوگوں کی بتائی ہوئی باتیں ہیں جن کا ہزاروں دفعہ جھوٹ تم خود آزما چکے ہو اور جو ٹکے ٹکے پر ایسی باتیں بتاتے در بدر مارے مارے پھرتے ہیں اور حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ طبیب روحانی ہیں اس لئے قلبی امراض کا علاج اور دائمی صحت کی تدبیر تعلیم فرماتے ہیں اور اس کی تمہیں مطلق پرواہ نہیں' فکر نہیں' اندیشہ نہیں بلکہ آنے والی آخرت کی زندگی کا جیسا یقین ہونا چاہئے وہ یقین حاصل ہی نہیں اس لئے اس میں مناسبتیں پوچھتے ہو' اللہ تعالیٰ ایسی غفلت سے بچائے جس کی وجہ سے عبادتوں میں بھی

اتباعِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ ہو سکے۔ مسلمانوں کی یہی شان ہے کہ جس امر میں بھی کوئی حدیث وارد ہوئی ہو اس میں بے چون و چرا اقتداء کر لیا کریں مثلاً رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شنبہ یا پنج شنبہ کے دن پچھنے لگوانے سے برص کا اندیشہ ہے۔ (حاکم و بیہقی صحیح) ایک محدث نے اس حدیث کو ضعیف کہہ کر قصداً" شنبہ کے دن پچھنے لگوائے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برص میں مبتلا ہو گئے۔ چند روز بعد ایک شب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور مرض کی شکایت کرنے لگے تو سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جیسا کیا ویسا بھگتو۔ شنبہ کے دن پچھنے کیوں لگوائے تھے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس حدیث کا راوی ضعیف تھا آپ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ حدیث تو میری نقل کرتا تھا۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطا ہوئی' میں توبہ کرتا ہوں۔ یہ سن کر اُمّت کے غم خوار آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے دعا فرمائی اور صبح کو آنکھ کھلی تو مرض کا نشان بھی نہ رہا۔ اسی طرح حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عصر کے بعد سو جانے سے عقل کے جاتے رہنے کا خوف ہے (ابو یعلی) اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس شخص کے ایک جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو جب تک اس کو درست نہ کرا لے تو اس وقت تک صرف ایک جوتہ پہن کر ہرگز نہ چلے (بیہقی) اور دوسری حدیث میں ہے کہ زچہ کی اول خوراک تر کھجور ہونی چاہئے اور اگر یہ نہ ہو تو خشک چھوارا ہی سہی' کیونکہ اگر اس سے بہتر کوئی غذا ہوتی تو اللہ تعالیٰ عیسیٰ روح اللہ (علیہ السلام) کے پیدا ہونے پر حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو وہی کھلاتا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کوئی تمہارے پاس مٹھائی لائے تو اس میں سے کچھ کھا لیا کرو اور خوشبو لائے تو لگا لیا کرو(بیہقی) اسی طرح جو کچھ بھی طبیبِ روحانی فرما دیا کریں اس میں مناسبتیں نہ ٹٹولو بے چون و چرا مان لو کیونکہ امور میں بے شمار اسرار اور رموز ہیں جن کی خاصیتیں ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

اس باب کی ضروری ہدایات

اس باب میں دی گئی ہدایات کے دوران جن عبادتوں کا ذکر ہوا ان میں سے بعض جمع ہو سکتی ہیں جیسے نماز' روزہ اور تلاوت قرآن حکیم کہ تینوں ایک وقت میں پائی جا سکتی ہیں مثلاً روزہ دار شخص نماز میں قرآن شریف پڑھے تو دیکھو ایک ہی وقت میں تینوں عبادتیں حاصل ہو رہی ہیں اور بعض عبادت دوسری عبادت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ ذکرِ الٰہی بھی ہو اور تلاوتِ کلام اللہ بھی ہو یا نماز بھی ہو اور مسلمانوں کے حقوق کی خبر گیری بھی ہو۔ اس لئے مناسب ہے کہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں پر ان مختلف عبادتوں کو تقسیم کر لو کیونکہ اوقات کا انضباط ہونے سے سہولت بھی ہو جائے گی اور جو عبادت کا مقصود ہے وہ بھی حاصل ہو جائے گا یعنی ذکرِ الٰہی سے انس اور جہان فانی سے بیزاری اور نفرت پیدا ہو جائے گی۔ یاد رکھو کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور اس عالم فانی کے پیدا کرنے سے مقصود یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے محبت کرے تاکہ آخرت کی خوبی اس کو حاصل ہو اور چونکہ محبت بغیر معرفت کے ہو نہیں سکتی اس لئے معرفتِ الٰہی مقدم اور ضروری ہے اور معرفت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے دھیان اور یاد میں مشغول رہو کیونکہ جتنی بھی عبادتیں ہیں سب دھیان اور یاد ہی کی غرض سے ہیں۔ عبادتوں کو مختلف اقسام میں اس لئے تقسیم کیا گیا ہے کہ ہر وقت ایک طرز کی عبادت میں مشغول رہنے سے دل گھبرا نہ جائے نیز اگر ہر وقت ایک ہی عبادت کی جائے گی تو طبیعت اس کی خوگر ہو جائے گی اور عادت ہو جانے کی وجہ سے قلبی اثر ان سے جاتا رہے گا۔ اس لئے ہر عبادت کے لئے جدا وقت تجویز کر لینا ضروری ہے البتہ جو لوگ فنا اور مستغرق ہو جائیں ان کو ترتیب و تقسیم کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس مرتبہ میں پہنچ کر ایک ہی عبادت رہ جاتی ہے اور ہر وقت ذکر میں مشغولی ہوتی ہے مگر یہ درجہ ایسا نہیں کہ ہر شخص اس کو حاصل کر سکے اس لئے تمہیں اوقات منضبط کرنے کی نہایت ضرورت ہے کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک یہ عبادت اور اس گھنٹہ

سے اس گھنٹہ تک یہ عبادت اور دن کو یہ اور رات کو یہ' البتہ اگر علم دین پڑھتے ہو یا کسی جگہ کے حاکم ہو اور رعایا کی حفاظت میں مشغول ہو تو دن بھر اس میں مشغول رہنا دوسری عبادتوں سے بہتر ہے کیونکہ علم دین ہی کی بدولت حکم الٰہی کی تعظیم حاصل ہوتی ہے اور جو نفع اس تعلیم یا مخلوق کی حفاظت و نگہبانی سے لوگوں کو پہنچتا ہے وہ اصل دین ہے۔

اسی طرح عیال دار آدمی کو محنت مزدوری کرنا اور حلال معاش سے بال بچوں اور متعلقین کا پیٹ بھرنا بھی عبادتِ بدنی سے افضل ہے مگر ان حالتوں میں بھی ذکرِ الٰہی سے علیحدگی مت اختیار کرو بلکہ جس طرح کسی حسینہ معشوقہ کا عاشق اپنے معشوق کے سوا جس کام میں بھی مشغول ہوتا ہے بحالت مجبوری صرف ہاتھ پاؤں سے مشغول ہوتا ہے اور دل ہر وقت معشوقہ ہی میں پڑا رہتا ہے اسی طرح تم بھی جس کام میں چاہے مشغول رہو اعضائے بدن سے اس کو انجام دو مگر دل کو اللہ تعالیٰ ہی کے خیال میں مصروف رکھو۔ حضرت شیخ ابو الحسن خرقانی رحمتہ اللہ علیہ ہاتھ سے کسب فرماتے اور محنت مزدوری سے مال حاصل کرتے اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں تین چیزیں مرحمت ہوئی ہیں یعنی ہاتھ' زبان اور قلب۔ سو ان میں سے ہاتھ کسب معاش کے لئے ہے' زبان مخلوق کے واسطے ہے تاکہ پڑھائیں اور سمجھائیں اور باتیں کریں اور قلب دنیا کے کسی شخص کا بھی نہیں ہے بلکہ صرف اللہ عزّوجلّ کے لئے ہے کہ ہر وقت اس کے حضور میں حاضر رہے۔

اعمال ظاہری کے بارے میں ہدایات کا بیان ختم ہوا عمل کرنے والوں اور طالبینِ حق کے لئے یہی کافی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ہمیں ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم)

اخلاقیات کے دس اصول

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے اپنا دل بنا لیا وہی فلاح کو پہنچا اور ہمارے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "طہارت نصف ایمان ہے" کیونکہ ایمان کے دو جز ہیں یعنی دل کا ان نجاستوں سے پاک ہونا جو اللہ عزّوجلّ کو ناپسند ہیں اور ان خوبیوں سے آراستہ کرنا جو اللہ عزّوجلّ کو محبوب اور پسند ہیں۔ گویا نجاست سے طہارت کرنا ایمان کا ایک جزو ہے اور طاعت سے زینت و آرائش کا دوسرا ٹکڑا ہے لہٰذا اول تو ان اخلاقِ ذمیمہ کا علم ہونا ضروری ہے جن سے دل کو پاک رکھنا ضروری ہے ان کے اصول بھی دس ہیں۔ ان دس اصولوں کے بارے میں مختصراً" بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) زیادہ کھانا اور پیٹ بھرنے کا لالچ

زیادہ کھانا اور پیٹ بھرنے کا لالچ بے شمار گناہوں کی جڑ ہے کیونکہ اس سے جماع کی خواہش بڑھتی ہے اور جب شہوت بڑھتی ہے تو مال حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے کیونکہ شہوتیں مال کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں اور اس کے بعد طلبِ جاہ کی خواہش ہوتی ہے کیونکہ جاہ کے بغیر مال کا حاصل ہونا دشوار ہے اور جب مال و جاہ کی خواہش پیدا ہو گی تو تکبیر' ریا' حسد' کینہ' عداوت غرض بہت سی آفتیں جمع ہو جائیں گی اور دین کی تباہی کا پورا سامان اکٹھا ہو جائے گا۔ اس لئے حدیث میں بھوک کی زیادہ فضیلت آئی ہے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آدمی کے لئے بھرنے کے واسطے پیٹ سے زیادہ کوئی بُرا تن نہیں' آدمی کی ضرورت کے لئے تو چند لقمے کافی ہیں جن سے زندگی قائم اور کمر مضبوط رہے اور اگر اس سے زیادہ ہی کھانا ضروری ہے تو پیٹ کے تین حصے کر لینے چاہئیں کہ تہائی حصہ کھانے کے لئے ہو' تہائی حصہ پانی کے لئے اور تہائی حصہ سانس کے لئے خالی چھوڑ دیا جائے۔ (ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و حاکم صحیح)

بھوک کے فائدے :۔

بھوک میں بے شمار فائدے ہیں مگر ہم ان میں سے چند بڑے فائدوں کا تذکرہ کر رہے ہیں جن کو اصول کہنا مناسب رہے گا اور درحقیقت آخرت کی سعادت کا حصول انہی اصولوں پر موقوف ہے۔

(i) قلب میں صفائی اور بصیرت میں روشنی حاصل ہوتی ہے کیونکہ پیٹ بھر لینے سے سستی اور طبیعت کا کند ہونا لازم ہے علاوہ ازیں قلب کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور جب ذکاوت جاتی رہتی ہے تو معرفتِ الٰہی ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔

(ii) دل رقیق ہو جاتا ہے اور مناجات میں مزہ آتا ہے کیونکہ جب یہ توبرہ خالی ہوگا تو اپنے مالک کے سامنے سوال و التجا اور دعا کرنے میں لطف آئے گا اور خوف و خشیہ و انکسار پیدا ہو گا جو معرفت کے حاصل کرنے کی کنجیاں ہیں۔

(iii) سرکش نفس ذلیل اور مغلوب ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب دشمنِ پروردگار کو شکست ہوئی اور غفلت کا دروازہ بند ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب توجہ ہوگی اور سعادت کا دروازہ کھل جائے گا یہی وجہ ہے کہ جب رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا پیش کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور نہیں فرمائی اور یوں عرض کیا کہ بار الٰہا میں چاہتا ہوں کہ ایک دن پیٹ بھرے تاکہ شکر ادا کروں اور ایک دن فاقہ ہو تاکہ صبر کروں۔ (ترمذی)

(iv) آخرت کی مصیبتوں اور عذاب کی تکلیفوں کا دنیا میں بھی کچھ مزہ چکھنا چاہئے تاکہ ان کی اذیّت سے نفس خبردار ہو کر ڈرے اور ظاہر ہے کہ بھوک سے زیادہ انسان اپنے نفس کو کوئی عذاب نہیں پہنچا سکتا کیونکہ اس میں کسی قسم کے تکلّف اور سامان فراہم کرنے کی حاجت نہیں ہے اور جب بھوک کی وجہ سے عذابِ الٰہی کا ہر وقت مشاہدہ رہے گا تو اللہ تعالیٰ کی معصیت کی جانب توجہ بھی نہ ہو گی اور نافرمانی کی جرأت نہ ہو سکے گی۔

(v) تمام شہوتیں کمزور ہو جاتی ہیں کہ کسی خواہش کے پورا ہونے کی آرزو نہیں رہتی اور دنیا کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ

فرماتے ہیں کہ جب کبھی میں نے پیٹ بھر کر کھایا ہے تو ضرور کوئی نہ کوئی گناہ مجھ سے صادر ہوا یا کم سے کم گناہ کا قصد تو ہو ہی گیا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری پردہ فرمانے کے بعد سب سے پہلی بدعت جو ایجاد ہوئی وہ پیٹ بھر کر کھانا ہے پس جب مسلمانوں کے پیٹ بھرنے لگے تو ان کے نفس ان کو دنیا کی طرف کھینچ لے گئے۔ (بخاری' ابن ابی الدنیا)

(vi) زیادہ نیند نہیں آتی اور عبادت گراں نہیں گزرتی کیونکہ پیٹ بھر کر کھانے سے نیند کا غلبہ ہوا کرتا ہے اور نیند سے عمر بھی کم ہو ہوتی ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرنے دیتی۔ حضرت ابو سلیمان درانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنہوں نے شکم سیر ہو کر کھایا ہے ان میں چھ خصلتیں پیدا ہوئیں۔ اول عبادت کی حلاوت جاتی رہی' دوم حکمت و فراست اور ذکاوت و نورِ معرفت کا حاصل ہونا دشوار پڑ گیا' سوم مخلوقِ پروردگار پر شفقت اور ترس کھانے سے محرومی ہوئی کیونکہ سب کو اپنا ہی جیسا پیٹ بھرا ہوا سمجھا۔ چہارم معدہ بھاری ہو گیا۔ پنجم خواہشات نفسانی زیادہ ہو گئیں اور ششم یہ حالت ہو گی کہ مسلمان مسجدوں میں آرہے ہوں گے اور یہ بیت الخلاء جا رہا ہو گا نیز اللہ کے بندے بیت اللہ کا چکر لگائیں گے اور یہ کوڑیوں کا گشت کر رہا ہو گا۔

(vii) دنیوی تفکرات کم ہوجائیں گے اور فکرِ معاش کا بار ہلکا ہو جائے گا کیونکہ جب بھوک کی عادت ہوئی تو تھوڑی سی دنیا پر قناعت کر سکے گا اور پیٹ کی خواہش پورا کرنے کے لئے دوسروں سے قرض نہ لے گا بلکہ اپنے ہی نفس سے قرض مانگ لے گا یعنی اس کو خالی رکھے گا حضرت ابراہیم ابن ادہم رحمتہ اللہ علیہ سے جب کہا جاتا تھا کہ فلاں چیز گراں ہو گئی تو یوں فرما دیا کرتے تھے کہ ترک کر دو اور اس کی خواہش چھوڑ کر اس کو ارزاں بنا لو۔ اس سے زیادہ سستی چیز کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو خریدا ہی نہ جائے کیونکہ شکم سیری اور زیادہ کھانے کی لوگوں کو عادت پڑی ہوئی ہے اس لئے یک لخت اس کا چھوڑنا دشوار ہے لہٰذا اپنی خوراک میں روزانہ ایک لقمہ کم کر دیا کرو تو مہینہ بھر میں ایک روٹی کم ہو جائے گی اور کچھ گراں بھی نہ گزرے گا اور

جب اس کی عادت ہو جائے تو اب مقدار اور وقت اور جنس کی طرف توجہ کرو کہ رفتہ رفتہ اعلیٰ درجہ پر پہنچ جاؤ۔

مقدار طعام کے لحاظ سے درجات:۔

یاد رکھو کہ مقدار طعام کے لحاظ سے تین درجات ہیں۔

۱۔ اعلیٰ درجہ صدیقین کا ہے یعنی بس اتنا کھانا چاہئے جس سے کمی کرنے میں زندگی جاتی رہے یا عقل میں فتور آجائے اس سے زیادہ کھانا اس مرتبہ میں گویا پیٹ بھر کر کھانا ہے جس کی ممانعت ہے۔ حضرت سہل تستری رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک یہی مختار ہے ان کی رائے یہ تھی کہ بھوک کے ضعف کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنا شکم سیری کی قوت کے سبب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

۲۔ متوسط درجہ یہ ہے کہ روزانہ نصف مد یعنی دو تہائی رطل (ایک رطل چوالیس تولہ یعنی نصف کلو کے قریب ہوتا ہے) پر اکتفا کیا کرو حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ اور اکثر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عادت یہ تھی کہ ہفتہ بھر میں ایک صاع (تقریباً تین کلو) جو سے زیادہ نہ کھاتے تھے۔

۳۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ روزانہ ایک مد (ایک کلو) کی مقدار کھاؤ۔ اگر اس سے زیادہ کھاؤ گے تو پیٹ کے بندے سمجھے جاؤ گے اور چونکہ مقدار خوراک کے بارے میں لوگوں کی طبیعتیں اور حالات مختلف ہوتے ہیں لہٰذا سب کے لئے ایک مقدار معین نہیں ہو سکتی چنانچہ قاعدہ کلیہ یاد رکھو کہ جب اشتہائے صادق ہو یعنی واقعی شدید بھوک لگی ہو تو پھر کھانے کی جانب ہاتھ بڑھاؤ اور یہ اشتہاء پوری نہ ہونے پائے کہ ہاتھ روک لو اور اشتہاء کی علامت یہ ہے کہ جیسی بھی روٹی سامنے آجائے اس کو سالن اور ترکاری کے بغیر کھانے کی رغبت ہو کیونکہ جب خالص گیہوں کی خواہش ہوئی یا سالن کے بغیر روٹی کھانا گراں گزرا تو معلوم ہوا کہ بھوک کی سچی خواہش نہیں ہے بلکہ طبیعت کو لذت اور ذائقہ کی جانب ایسا میلان ہے جیسا شکم سیر ہونے کے بعد پھل یا میوہ کا ہوا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا نام بھوک نہیں ہے بلکہ تفکہ اور تلذذ ہے۔

کھانے کے اوقات :۔

کھانے کے وقت میں بھی کئی درجات ہیں اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ کم سے کم تین دن بھوکے رہ کر چوتھے دن کھایا کرو دیکھو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پے در پے چھ چھ دن تک بھوکے رہتے تھے اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ سات دن بھوکے رہنے کے عادی تھے اور بعض بزرگوں کے فاقہ کی نوبت چالیس دن تک پہنچی ہے اور یاد رکھو کہ جو شخص چالیس دن تک بھوکا رہے گا اس پر ملکوتی عجائبات اور اسرار میں سے کوئی راز ضرور منکشف ہو گا اور چونکہ یک لخت اس کا حاصل کرنا بھی دشوار ہے اس لئے آہستہ آہستہ بھوک کی عادت ڈالو۔ متوسط درجہ یہ ہے کہ دو دن بھوکے رہو اور تیسرے دن کھایا کرو اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ روزانہ صرف ایک دفعہ کھاؤ کیونکہ دونوں وقت کھانے سے بھوک کی کبھی حاجت ہی نہ ہو گی۔ پس جو شخص دو وقتہ کھانے کا عادی ہے اس کو تو بھوک کا مزہ ہی نہیں معلوم ہو سکتا کہ کیسا ہوتا ہے؟

جنس طعام کے درجات :۔

جنس میں اعلیٰ درجہ گیہوں کی روٹی ترکاری کے ساتھ کھانا ہے اور ادنیٰ درجہ جو کی روٹی کو بلا ترکاری کھانا یاد رکھو کہ ترکاری کی عادت اور مداومت بہت بُری ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی تھی کہ صاحبزادے کبھی گوشت روٹی کھاؤ اور کبھی روٹی و گھی اور کبھی دودھ روٹی، کبھی سرکہ روٹی، کبھی زیتون کے ساتھ روٹی کھاؤ اور کبھی نمک کے ساتھ اور کبھی روٹی پر قناعت کیا کرو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بھی ان لوگوں کے لئے ہے جن کو ترکاری کی ہمیشہ عادت ہے۔

سالکین اور مبلغین کے لئے خصوصی ہدایت :۔

جو اہلِ طریقت اور سالک یا دوسروں کو وعظ و نصیحت یعنی تبلیغ کرنے والے ہیں

ان کو ترکاری کیا معنی ساری ہی لذیذ (لذت فراہم کرنے والی مزے دار اشیاء) چیزوں اور خواہشوں کے پورا کرنے سے منع کیا جاتا ہے۔ بعض بزرگوں نے ایک چیز کی خواہش کو دس دس اور بیس بیس برس رکے رکھا ہے اور پورا نہیں ہونے دیا۔ ہم سب کے آقا و مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے کہ میری امت میں بدتر لوگ وہ ہیں جن کے بدن عمدہ غذاؤں اور لذیذ کھانوں سے پرورش پائے ہوئے ہیں (حاکم حسن) ایسے لوگوں کی ہمتیں بس طرح طرح کے کھانوں اور قسم قسم کے لباس ہی کی جانب متوجہ ہیں کہ منہ پھاڑ پھاڑ کر باتیں بناتے ہیں اور کام کچھ بھی نہیں کرتے۔

(۲) کثرت کلام اور فضول گوئی

کثرتِ کلام کی ہوس اور فضول گوئی کا قطع کرنا اشد ضروری ہے کیونکہ یوں تو اعضاء کے تمام کاموں کا اثر قلب پر پڑتا ہے مگر زبان چونکہ قلب کی سفیر ہے اور جو نقشہ قلب میں کھنچتا اور جس چیز کا تصور دل میں آتا ہے اس کا اظہار زبان ہی کیا کرتی ہے اس لئے اس کی تاثیر قلب پر زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ یاد رکھو کہ جب زبان جھوٹی ہو جاتی ہے تو دل میں بھی صورتِ کاذبہ (جھوٹی صورت) کی تصویر کھنچتی اور کجی آجایا کرتی ہے خصوصا" جب کہ جھوٹ کے ساتھ فضول و لغو گوئی بھی شامل ہو تو اس وقت تو قلب بالکل ہی سیاہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ کثرتِ کلام سے قلب مرجاتا ہے اور معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کی قابلیت ہی اس میں نہیں رہتی اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنی زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کا کفیل (ذمہ دار) ہوگیا' میں اس کے لئے جنت کا کفیل ہوں (بخاری و ترمذی) حدیث شریف میں آیا ہے کہ زبان ہی کے کرتوت اکثر لوگوں کو اوندھے منہ جہنم میں دھکیلیں گے۔ (طبرانی و ترمذی) لہٰذا اس کی حفاظت بہت ضروری ہے مسلمان کو چاہئے کہ اگر زبان ہلائے تو بھلائی اور نیکی کی بات بولے ورنہ چپ رہے کیونکہ جب زبان زیادہ چلنے لگتی ہے تو لغو گوئی بڑھ جاتی ہے اور جب لغو گوئی بڑھ گئی تو نجانے کس حد تک پہنچے اور کیا کچھ منہ سے بکتا پھرے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے منہ مبارک میں پتھر رکھ لیتے تھے تاکہ نفس خبردار رہے اور زبان ضرورت سے زیادہ کلام نہ کرے۔

زبان کے متعلق گناہوں سے بچنے کے لئے اس آیت پر عمل کرنا کافی ہے۔ **لا خَيۡرَ فِي كَثِيرٖ مِّن نَّجۡوَاهُمۡ** جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فضول اور بے فائدہ کلام نہ کرو صرف ضروری بات کے اظہار پر اکتفا کرو' اسی میں نجات ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی غزوہ میں ایک جوان شہید ہو گیا' لڑائی سے فراغت کے بعد شہیدوں کی لاشوں میں اس کی لاش بھی ملی اور دیکھا گیا کہ اس کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا' تھوڑی دیر بعد اس کی ماں آئی اور فاقہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے نام پر جان

دینے والے شہید بیٹے کے پاس بیٹھ کر اس کے منہ سے مٹی پونچھی اور کہا کہ بیٹا تجھے جنت مبارک ہو' یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا خبر ہے؟ ممکن ہے کہ بے فائدہ کلام کرنے کا عادی ہو (ابن ابی دنیا) اس سے معلوم ہوا کہ فضول گوئی کی عادت جنت میں جانے سے روکنے والی چیز ہے۔ مسلمان کو وہی بات زبان سے نکالنی چاہئے جس میں یا کوئی ثواب حاصل ہو یا کوئی نقصان رفع ہو اور جس بات کے زبان سے نکالنے میں نہ کوئی ثواب ہوتا ہے نہ کچھ نقصان ہوتا ہے تو وہ عبث اور فضول ہے اور اس سے احتراز کرنے کی ضرورت ہے۔ جتنی دیر فضول گوئی میں مشغول رہتے ہو اگر یہ وقت ذکرِ الٰہی میں صرف ہو تو نیکیوں کا کتنا بڑا خزانہ جمع ہو جائے پھر بھلا خزانے کو چھوڑنا اور پتھر ڈھیلے جمع کرنا کون سی عقل مندی ہے اور اگر فضول گوئی سے بڑھ کر دروغ گوئی تک نوبت پہنچی اور زبان سے غیبت اور گالیاں اور فحش یعنی ایسی باتیں نکلنے لگیں جن میں نفع تو درکنار الٹا دین کا ضرر اور نقصان ہے تب تو ایسی مثال ہو گی کہ بھرپور خزانہ چھوڑ کر آگ کے آلاؤ میں جا گھسے اللہ عزّوجلّ پناہ میں رکھے۔ (آمین بجاہ النبی طٰہٰ و یٰسین صلی اللہ علیہ وسلم)

ناول اور تاریخ وغیرہ کا مطالعہ :۔

اس حالت سے تمام قصے کہانیاں' سفر نامے مختلف ملکوں کی تاریخیں اور باشندگانِ دنیا کے لباس و خوراک اور طرز معاشرت و تمدن کے تذکرے اور تجارتوں' حرفتوں صنعتوں کے حالات سب اسی فضول اور عبث کلام میں داخل ہیں جس میں مشغول ہونا مقصود ہے اور آیتِ مذکورہ کی منشاء کے بالکل خلاف ہے۔

زبان کی آفتیں :۔

زبان کے متعلق بیس آفتیں ہیں اور چونکہ ہر ایک کی جدا جدا تشریح کا یہ موقع نہیں ہے اس لئے مختصر طور پر یہاں صرف ان پانچ گناہوں کو بیان کئے دیتے ہیں جن میں لوگ بکثرت منہمک ہیں اور جن سے زبان گویا نجاستوں کی خوگر ہو گئی ہے۔

۱۔ پہلی آفت جھوٹ بولنا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ آدمی جھوٹ بولتا

ہے یہاں تک کہ اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے (بخاری و مسلم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جھوٹ بولنا مسلمانوں کی شان نہیں اور ایمان اور جھوٹ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یاد رکھو کہ جھوٹ بولنے سے قلب میں کجی آجاتی ہے اور خواب بھی سچے نظر آتے ہیں' مذاق میں بھی دوسروں کے ہنسانے کو جھوٹ نہ بولو اور ہمیشہ جھوٹے خیالات اور خطرات سے قلب کو بچائے رکھو ورنہ قلب میں کجی پیدا ہو جائے گی اور تجربہ اس کا شاہد ہے کہ ایسے آدمیوں کو خواب بھی سچا نظر نہیں آتا۔ ایک مرتبہ کسی عورت نے اپنے صغیر سن بچے کو بلایا اور کہا کہ آؤ ہم تمہیں ایک چیز دیں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے دریافت فرمایا کہ اگر بلانے سے بچہ آگیا تو کیا چیز دے گی۔ عورت نے کہا چھوارے دے دوں گی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کچھ دینے کا ارادہ نہ ہوتا اور صرف بہلانے کے لئے ایسا لفظ نکلتا تو یہ بھی زبان کا جھوٹ شمار ہوتا (بخاری) البتہ ضرورت کے وقت جھوٹ بولنا بھی جائز ہے بشرطیکہ سچ بولنے سے کسی ایسے گناہ یا نقصان کا اندیشہ ہو جو جھوٹ کے گناہ و نقصان سے زیادہ ہو مثلاً دو مسلمانوں میں صلح کرا دینے یا جہاد میں دشمن کو دھوکہ دینے یا بیوی کو رضا مند اور خوش کرنے کے لئے جھوٹ بول دینے کی حدیث شریف میں اجازت آئی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں میں عداوت اور رنج رہنے سے جو برا نتیجہ پیدا ہو گا وہ جھوٹ کے نقصان سے بڑا ہو گا اسی طرح جنگ کے راز کا پوشیدہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ اگر دشمن کو اطلاع ہوئی اس کو حملے کا موقع ملے گا اور ہزاروں پاک جانیں تلف ہو جائیں گی اس لئے اصل بات کا ظاہر نہ کرنا اور جھوٹی بنا دینا افضل ہوا۔ اسی طرح خاوند کے بعض اسرار بیوی سے مخفی رہنے کے قابل ہیں۔ پس اگر راست گوئی کے سبب کوئی خیال اس پر ظاہر ہو گیا اور میاں بیوی میں نااتفاقی ہو گئی تو جو برا اثر پیدا ہو گا اس میں جھوٹ بولنے کی بہ نسبت زیادہ گناہ ہے۔ پس ایسی صورت میں جھوٹ بولنے کی اجازت ایسی ہے جیسے کوئی شخص دو بلاؤں میں مبتلا ہو جائے تو آسان اور ہلکی مصیبت کو ترجیح دے کر اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے کسی شخص کے بھوکا مرجانے

کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے مردار بھی حلال ہے۔ اسی طرح اپنا یا اپنے مسلمان بھائی کا مال ظالم کے ہاتھ سے بچانے کو یا کسی کی خفیہ رکھی ہوئی امانت کو محفوظ رکھنے کے لئے دوسروں کے سامنے انکار کر دینا اور جھوٹ بول دینا جائز ہے اور اپنی معصیت کا انکار کر دینا بھی اسی وجہ سے جائز ہے کہ فسق و فجور کا اعلان حرام ہے یا اپنی بیوی سے یہ کہہ دینا کہ میری دوسری بیوی (تمہاری سوت) مجھے تم سے زیادہ پیاری نہیں ہے یہ سب باتیں اسی بنا پر جائز ہیں کہ اس جھوٹ سے ایک ضرر دفع کیا گیا ہے۔ البتہ روپیہ کمانے یا عزت و جاہ حاصل کرنے کی غرض سے جھوٹ بولنا ہرگز حلال نہیں ہے کیونکہ اگر مال و جاہ نہ بڑھے تو کوئی نقصان نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ نفع سے نفع حاصل نہیں ہوتا اور نفع کا حاصل نہ ہونا نقصان نہیں کہلاتا ہے اس باریکی کو لوگ نہیں سمجھتے اور اکثر اس غرض کے لئے جھوٹ بولا کرتے ہیں حالانکہ یہ حرامِ قطعی ہے اور درحقیقت ان کے دین کی تباہی کا یہی سامان ہے کیونکہ ضرورت اور بے ضرورت میں تمیز نہیں کرتے۔ افسوس کی بات ہے کہ جاہلوں نے خیالی اور فرضی ضرورتوں کو بھی ضرورت سمجھ لیا ہے حالانکہ شرعی اور واقعی ضرورت جس کا نام ہے وہ اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جب تک حالتِ اضطرار اور کسی بڑے نقصان کا غالب گمان نہ ہو اس وقت تک مردار کا کھانا حلال نہیں ہے۔ ایسے ہی جھوٹ بولنا جو شرعاً حرام ہے وہ بھی جائز نہیں ہے اس شدید ضرورت کے موقع پر بھی حتی الامکان تعریض اور کنارہ ہی کرنا چاہئے کہ نفس کو جھوٹ بولنے کی عادت نہ ہو جائے حضرت شیخ ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ گھر کے اندر کسی ضروری کام میں مشغول ہوتے اور کوئی شخص ان کو باہر بلاتا تو خادمہ سے کہتے تھے یوں کہہ دے کہ مسجد میں ڈھونڈو اور حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ انگلی سے ایک دائرہ کھینچ کر خادمہ سے فرماتے کہ "اس دائرہ کے اندر انگلی رکھ کر کہہ دے کہ ایسا نہیں ہیں" اس تعریض سے اپنا مقصد بھی حاصل ہو جاتا تھا اور حقیقت میں جھوٹ بھی نہ ہوتا تھا البتہ صورت جھوٹ کی سی تھی اور یہی تعریض و توریہ کہلاتا ہے اس قسم کی تعریض معمولی غرض کے لئے بھی جائز ہیں جب کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو۔ ایک بڑھیا عورت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح کے طور پر یوں

فرما دیا کہ بڑھیا جنت میں کبھی نہ جائے گی یہ سن کر بڑھیا رونے لگی (ترمذی) کیونکہ جو مطلب ظاہری لفظوں سے سمجھ میں آتا تھا وہ یہی تھا کہ کوئی بڑھیا بھی جنتی نہیں ہے حالانکہ مراد یہ تھی کہ بڑھاپے کی حالت سے جنت میں نہ جائے گی بلکہ جو بڑھیا بھی جنت میں جائے گی وہ نوجوان بن کر جائے گی یا مثلاً ایک شخص نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری کے لئے اونٹ مانگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا ٹھہرو ہم تمہیں اونٹنی کا بچہ دیں گے۔ یہ سن کر سائل نے عرض کیا کہ بچہ لے کر کیا کروں گا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریض کا مطلب سمجھا دیا کہ بڑا اونٹ بھی تو آخر کسی اونٹ سے ہی پیدا ہوا ہے جس اونٹ سے پیدا ہوا اس کا تو بچہ ہی ہے یا مثلاً ایک شخص سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ میں سفیدی ہے اور ظاہر ہے کہ سب کی آنکھ میں سفیدی ہوتی ہے مگر چونکہ بظاہر یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ پتلی میں عیب اور سفیدی کا مرض ہوتا ہے اس لئے سننے والے کو فکر لاحق ہو کر اچھا خاصا مزاح ہو گیا اس قسم کی تعریضیں بیوی بچوں سے خوش طبعی کے طور پر جائز ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کھانا کھانے کی صلاح کرے اور تمہیں باوجود بھوک کے کھانا منظور نہ ہو تو یہ ہرگز نہ کہو کہ مجھے بھوک نہیں ہے کیونکہ جھوٹ ہوگا بلکہ تعریض کر لو مثلاً یوں کہہ دو کہ میں اس وقت نہ کھاؤں گا۔ آپ نوش فرمایئے وغیرہ۔

۲۔ دوسری آفت غیبت کرنا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے (غیبت کرنا متوفی مسلمان کا گوشت ہی کھانا ہے) پس اس سے لازمی پرہیز کرو۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ غیبت زنا سے بھی سخت تر ہے (ترمذی) رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ شبِ معراج میں میرا گزر ایسی جماعت پر ہوا جو اپنے منہ اپنے ناخن سے نوچ رہے تھے یہ لوگ غیبت کیا کرتے تھے (ابو داؤد) کسی مسلمان کے پیٹھ پیچھے اس کے متعلق کوئی واقعی بات ایسی ذکر کرنی کہ اگر وہ سنے تو اس کو ناگوار گزرے غیبت کہلاتی ہے مثلاً کسی کو بے وقوف یا کم عقل کہنا یا کسی کے حسب و نسب میں نقص نکالنا یا کسی کی کسی حرکت یا

مکان یا مویشی یا لباس غرض جس شئے سے بھی اس کو تعلق ہو اس کا کوئی عیب ایسا بیان کرنا جس کا سننا اسے ناگوار گزرے خواہ زبان سے ظاہر کی جائے یا رمز و کنایہ سے یا ہاتھ سے اور آنکھ کے اشارے سے یا نقل اتاری جائے' یہ سب غیبت میں داخل ہے' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک موقع پر کسی عورت کا ٹھگنا ہونا ہاتھ کے اشارے سے ظاہر کیا اور یوں عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ عورت جو اتنی سی ہے اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ (رضی اللہ عنہا)! تم نے اس کی غیبت کی ہے۔

سب میں بدترین وہ ہے جس کا رواج مقتدر اور دیندار لوگوں میں ہو رہا ہے کیونکہ وہ غیبتیں کرتے ہیں اور پھر خود کو نیک سمجھتے ہیں ان کی غیبتیں بھی نرالے انداز کی ہوتی ہیں مثلاً مجمع میں کہنے لگے کہ اللہ کا شکر ہے اس نے ہمیں امیروں کے دروازوں پر جانے سے بچا رکھا ہے ایسی بے حیائی سے اللہ پناہ میں رکھے اس کلمہ سے جو کچھ ان کا مقصود ہے وہ ظاہر ہے کہ امراء کے پاس بیٹھنے والے مولویوں پر طعن کرنا اور ان کو بے حیا کہنا منظور ہے اور ساتھ ہی اپنی صلاحیت تقویٰ جتا رہے اور ریا کاری کا گناہ کما رہے ہیں اسی طرح مثلاً کہنے لگے کہ فلاں شخص کی بڑی اچھی حالت ہے اگر اس میں حرص دنیا کا شائبہ نہ ہوتا جس میں ہم مولوی مبتلا ہو جاتے ہیں اس فقرہ سے بھی جو کچھ مقصود ہے وہ ذرا سا تامل میں سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کا بے صبرا ہونا ظاہر کرتے ہیں اور اپنی طرف حرص کی نسبت اس نیت سے کرتے ہیں کہ سننے والا ان کو متواضع سمجھے اور یہی غیبت کرتے ہیں اور خود کو غیبت سے محفوظ اور پارسا سمجھتے ہیں یا مثلاً بول اٹھے سبحان اللہ بڑے تعجب کی بات ہے اور جب اتنا کہنے پر لوگوں نے اس بات کے سننے کے شوق میں ان کی جانب کان لگائے تو کہنے لگے۔ کچھ نہیں فلاں شخص کا خیال آگیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اور اس کے حال پر رحم فرما دے اور توبہ کی توفیق دے۔ اس فقرہ کا بھی جو کچھ منشاء ہے وہ عقل مند پر مخفی نہیں ہے کیونکہ ان کا یہ کلمہ شفقت یا دعا کی نیت سے نہیں ہوتا جیسا کہ ظاہری الفاظ سے وہم پڑتا ہے اس لئے کہ اگر دعا کرنی مقصود ہوتی تو دل ہی دل میں کیوں نہ کر لیتے سبحان

اللہ کہہ کر لوگوں کو متوجہ کرنا اور معصیت کا اشارہ کرنا ہی کیا ضروری تھا؟ یا کسی شخص کا عیب ظاہر کرنا بھی کوئی شفقت یا خیر خواہی کی بات ہے؟ اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہے کہ غیبت سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی غیبت مت کیا کرو مگر دل ان کا غیبت کو مکروہ نہیں سمجھتا بلکہ اس نصیحت کرنے سے محض اپنی دینداری اور تقویٰ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اسی طرح کسی مجمع میں غیبت ہوتی ہے تو ناصح اور پارسا بن کر کہنے لگتے بھائی غیبت کرنا گناہ ہے اس سے ہم سننے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں یہ لوگ کہنے کو کہہ جاتے ہیں مگر دل ان کا مشتاق رہتا ہے کہ کاش یہ شخص ہماری نصیحت پر عمل نہ کرے جو کچھ کہہ رہا ہے کہے جائے اور ہمیں سنائے جائے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ غیبت سننے کا انتظار بھی ہے اور پھر یوں بھی سمجھتے ہو کہ ہم منع کر کے گناہ سے سبکدوش ہو گئے۔ یاد رکھو کہ جب تک غیبت کرنے اور سننے کو دل سے برا نہ سمجھو گے تو اس وقت تک غیبت کے گناہ سے ہرگز نہ بچو گے کیونکہ غیبت کرنے والا اور سننے والا دونوں برابر ہیں اور جس طرح زبان سے غیبت کرنا حرام ہے اسی طرح دل سے غیبت کرنا بھی حرام ہے۔ البتہ چند صورتوں میں خاص لوگوں کی غیبت کرنا جائز ہے جس کی تفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔

اول :۔ مظلوم شخص ظالم کی شکایت اگر افسر اعلیٰ تک پہنچائے اور خود پر سے ظلم رفع کرنے کی نیت سے اس کے مظالم بیان کرے تو گناہ نہیں ہے۔ البتہ ظالم کے عیوب کا ایسے لوگوں سے بیان کرنا جنہیں ان کو سزا دینے یا مظلوم کے اوپر سے ظلم رفع کرنے کی طاقت نہ ہو بدستور غیبت میں داخل اور حرام ہے۔ ایک بزرگ کی مجلس میں حجاج بن یوسف کا ذکر آگیا تھا تو انہوں نے یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انصاف کے دن مظلوموں کا بدلہ حجاج سے لے گا اور حجاج کا بدلہ اس کی غیبت کرنے والوں سے لے گا اس لئے کہ بہتیرے آدمی حجاج کے مظالم ایسے آدمیوں کے سامنے بیان کرتے ہیں جن کو حجاج کے کئے ہوئے ظلم رفع کرنے کی طاقت نہیں ہے تو ایسے لوگوں کے سامنے حجاج کی غیبت کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔

دوم :۔ کسی شخص سے کوئی بدعت یا خلافِ شرع امر کے رفع کرنے میں مدد لینی

ہو یا کسی کو اس کے فتنہ سے بچانا ہو تو اس سے بھی ان بدعتی لوگوں کا حال بیان کرنا اگرچہ ان کی غیبت کرنا ہے مگر جائز ہے۔

سوم :۔ مفتی سے فتویٰ لینے کے لئے استفتاء میں امر واقعی کا اظہار کرنا بھی جائز ہے۔ اگرچہ اس اظہارِ حال میں کسی کی غیبت ہوتی ہو' تو دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا خاوند ابو سفیان اتنا بخیل ہے کہ بقدر کفایت بھی مجھے خرچ نہیں دیتا (بخاری و مسلم) ظاہر ہے کہ یہ ابو سفیان کی شکایت اور غیبت تھی مگر چونکہ مفتی شریعت سے استفسار کیا جا رہا ہے کہ اس صورت میں میرے لئے شریعت کیا حکم دیتی ہے لہٰذا اس غیبت میں کچھ حرج نہیں مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس صورت میں بھی یہ غیبت اسی وقت جائز ہے کہ جب اس وقت اپنا یا کسی مسلمان کا فائدہ متصوّر ہو۔

چہارم :۔ اگر کوئی شخص کسی سے نکاح یا خرید و فروخت کا معاملہ کرتا ہے اور تمہیں علم ہو کہ اس معاملہ میں ناواقفیت کی وجہ سے اس کا نقصان ہے تو اس کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کا حال بیان کر دینا بھی جائز ہے۔ اسی طرح قاضی کی عدالت میں کسی گواہ کا کوئی عیب اس نیت سے ظاہر کرنا کہ صاحبِ حق کو اس مقدمہ میں میرے خاموش رہنے سے نقصان نہ پہنچے جائز ہے البتہ صرف اسی شخص سے ذکر کرنا جائز ہے جس کے نقصان کا اندیشہ ہو یا جس پر فیصلہ اور حکم کا مدار ہو۔

پنجم :۔ اگر کوئی شخص ایسے نام ہی سے مشہور ہو گیا ہو جس میں عیب ظاہر ہوتا ہے مثلاً عمش (چندھا) اعرج (لنگڑا) تو اس نام سے اس کا پتہ بتلانا غیبت میں داخل نہیں ہے۔ پھر بھی اگر دوسرا پتہ بتا دو تو بہتر ہے تاکہ غیبت کی صورت بھی پیدا نہ ہو۔

ششم :۔ اگر کسی شخص میں کوئی عیب ایسا کھلا ہوا پایا جاتا ہے کہ لوگ اس کا یہ عیب ظاہر کرتے ہیں تو اسے ناگوار نہیں گزرتا مثلاً مخنث یا ہیجڑا کہ ان کے اس فعل کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ان کو خیال بھی نہیں ہوتا تو یہ تذکرہ بھی غیبت سے خالی ہے البتہ اگر اس کو ناگوار گزرے تو حرام ہے کیونکہ فاسق کے بھی کسی ایسے گناہ کا

ذکر کرنا جو اس کو ناگوار گزرے بلاعذر خاص جائز نہیں ہے (بشرطیکہ کوئی کھلم کھلا گناہ نہ کرتا ہو)

نفس کو غیبت سے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ غیبت کی سزا اور نقصان میں غور کرو حدیث شریف میں آیا ہے کہ آگ جو خشک گھاس میں اثر کرتی ہے غیبت اس سے جلد اور زیادہ اثر مسلمانوں کی نیکیوں میں کرتی ہے یعنی غیبت کرنے سے نیک اعمال جل جاتے ہیں اب ذرا سوچو کہ جب کوئی نیکوکار شخص جس نے دنیا میں مشقتیں اٹھا اٹھا کر نیکیاں جمع کی تھیں جب قیامت کے دن نامہ اعمال کورے دیکھے گا اور اس کو معلوم ہوگا کہ غیبت کی وجہ سے اس کی نیکیاں اس شخص کے نامہ اعمال میں لکھ دی گئی ہیں' جس کی وہ غیبت کیا کرتا تھا تو کس قدر حسرت و افسوس کرے گا۔ مسلمان کو سوچنے کے لئے اپنے ہی نفس کے عیوب بتیرے ہیں اس لئے مناسب ہے کہ جب فرصت ملے تو اپنی حالت پر نظر ڈالو اور جو عیب پاؤ اس کے رفع کرنے میں مصروف ہو جاؤ کہ دوسروں کے عیوب دیکھنے کا موقع ہی نہ آئے اور یوں سمجھو کہ تمہارا ذرا سا عیب جتنا تمہیں نقصان پہنچائے گا دوسرے کا بڑا عیب بھی تمہیں اس قدر نقصان پہنچائے گا اور اگر تمہیں اپنا عیب نظر نہ آئے تو یہ خود ایسا عیب ہے جس کے برابر کوئی عیب نہیں کیونکہ کوئی انسان عیب سے خالی نہیں ہے (انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ) پس خود کو بے عیب سمجھنا تو بڑا سخت عیب ہے اس لئے اول اس کا علاج کرو اور اس کے بعد جو عیب نظر آتے جائیں ان کی تدبیر کرتے رہو اور اگر اتفاقاً" اس پر بھی کسی شخص کی غیبت ہو جائے تو اللہ تعالٰی سے توبہ جدا کرو اور اس شخص کے پاس جا کر غیبت کی خطا معاف کراؤ' اور اگر اس سے نہ مل سکو تو اس کے لئے دعائے مغفرت مانگو اور خیرات کر کے اس کی روح کو ایصالِ ثواب کرو الغرض چونکہ تم نے غیبت کر کے اپنے مسلمان بھائی پر ظلم کیا ہے اس لئے جس طرح ممکن ہو اس ظلم کی جلد تلافی کرو۔

۳۔ تیسری آفت :۔ فضول جھگڑا کرنا ہے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو مسلمان باوجود حق پر ہونے کے جھگڑے سے دست بردار ہو جائے تو

اس کے لئے اعلیٰ جنت میں محل تیار ہوگا (ترمذی' ابن ماجہ) یہ بالکل صحیح ہے کہ برسر حق ہو کر خاموش ہو بیٹھنا بہت دشوار ہے اور اسی لئے حق پر ہو کر جھگڑے سے علیحٰدہ ہو جانا ایمان کا کمال شمار کیا گیا ہے جان لو کہ کسی بات پر اعتراض کرنا اور اس کے لفظ یا معنی میں غلطی اور نقص نکالنا جھگڑا کہلاتا ہے اور اکثر یہ دو وجہ سے ہوتا ہے یعنی یا تو کبر کی بناء پر کہ اپنی بڑائی اور لسانی یا تیز زبانی کا اظہار مقصود ہوتا ہے یا دوسرے شخص کو چپ کرنے اور عاجز بنانے کا شوق ہو جاتا ہے اس لئے مسلمان کو چاہئے کہ جو بات واقعی اور حق ہو تو اس کو تسلیم کرے اور جتنی خلاف واقع یا غلط ہو تو اس پر سکوت اختیار کرلے البتہ اگر اس غلطی کے ظاہر کرنے میں کوئی دینی فائدہ ہو تو اس وقت سکوت کرنا جائز نہیں ہے مگر پھر بھی اس کا ضرور خال رکھے کہ جو کچھ بیان کرے وہ نرمی اور سہولت سے بیان کرے اور تکبر یا سختی کے ساتھ نہ کہے۔

۴۔ چوتھی آفت :۔ مذاق اور دل لگی کرنا اور زیادہ ہنسنا ہنسانا ہے اس سے قلب مردہ ہو جاتا ہے اور ہیبت و وقار جاتا رہتا ہے ایسا شخص لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے اور بسا اوقات دوسروں کو اس کے ساتھ کینہ و عداوت بھی پیدا ہو جاتی ہے نورِ معرفت میں تاریکی آجاتی ہے اور تحت الثریٰ میں پھینک دیا جاتا ہے البتہ تھوڑے مزاح میں کچھ مضائقہ نہیں خصوصاً" اگر بیوی بچوں کا دل خوش کرنے کے لئے ہو تو سنّت ہے کیونکہ ایسا مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول (بخاری' مسلم' ترمذی) ہے مگر وہ مزاح درحقیقت واقعی بات تھی کسی قسم کا جھوٹ نہ ہوتا تھا مثلاً ایک بڑھیا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنّت میں بڈھی عورت کوئی نہ جائے گی اس کا مطلب یہ تھا کہ جنت میں جو بھی عورت جائے گی وہ جوان ہو کر جائے گی یا مثلاً حضرت صہیب رضی اللہ عنہ لڑکے تھے اور انہوں نے لال پال رکھا تھا اتفاق سے لال مرگیا تو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہو جی ابو عمیر! تمہارا لال کیا ہوا" اسی طرح ایک مرتبہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ چھوہارا کھا رہے تھے اور ان کی ایک آنکھ دکھتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیوں صاحب آنکھ تو دکھتی ہے اور چوہارا کھا رہے ہو" انہوں نے مزاحاً" جواب دیا کہ یا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری طرف سے کھا رہا ہوں یعنی جس طرف کی آنکھ دکھتی ہے اس داڑھ سے نہیں کھاتا۔ ایک دفعہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ محض دل جوئی اور خوش طبعی کے طور پر دوڑے۔

۵۔ پانچویں آفت :۔ مدح یعنی تعریف کرنا پانچویں آفت ہے تم نے دیکھا ہو گا کہ اکثر واعظوں اور دنیا دار مسلمانوں کی عادت ہے کہ مالدار اور صاحب جاہ و حشم لوگوں کی تعریفیں کرتے' ان کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھتے اور ان کو نذرانے کے طور پر پیش کرتے ہیں حالانکہ اس میں چار خرابیاں تعریف کرنے والے یعنی مداح خواں کے حق میں ہیں اور دو خرابیاں ممدوح (یعنی جس کی تعریف کی جا رہی ہو) کے حق میں ہیں۔

تعریف کرنے والے کی خرابیاں یہ ہیں۔

(i) ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جو واقع کے خلاف ہوتی ہیں اور جن کا ممدوح میں نشان بھی نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ یہ صریح جھوٹ ہے جو کبیرہ گناہ ہے۔

(ii) محبت کا لمبا چوڑا اظہار کرتے ہیں حالانکہ دل میں خاک بھی محبت نہیں ہوتی اور یہ صریح ریا اور نفاق ہے جو گناہ و حرام ہے۔

(iii) اٹکل کے تیر چلائے جاتے ہیں اور جو بات یقینی طور پر معلوم نہیں' اندازے و گمان کی بناء پر ان کو واقعی ظاہر کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ آپ بڑے متقی ہیں نہایت منصف ہیں حالانکہ سرکارِ دوعالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ کسی کی مدح (تعریف) کرنی ہو تو یوں کہا کرے کہ میرا گمان یہ ہے کہ آپ ایسے ہیں کیونکہ ظنی (خیالی) باتوں کو واقعی بنانا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔

(iv) اگر ظالم اور فاسق کی مدح کی جاتی ہے اور وہ اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے تو فاسق کو خوش کرنے والا مدح خواں بھی فاسق اور نافرمان ہوا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ فاسق کی تعریف سے اللہ تعالیٰ کا عرش کانپ اٹھتا ہے (ابن ابی الدنیا) حضرت حسن رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فاسق کی زندگی و عمر کی زیادتی کی دعا کرنے

والا شخص بھی فاسق ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ فسق و فجور قائم اور دنیا میں مدت تک باقی رہے۔ ظالم اور فاسق شخص کی تو مذمّت کرنی چاہئے تاکہ گھبرا کر ظلم و معصیت چھوڑ دے نہ کہ تعریف۔ جس کی تعریف بیان کی جا رہی ہو یعنی ممدوح کو جو دو نقصان پہنچتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(i) یہ کہ مدوح مغرور ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو قابلِ تعریف سمجھنے لگتا ہے حالانکہ یہ اس کی ہلاکت و تباہی کی جڑ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مجمع میں اپنے دوست کی تعریف کی تو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے نفس میں خود پسندی اور بڑائی پیدا کر کے اس کو ہلاک کر دیا۔ (بخاری و مسلم)

(ii) اپنی تعریف سن کر پھولتا اور اعمالِ خیر میں سست پڑ جاتا ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ مسلمان بھائی کو کند چھری سے ذبح کر دینا اس سے بہتر ہے کہ اس کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے کیونکہ قتل سے تو دنیا ہی کی زندگی سلف ہو گی اور ان برے نتیجوں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے آخرت کی باعظمت زندگی برباد ہو جائے گی البتہ ان مضرتوں کا اندیشہ نہ ہو تو تعریف میں کچھ حرج بھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات مستحب اور باعثِ اجر ہے۔ چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ رضوان اللہ اجمعین کی مدح فرمائی ہے مثلاً آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے کہ تمام دنیا کے ایمان کو ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے ایمان کے ساتھ وزن کیا جائے تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کا ایمان وزنی رہے گا۔ (انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کیونکہ ہر نبی کا ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اور اولیاء کرام رحمہم اللہ اجمعین سے زیادہ وزنی ہے) نیز فرماتے ہیں کہ اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اگر میں نبی بنا کر نہ بھیجا جاتا تو ضرور تمہیں نبی بنایا جاتا۔ گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں نبوت و رسالت کی قابلیت کا انہیں سے اظہار فرمایا۔ پس چونکہ صحابہ رضوان اللہ اجمعین میں خود پسندی اور کوتاہئ عمل کا اندیشہ نہ تھا۔ اس لئے ان میں نشاط پیدا کرنے کے لئے یہ مدح مستحب تھی کہ ان کی طاعات میں ترقی کا وسیلہ تھا۔

مدح سے بچنے کی تدبیر:۔

اگر کسی شخص کی کوئی تعریف کرے تو اس کو چاہئے کہ اپنے اعمال اور خطرات و وساوس کا دھیان کرے اور سوچے کہ اللہ جانے خاتمہ کس حالت پر ہونا ہے واقعی یہ خوبیاں جو یہ شخص بیان کر رہا ہے اگر مجھ میں موجود بھی ہیں تو بھی ان کا کیا اعتبار نیز اپنی باطنی بیماریوں اور عیوب پر نظر کرے اور خیال کرے کہ یہ پوشیدہ عیب ایسے ہیں کہ اگر اس مداح کو معلوم ہو جائیں تو میری مدح کبھی نہ کرے غرض مسلمان کو چاہئے کہ اپنی تعریف سن کر خوش نہ ہو بلکہ اس کو دل سے مکروہ سمجھے۔ اسی کی جانب غم خوارِ اُمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ تعریف کرنے والے کے منہ میں مٹی بھر دو (مسلم) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جب تعریف ہوتی تو یوں دعا فرماتے کہ یا الٰہی! میرے جو گناہ انہیں معلوم نہیں وہ بخش دے اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس کا مجھ سے مواخذہ نہ کر اور مجھے ان کے گمانوں سے بہتر بنا دے میں جیسا ہوں تو ہی خوب جانتا ہے یہ نہیں جانتے۔

(۳) غصّہ

غصّہ کا توڑ بہت ضروری ہے کیونکہ یہ آگ کا شعلہ ہے سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ کسی شخص کے پچھاڑنے سے آدمی پہلوان نہیں ہوتا بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصّہ کے وقت اپنے نفس کو پچھاڑے۔ (طبرانی)

خوب جان لو کہ جس طرح تلخ ایلوے سے شہد بگڑ جاتا ہے اسی طرح غصّہ سے ایمان بگڑ جاتا ہے۔ غصّہ بُری بلا ہے یہی مار پیٹ گالی گلوچ اور زبان درازی جیسے کھلے گناہ سرزد کرواتا ہے اور اسی سے کینہ' حسد' بدگمانی' راز ظاہر کرنا' دوسروں کو رسوا کرنے کے بدترین گناہ ہوتے ہیں۔ غصّہ کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنے مسلمان بھائی کا خوش کرنا ناگوار گزرتا ہے اور اس کا رنج و تکلیف میں رہنا پسند آتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب تباہ کن گناہ ہیں۔

غصّہ کا علاج:۔

(i) اول تو ریاضت اور مجاہدہ سے اس کو توڑنا چاہئے مگر توڑنے سے مقصود یہ نہیں ہے کہ غصّہ کا مادہ ہی نہ رہے اس لئے کہ اگر مادہ ہی جاتا رہے گا تو کفار سے جنگ اور جہاد کیوں کر ہو گا اور فساق و فجار اور مبتدعین کی خلاف شرع باتوں پر ناگواری کس طرح ہو گی' ناجائز افعال دیکھ کر غصّہ آنا تو ضروری اور شرع کا عین مقصود ہے لہٰذا غصّہ کے توڑنے اور ریاضت کرنے سے یہ مراد ہے کہ اس کو مہذّب اور عقل و شرع کا تابعدار بنا لیا جائے اور ایسا کر دیا جائے جیسا کہ شکاری کتّا ہوتا ہے کہ جب اس کا مالک اس کو بھگاتا ہے تو وہ بھاگتا ہے اور جب وہ کسی پر حملہ کراتا ہے تو حملہ کرتا ہے ورنہ چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے یہی حالت غصّہ کی ہونی چاہئے اگر شریعت حکم دے اور غصّہ کو بھڑکائے تو فوراً بھڑک اٹھے اور اپنا کام کرے ورنہ چپ رہے اور بے حس و حرکت پڑا رہے غصّہ کو ایسا مہذب بنانے کی تدبیریں یہ ہیں کہ نفس کی باگ روکو' حلم و برداشت کی عادت ڈالو اور جب کوئی غصّہ پیدا کرنے والا

واقعہ پیش آئے تو نفس پر جبر کیا کرو اور غصہ کو بھڑکنے نہ دو پس یہی وہ ریاضت ہے جس سے غصہ مطیع و فرماں بردار بن جائے گا۔

(ii) غصہ کے جوش کے وقت ضبط سے کام لو اور اس کو پی جاؤ اس کا ایک علاج علمی ہے اور دوسرا عملی

علمی علاج تو یہ ہے کہ غصہ کے وقت سوچو کہ غصہ کیوں آتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا سبب حکم ربی میں دخیل ہونا اور دست اندازی کرنا ہے کیونکہ غصہ کرنے والے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام میری مرضی کے موافق کیوں نہ ہوا اب تم ہی بتاؤ کہ یہ حماقت ہے یا نہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو اپنے ارادہ اور منشا کا تابع بنانا چاہتے ہو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ذرہ نہیں ہل سکتا پھر تم اس میں دخل دینے والے اور اس کو ناگوار سمجھنے والے کون ہوتے ہو؟

دوسرے اس بات کا خیال رکھو کہ میرا اس شخص پر کیا حق ہے اور اللہ عزّوجلّ کا مجھ پر کیا حق ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کا تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہے اور تم اس شخص کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہتے ہو ظاہر ہے کہ تم جس شخص پر غصہ کر رہے ہو اس کے مالک نہیں ہو' خالق نہیں ہو' رزق تم اس کو نہیں دیتے' حیات تمہاری دی ہوئی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے تم پر ہر قسم کے حقوق ہیں کہ تم ہر طرح سے اس کے محکوم و مملوک ہو اور احسان مند ہو۔ بایں ہمہ تم اپنے مالک حقیقی کی بیسیوں خطائیں اور نافرمانیاں رات دن کرتے رہو اور باوجود اس احسان و استحقاق کے وہ سب کو برداشت کرتا ہے اگر ایک قصور پر بھی سزا دے تو کہیں تمہارا ٹھکانہ نہ رہے اور تمہارا حالانکہ کسی پر بھی حق نہیں ہے پھر یہ حالت ہے کہ ذرا سی خلافِ طبع حرکت پر غصہ سے باہر ہوئے جاتے ہو اور اس کو دنیا سے ناپید کر دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہو۔ کیا تمہاری اطاعت و رضا مندی اللہ تعالیٰ کی عبادت و حکم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

عملی علاج یہ ہے کہ جب غصہ آئے تو **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** پڑھو کیونکہ غصہ شیطانی اثر ہے اور شیطان سے جب پناہ مانگی جائے گی تو وہ اثر زائل ہو

جائے گا نیز اپنی حالت بدل دو یعنی اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ اور بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ اور اگر اس سے بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہو تو وضو کر لو اور اپنا رخسار زمین پر رکھ دو تاکہ تکبّر ٹوٹے اور عزّت والا عضو جب زمین پر رکھا جائے تو نفس مرے کیونکہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ اللہ (عزّوجلّ) کے نزدیک سب سے بہتر گھونٹ جو مسلمان پیتا ہے وہ غصہ کا گھونٹ ہے۔ (ابو داؤد)

سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ جس مسلمان کو اپنے بیوی بچوں یا ایسے لوگوں پر غصہ آئے جن پر اپنا غصہ جاری کر سکتا اور سزا دے سکتا ہے اور وہ اس کو ضبط کر جائے اور تحمل سے کام لے تو اللہ تعالیٰ اس کا قلب امن اور ایمان سے لبریز فرما دے گا۔ (ابن ابی الدنیا، ابو داؤد) یاد رکھو کہ تحمل کی بدولت مسلمان شب بیداری، روزہ دار، عابد و زاہد کا مرتبہ پا لیتا ہے۔

(۴) حسد

حسد کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو عیش و آرام میں دیکھ کر دل میں جلنا اور اس کی نعمت کے جاتے رہنے کو پسند کرنا۔ حسد کرنا حرام ہے چنانچہ (حضرت زکریا علیہ السلام کا قول ہے کہ) اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ میرے بندے ر نعمت دیکھ کر حسد کرنے والا گویا میری اس تقسیم سے ناراض ہے جو میں نے اپنے بندوں میں فرمائی ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح جلا دیتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑیوں کو جلا دیتی ہے (ابن ماجہ) البتہ ایسے شخص پر حسد کرنا جائز ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو ظلم یا گناہوں میں خرچ کر رہا ہو مثلاً مالدار شراب خوری اور زنا کاری میں اڑا رہا ہو' لہٰذا ایسے شخص سے مال چھن جانے کی آرزو کرنا گناہ نہیں ہے کیونکہ یہاں درحقیقت مال کی نعمت چھن جانے کی تمنا نہیں ہے بلکہ اس فحش گناہوں کے سلسلہ کے بند ہو جانے کی آرزو ہے اور اس کی شناخت یہ ہے کہ اگر مثلاً وہ شخص اس گناہ کو چھوڑ دے تو اب اس نعمت کے جاتے رہنے کی آرزو بھی نہ رہے یاد رکھو کہ عموماً" حسد کا باعث یا تو غرور و تکبّر ہوتا ہے یا پھر عداوت و خباثتِ نفس کہ بلا وجہ اللہ عزّوجلّ کی نعمت میں بخل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جس طرح میں کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ اسی طرح اللہ عزّوجلّ بھی دوسرے کو کچھ نہ دے' البتہ دوسرے کو نعمت میں دیکھ کر حرص کرنا اور چاہنا کہ اس کے پاس بھی یہ نعمت رہے اور مجھے بھی ایسی ہی حاصل ہو جائے غبطہ کہلاتا ہے اور غبطہ شرعاً" جائز ہے کیونکہ غبطہ میں کسی کی نعمت کا ازالہ مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس جیسی نعمت کے لئے اپنے آپ کو حاصل ہو جانے کی تمنا ہوتی ہے اور اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

حسد کا علاج :۔

حسد دل کی امراض میں سے ایک مرض ہے اس کا علاج ایک علمی ہے اور

دوسرا عملی۔

علمی علاج تو یہ ہے حاسد کو جاننا چاہئے کہ اس کا حسد اسی کو نقصان پہنچا رہا ہے اس محسود کا جس پر حسد کر رہا ہے کچھ بھی نہیں بگڑتا بلکہ اس کا تو اور نفع ہے کہ حاسد کی نیکیاں مفت میں اس کے ہاتھ آرہی ہیں برخلاف حاسد کے کہ اس کے دین کا بھی نقصان ہے اور دنیا کا بھی۔ دین کا نقصان تو یہ ہے کہ اس کے کئے ہوئے نیک اعمال ضبط ہو جاتے ہیں نیکیاں چلی جاتی ہیں اور اللہ عزّوجلّ کے غصے کا نشانہ بنا ہوتا ہے کیونکہ اللہ عزّوجلّ کے وسیع خزانہ کی بے شمار نعمتوں میں بخل کرتا ہے اور دوسرے پر انعام کے رکنے کی خواہش رکھتا ہے۔

دنیا کا نقصان یہ ہے کہ حاسد ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا اور اسی فکر میں گھلتا رہتا ہے کہ کسی طرح فلاں شخص کو ذلت و افلاس نصیب ہو پس جس پر حسد ہے اس کے لئے بھی خوشی کا مقام ہے کہ مجھے رنج پہنچانا چاہتے تھے اور خود ہر وقت کے رنج میں گرفتار ہو گئے لہٰذا اس کے حسد سے اس کی تو مراد پوری ہو گئی اور حسد کرنے والا بڑے خسارہ میں رہا۔ تم ہی سوچو کہ تمہارے حسد کرنے سے محسود کو کیا نقصان ہوا' ظاہر ہے کہ اس کی نعمت میں کسی قسم کی بھی کمی نہیں آئی بلکہ اور نفع ہوا کہ تمہاری نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں درج ہو گئیں' کیسا الٹا قصہ ہوا حاسد چاہتا تو یہ تھا کہ محسود دنیا میں تنگ دست ہو جائے اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی نعمتیں بحال رہیں اور دین کی نعمت نفع میں ملی اور حاسد نے عذابِ آخرت بھی سر رکھا اور اپنی قناعت و آرام کی زندگی کو رخصت کر کے ہر وقت کی خلش اور دنیوی کوفت خریدی یہ تو ایسی صورت ہو گئی کہ دشمن کے ڈھیلا مارنا چاہتا تھا اور وہ اپنے ہی آلگا کہ جس سے اپنی آنکھ پھوٹ گئی اور طرہ یہ کہ دشمن یعنی شیطان کو بھی ہنسنے کا موقع مل گیا۔ خصوصاً" اگر کسی عالم یا متقی پر حسد کیا جائے کہ اس کا علم و تقویٰ زائل ہونے کی تمنا ہو تو یہ حسد سب سے زیادہ برا اور بدتر ہے۔

عملی علاج حسد کا یہ ہے کہ حسد کا مقصود تو یہ ہے کہ تم محسود کی عیب جوئی کرو اور رنج و غم کے گھونٹ رات دن پیو لہٰذا تم نفس پر جبر کرو اور قصداً" اس کے منشاء

کی مخالفت کر کے اس کی ضد پر عمل کرو یعنی محسود کی تعریفیں بیان کرو اور ان کے سامنے تواضع اور اس نعمت پر خوشی و مسرت کا اظہار کرو جو اسے مرحمت ہوئی ہے جب چند روز بہ تکلف ایسا کرو گے تو محسود کے ساتھ تمہیں محبت پیدا ہو جائے گی اور جب عداوت جاتی رہے گی تو حسد بھی نہ رہے گا اور اس رنج و غم سے تمہیں نجات مل جائے گی جس پر حسد کی وجہ سے تم مبتلا رہے تھے۔

حسد کے بارے میں ضروری ہدایات :۔

شاید تمہیں یہ شبہ لاحق ہو کہ دوست میں اور دشمن میں فرق ہونا تو انسان کا طبعی امر ہے اور اپنی اختیاری بات نہیں کہ جس طرح اپنے دوست کو راحت میں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اسی طرح دشمن کو بھی راحت میں دیکھ کر مسرت ہوا کرے اور جب اختیاری بات نہیں ہے تو انسان اس کا مکلّف بھی نہیں ہو سکتا لہٰذا میں کہتا ہوں کہ بے شک اتنی بات صحیح ہے اور اگر اسی حد تک بات رہے تو گناہ بھی نہیں لیکن اس کے ساتھ جتنی بات اختیار ہے اس سے بچنے کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور وہ دو امر ہیں ایک یہ کہ یہ اپنی زبان اور اعضاء اور افعال اختیاریہ میں حسد کا اثر مطلق نہ ہونے دو۔ بلکہ نفس پر جبر کر کے اس کی ضد پر عمل کرو جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ دوم یہ کہ نفس میں جو حسد کا مادہ موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بندوں پر دیکھنی پسند نہیں کرتا اس کو دل سے مکروہ سمجھو اور یہ خیال کرو کہ یہ خواہش دین کو برباد کر دینے والی ہے ان دو باتوں کے بعد اگر طبعی امر باقی رہے یعنی دل بے اختیار چاہے کہ دوست خوش حال رہیں اور دشمن پامال ہوں تو اب اس کا خیال نہ کرو کیونکہ جب اس کے ازالہ پر تمہیں قدرت حاصل ہو جائے تو اپنی طبیعت سے تمہاری خواہش یہی ہو کہ کاش اس کی نعمت چھن جائے مگر اپنے ہاتھ پاؤں سے ایسا انتظام نہ کرو یا مثلاً محسود کی نعمت کے قائم رہنے یا بڑھانے میں مدد دے سکتے ہو تو باوجود اس کے ناگوار گزرنے کے اس کو مدد دو' اگر ایسی حالت ہو جائے تو سمجھ لو کہ جہاں تک اختیار اور قابو ہے۔ یہاں تک ہم نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کر لیا ہے اور سبکدوش ہو گئے ایسی صورت میں طبعی بات کا دور کرنا اپنے قبضہ میں نہیں ہے

اور موجود تو ہے مگر چونکہ اختیاری کاموں نے اس کو چھپا اور دبا لیا ہے اس لئے گویا معدوم ہو گئی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ جن کی نظر عالم دنیا سے اٹھ جاتی ہے تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ دنیا بھی ناپائیدار ہے اور اس کی تمام نعمتیں بھی فنا ہونے والی ہیں پس اگر اپنا دشمن فراخی یا وسعت و آرام میں ہے تو کتنے دن کے لئے اگر اعمال کے سبب مرنے کے بعد دوزخ میں جانے والا ہے تو اس کم نصیب کو اس چند روزہ آرام سے کیا نفع، اگر جنتی ہے تو جنت کی نعمتوں کو اس ناپائیدار نعمت سے کیا مناسبت۔ پس حسد کرنا اور دشمن کو دنیا کی کسی خوشی میں دیکھ کر جلنا بہرحال محض بے سود اور عبث ہوا۔ ساری مخلوق اللہ عزّوجلّ کی پیدا کی ہوئی ہے اور سارے آدمی اپنے پیارے رب کے غلام ہیں پس محبوب کی طرف سے جو انعامات ہوں ان کے اثرات ان کے غلاموں پر بھی ظاہر ہی ہونے چاہئیں لہٰذا جس کسی پر بھی تمہارے قدرت والے محبوب کی عطاؤں کے آثار ظاہر ہوں تمہارے لئے خوش ہونے کا مقام ہے نہ کہ رنج اور حسد کرنے کا۔

(۵) بخل

بخل مہلک ترین امراض میں سے ایک مرض ہے۔ اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے "اور جو بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دی ہرگز اسے اپنے لئے اچھا نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے لئے برا ہے عنقریب وہ جس میں بخل کیا تھا قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق ہو گا"

اور نبیٔ مکرم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خود کو بچاؤ بخل سے کہ اس نے پہلی امتوں کو ہلاک کر دیا ہے (ابوداؤد، نسائی) پس مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ بخل کرے اور جہنم میں جائے اور چونکہ بخل مال کی محبت ہے اور دل کو دنیا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے جس سے اللہ عزّوجلّ کی محبت کمزور ہو جاتی ہے اور بخیل مرتے وقت حسرت بھری نظروں سے اپنا جمع کیا ہوا محبوب مال دیکھتا اور جبرا" قہرا" آخرت کا سفر کرتا ہے اس لئے اس کو خالق جلّ جلالہ کی ملاقات محبوب نہیں ہوتی اور حدیثِ مبارکہ میں آیا ہے کہ جو شخص مرتے وقت اللہ تعالیٰ کی ملاقات پسند نہ کرے وہ جہنمی ہے جس شخص کے پاس مال نہ ہو وہ بخیل تو نہیں ہے مگر یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے قلب میں مال کی محبت ہو اور اس آرزو میں ہو کہ کاش مال دار ہو جائے اس طرح بعض اہلِ ثروت سخی ہوتے ہیں مگر چونکہ سخاوت ان کو محض اپنی شہرت اور مدح مقصود ہوتی ہے اس لئے اس پر اگرچہ بخل کی تعریف صادق نہیں آتی مگر حبِّ مال کا مضمون ضرور صادق آتا ہے پس بخل کے علاج کے ساتھ حُبِّ مال کا بھی علاج ہونا چاہئے۔ یاد رکھو کہ مال کی محبت اللہ عزّ و جلّ کے ذکر سے غافل کر دیتی ہے یہ مال مسلمانوں کے لئے فتنہ ہے۔ شافعِ روزِ شمار سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب انسان مرتا ہے تو فرشتے پوچھتے ہیں کہ کیا چھوڑا؟ پس اگر زندگی میں مال خرچ کر کے آخرت کا کچھ ذخیرہ جمع کر لیا تھا تو مرتے وقت خوش ہو گا کہ بھیجا ہوا مال وصول کرنے کا وقت آگیا ورنہ رنجیدہ ہو گا اور اس پر مرنا بہت شق گزرے گا (ترمذی) حدیث مبارکہ کا مضمون ہے کہ مال انسان کو تباہ و برباد کر دیتا ہے

ایسا کہ اگر اس کے کانٹا بھی چبھے تو نکالنے والا نہ ملے۔ اب تم ہی سوچو کہ جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے سخت کلمات فرمائے ہوں اس کا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟

کیا مال مذموم شئے ہے؟

مال مطلقاً مذموم نہیں ہے اور مذموم کیسے ہو سکتا ہے جبکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے کہ ساری مخلوق جسم کے گھوڑے پر سوار ہو کر سفرِ آخرت طے کر رہی ہے اور سواری کو اس مسافر خانہ دنیا میں گھاس دانہ کی ضرورت ہے اور وہ مال کے بغیر نہیں مل سکتا کیونکہ جب تک پیٹ نہ بھرے اس وقت تک عبادت نہیں ہو سکتی' لہٰذا قوت و حیات قائم رکھنے کی مقدار کے موافق حاصل کرنا ضروری ہوا۔ البتہ اس سے زیادہ مال و متاع ہلاکت کا سامان ہے کیونکہ مسافر بقدرِ ضرورت ہی توشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے اور جہاں بوجھ زیادہ ہوا تو اس کا سفر کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ "اے عائشہ (رضی اللہ عنہا) مجھ سے ملنا چاہو تو اتنی ہی دنیا پر قناعت کرو جتنا مسافر کا توشہ ہوتا ہے کہ جب تک پیوند نہ لگ جایا کرے اس وقت تک کرتہ نہ اتارا کرو۔ الٰہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلقین کی معاش بقدرِ کفایت ہی رکھنا اور زیادہ نہ دینا ورنہ ہلاک ہو جائیں گے"۔ یاد رکھو کہ ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنا تین وجہ سے مضر ہے۔

(i) مال کی وجہ سے گناہوں پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور قدرت کے ہوتے ہوئے صبر کرنا اور گناہ سے بچنا بہت دشوار ہے اور جب ضرورت سے زائد مال ہی نہ ہو گا تو ظاہر ہے کہ گناہ پورا نہ ہو سکے گا۔

(ii) اگر متمول شخص عابد زاہد بھی ہو اور مباح لذتوں میں پیسہ خرچ کیا تب بھی اتنا نقصان اسے ضرور پہنچا کہ اس کے جسم نے چونکہ لذیذ نعمتوں سے پرورش پائی اس لئے لذتوں کا خوگر ہو گیا اور مال کو چونکہ پائیداری نہیں ہے اس لئے اپنی عادتوں کے نباہنے کو مخلوق کا محتاج بنا رہے گا۔ اور کیا عجب ہے کہ ظالموں اور فاسقوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا یا ان کی چاپلوسی کرنی پڑے تاکہ جن لذتوں کا عادی ہو گیا ہے وہ

مرتے دم تک حاصل ہوتی رہیں اور جب یہ ہوا تو اب نفاق' جھوٹ' ریا' عداوت' بغض اور حسد سب ہی ظاہر ہوں گے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے اور جب ضرورت سے زیادہ پیسہ میسر ہی نہ ہو تو مباح چیزوں کا مزہ بھی منہ کو لگنے لگے گا (بیہقی)

(iii) اللہ عزّوجلّ کے ذکر سے غفلت ہو جائے گی کیونکہ کاشت کاروں' محرروں اور ملازموں کی نگرانی اور شریکوں سے حساب کتاب کرنے اور ترقی کے اسباب فراہم کرنے کی تدبیروں میں ایسی مشغولی ہو گی کہ اصل سعادت یعنی ذکرِ الٰہی کا وقت ہی نہ مل سکے گا۔ اول روپیہ کی تحصیل اور وصول یابی پھر اس کی حفاظت و نگہبانی اور پھر اس کا نکالنا اور کسی کام میں لگانا یہ سب دھندے قلب کو سیاہ کرنے والے ہیں جس سے نُورِ بصیرت جاتا رہتا ہے اور جب ضرورت سے زیادہ مال ہی نہ ہو گا تو یہ تفکرات و مخمصات بھی پیش نہ آئیں گے۔

ضرورت اور کفایت کی حقیقت :۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ ضرورت کس چیز کا نام ہے اور بقدرِ کفایت کس قدر مال کو کہتے ہیں کیونکہ یوں تو ہر شخص کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو جائے یہاں تک کہ اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی مل جاتی ہے تب بھی یہی سمجھتا ہے کہ میری ضرورتوں کو کافی نہیں ہے۔ اس لئے جاننا چاہئے کہ فرضی ضرورتوں کا اعتبار نہیں ہے اور واقعی ضرورت انسان کو صرف پیٹ بھرنے' بدن ڈھکنے کی ہے پس اگر زینت و تجمل کا خیال نہ ہو تو سال بھر کے جاڑے گرمی کے لئے دو دینار کافی ہیں جن میں موٹے کپڑے سے جو گرمی و سردی رفع کر سکیں باآسانی تیار ہو سکتے ہیں اور کھانے میں شکم سیری اور چٹورا پن اگر چھوڑا دیا جائے تو ایک مد روزانہ کے حساب سے سال بھر میں پانچ سو مد اناج اور کبھی کبھی معمولی دال ترکاری کے لئے ارزانی کے موسم میں تخمیناً" تین دینار کافی ہیں اب حساب لگاؤ کہ کتنے نفر کا نفقہ تمہارے ذمہ ہے پس محنت مزدوری سے اس مقدار کے موافق اپنا اور اپنے بال بچوں کا نفقہ روزانہ حاصل کرو اور خرچ کر ڈالو باقی سارا وقت اللہ عزّوجلّ کی یاد میں خرچ کرو اور اگر اس سے زیادہ کماؤ گے

اور جمع کرو گے تو دنیا دار اور مال دار سمجھے جاؤ گے اور اگر کوئی زمین جائیداد جس کی سالانہ آمدنی مذکورہ مقدار کے موافق ہو جلئے اس نیت سے خرید لو کہ روزانہ کسب اور محنت ضروری سے سبکدوش ہو کر اطمینان کے ساتھ ساتھ اللہ اللہ کر سکو گے تو فی زمانہ اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ جائیداد کا خریدنا اور زمین و مٹی میں روپیہ لگانا اس وقت ناجائز ہے جب کہ دنیا طلبی کے لئے ہو کہ عزّت و جاہ میں ترقی یا زمیندار بننے کی دل میں خواہش ہو اور مذکورہ صورت میں چونکہ دین ہی کا حاصل کرنا مقصود ہے اس لئے یہ اس ممانعت سے خارج ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے (مضمون احمد و ترمذی) اس کے ساتھ ہی اس کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے کہ طبائع اور ہمتیں مختلف ہوتی ہیں ممکن ہے کہ بعض لوگ قدرِ کفایت پر قناعت نہ کر سکیں لہٰذا ان کے لئے اس سے دو چند کی بھی اجازت ہے کیونکہ دین میں تنگی نہیں ہے البتہ اس زیادتی میں نیت یہی ہونی چاہئے کہ چونکہ تخفیف میں مشقت پیش آتی ہے اور عبادت میں اطمینان نہیں ہوتا اس لئے ہمیں باطمینان قلب یادِ الٰہی میں مشغول رہنے کے لئے زائد خرچ کی ضرورت ہے نہ کہ تلذذ اور تنعم کے لئے بس اس سے زیادہ جو کوئی جمع کر کے رکھے وہ دنیا دار ہے اور اس کو مال کی محبت ہے جو اس کا دین برباد کرنے والی ہے۔ یاد رکھو کہ مال جمع کرنے والوں کی غرض مختلف ہوتی ہے یا تو یہ کہ مزے آئیں گے یا لذتیں پائیں گے یا یہ کہ موقع اور وقت پر آئندہ صدقات و خیرات کریں گے اور زیادہ دور اندیشی اور اس مصلحت کے لئے جوڑ کر رکھتے ہیں کہ اگر کوئی وقت افلاس آگیا یا محنت مزدوری نہ ہو سکی یا فاقہ کشی کی نوبت آئی تو یہ پسماندہ پونجی کام آئے گی حالانکہ یہ تینوں نیتیں درست نہیں ہیں کیونکہ تلذذ اور تنعم تو اللہ عزّوجلّ سے غافل بنانے والی ہے اور خیرات کی نیت سے مال جمع کرنے کی بہ نسبت تو بہتر یہ ہے کہ مال ہی پاس نہ ہو اب رہا آئندہ کے لئے مال جمع کرنا جس کا نام دور اندیشی ہے سو وہ تو کوئی چیز ہی نہیں کیونکہ اگر تقدیر میں فاقہ کشی اور مصیبت لکھی ہے تو وہ اس مال کی بدولت ٹل نہیں سکتی اور جس طرح آفت ناگہانی کی طرف سے اطمینان نہیں اسی طرح اس بات سے بھی ناامیدی نہیں

ہے کہ اللہ عزّوجلّ ایسی جگہ سے رزق پہنچائے جہاں گمان بھی نہ جاتا ہو اور بھلا اس بدگمانی کا موقع ہی کیا ہے کہ شاید کسی وقت میں اللہ عزّوجلّ رزق بند کر لے اور فاقہ کرائے غلام کو اپنے آقا کے ساتھ تو نیک گمان رکھنا چاہئے نہ کہ گمان بد' اس کے علاوہ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اس کی ہوس کرنا کہ تمام عمر مالدار یا تندرست ہی رہیں اور کسی وقت بھی کسی قسم کی مصیبت یا رنج ہمیں نہ پہنچے اچھی بات نہیں ہے۔ فراخ دستی و آرام کی زندگی کو بہتر خیال کر لینا عقل مندوں کا کام نہیں ہے اس لئے کہ مصیبتوں اور پریشانیوں کی بدولت بندوں کو بڑے بڑے درجے ملتے ہیں۔ اسی سے دل کی صفائی ہوتی ہے اسی سے گناہ معاف اور وہ فائدے حاصل ہوتے ہیں جن کا حاصل ہونا آسان نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ پریشانیاں انبیاء علیہم السلام پر آئیں کہ جس کے ساتھ جتنی مناسبت ہوئی اسی نسبت سے اس کو پریشانیاں اور مصیبتیں بھی اٹھانی پڑیں یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ بڑی حکمت والا ہے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں سے خوب واقف ہے پس تمہیں جس حال میں بھی رکھے گا تمہارے لئے اسی میں بھلائی ہوگی لہٰذا اپنی طرف سے راحت کو اپنے لئے انتخاب کرنا اور اس ہوس میں آنے والی مصیبت کے لئے ذخیرہ جمع کرنا گویا اپنا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا اور اپنے انتخاب کو انتخابِ الٰہی پر ترجیح دینا ہے جو سراسر غلط ہے علاوہ ازیں یہ بھی قابل غور ہے کہ قبل از مرگ واویلا کرنے سے فائدہ کیا اور آئندہ کی دنیوی زندگی یعنی بڑھاپے کے زمانہ کی فکر سے نتیجہ کیا؟ نہ تم اس فکر کے لئے پیدا ہوئے اور نہ تمہارے فکر کرنے سے تمہارا رزق جو مقدر ہو چکا ہے کم یا زیادہ ہو سکتا ہے' تم تو آخرت کے مسافر ہو اور اسی کا سامان فراہم کرنے کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہو پس اس کی فکر کرو' دنیا کی پرواہ بھی نہ کرو کہ کتنی ملتی ہے اور کیونکر گزر رہی ہے۔

مال کو مثلِ دوا سمجھو:۔

کفایت کی مقدار کا جو حساب ہم نے بیان کیا ہے وہ چونکہ تخمینی ہے اس لئے لوگوں کی طبیعتوں' حالتوں اور موسم کی ارزانی و گرانی کے اختلاف سے اس میں کمی

بیشی ہو سکتی ہے ہمارا مقصود یہ ہے کہ مال کو دوا کی مثل سمجھو کہ بقدرِ ضرورت تو مفید و نافع ہوا کرتی ہے اور اس میں اور کچھ زیادتی کر دی جائے تو وہ بیماری کو بڑھا دیتی ہے اور اگر اس میں بہت ہی زیادتی کر دی جائے تو جان ہی سے مار دیتی ہے پس جہاں تک ہو سکے اخراجات و مصارف میں کمی کرو کیونکہ اگر تکلیف بھی ہے تو بس چند ہی روز کی ہے کیونکہ زندگی ہی چند روزہ ہے پس یہ تو جس طرح ہو گی گزر ہی جائے گی اور یہ بھی یاد رکھو کھانے کا مزہ بھی بھوک میں ہی معلوم ہوا کرتا ہے پس جتنے یہاں بھوکے رہو گے اسی قدر جنّت کی نعمتوں میں مزہ بھی زیادہ آئے گا۔

بخل کی حد:۔

بخل کی حد بھی معلوم ہونی چاہئے کیونکہ اکثر آدمی خود اپنی حالت میں شک کرتے ہیں اور نہیں سمجھ سکتے کہ بخیل ہیں یا سخی' اس لئے جاننا چاہئے کہ جہاں مال خرچ کرنے کا شرع حکم دے یا مروت تقاضا کرے وہاں مال خرچ نہ کرنا بخل ہے پس اگر کوئی شخص اپنے بیوی بچوں کو وہ نفقہ تو برابر دیئے جائے جو قاضی نے مقرر اور اس پر واجب کر دیا ہے مگر اس سے زیادہ ایک لقمہ بھی دینا گوارا نہ ہو تو چونکہ یہ سختی اگرچہ شریعت کے خلاف نہیں لیکن مروت کے خلاف ہے اس لئے بخل میں شمار ہے یا مثلاً تم نے کسی دوکاندار سے کوئی شئے خریدی اور ذرا سے نقص یا عیب کی وجہ سے اس کو واپس کر دیا تو اگرچہ یہ واپسی شرعاً" جائز ہے مگر چونکہ خلافِ مروت ہے اس لئے بخل کہلائے گا یہاں شبہ نہ ہونا چاہئے کہ جب یہ صورتیں مروت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بخل میں داخل ہیں تو پھر شریعت نے ان کو جائز کیوں کہہ دیا۔ بات یہ ہے کہ شریعت کا منشاء اس قسم کی بے مروتی کی باتوں کو جائز کہہ دینے میں یہ ہے کہ عام لوگوں کی باہمی نزاع دور کرنے اور بخیلوں پر اتنا قلیل بوجھ ڈال کر جس کے وہ متحمّل ہو سکیں انتظام دنیوی کو قائم رکھے مگر اس کے ساتھ ہی مروت کا برتاؤ اور جو ضرورتیں اتفاقیہ پیش آجائیں ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ذیشان ہے کہ جس کے مال کے ذریعہ سے آدمی اپنی آبرو بچائے وہ بھی صدقہ ہے (حاکم) مثلاً کسی مالدار کو اندیشہ ہو کہ یہ شاعر میری ہجو کرے گا اور اگر میں

اس کو کچھ دے دوں تو اس کا منہ بند ہو جائے گا اور باوجود اس علم کے اس کو کچھ نہ دے تو وہ شخص بخیل سمجھا جائے گا کیونکہ اس نے اپنی آبرو محفوظ رکھنے کی تدبیر نہ کی اور بدگو کو بدگوئی کا موقع دیا یہ ظاہر ہے کہ مال کی ذات تو مقصود اور محبوب نہیں ہے چنانچہ کوئی اس کو چباتا یا نگلتا نہیں ہے ہاں البتہ چونکہ اس سے ضرورتیں پوری اور منفعتیں حاصل ہوتی ہیں اس لئے مال مرغوب ہے لہٰذا جس جگہ اس کے خرچ کرنے میں فائدہ ہو وہاں خرچ نہ کرنا غلطی کی بات ہے پس جو شخص باوجود ضرورت کے مال خرچ نہ کرے تو سمجھ لو کہ اس کی ذات کے ساتھ محبت ہے اس نفع کے ساتھ جو کہ مال سے مقصود ہے اس میں مطلق بحث نہیں کبھی مال کی محبت یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ انسان کو اپنا فائدہ اور نقصان بھی نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت بہت خطرناک ہے جس کو جہلِ مرکب کہنا چاہیے۔ پس ایسی صورت میں عقل و شرع کے پابند بننے کی طرف زیادہ توجہ کرو اور جس جگہ پر خرچ کرنے کا یہ دونوں کا حکم کریں وہاں بے دریغ مال خرچ کرو۔ یہ بخل کا تذکرہ تھا اب رہی سخاوت تو اس کی تو کوئی حد ہی مقرر نہیں ہے بس اتنا سمجھ لو کہ بخل کی حد سے باہر نکل کر جتنا بھی خرچ کیا جائے وہ سب سخاوت میں داخل ہے۔

بخل کا علاج :۔

بخل کا علاج علمی بھی ہے اور عملی بھی۔

علمی علاج تو یہ ہے کہ بخل کے نقصانات معلوم کرو کہ آخرت کی تباہی اور دنیا کی بدنامی دونوں اس سے پیدا ہوتی ہیں خوب سمجھ لو کہ مال بخیل کے ساتھ جانے والا نہیں ہے صرف قبر کے گڑھے تک کا دھندا ہے۔ پس دنیا میں انسان کو جو مال دیا گیا ہے تو صرف اس غرض سے دیا گیا ہے کہ وہ اس کو اپنی ضرورتوں میں خرچ کیا کرے سو اگر تم جانور بن کر اس کو اپنی نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے میں خرچ کرو گے تو بڑی ضروری نعمت یعنی آخرت کی لذتوں سے محروم رہو گے اور اگر دنیا میں اولاد کے لئے چھوڑ مرو گے تو گویا اولاد کو تو آرام دیئے جاؤ گے مگر خود خالی ہاتھ چلے جاؤ گے اب تم ہی بتاؤ کہ اس سے زیادہ حماقت کیا ہو سکتی ہے' ذرا غور کرو کہ اگر تمہارے

پسماندہ بچے صالح اور نیکوکار اٹھیں گے تو اللہ عزّوجلّ ان کی ضرورتوں کا کفیل ہوگا پھر تمہارے جمع کرنے سے کیا نفع اور اگر خدانخواستہ وہ بدکار ہوئے تو ظاہر ہے کہ یہ تمہارا جمع کیا ہوا مال اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ ہوگا اور اس کا تم پر وبال پڑے گا کہ معصیت کے سبب تم قرار پاؤ گے جیسے جیسے دوسرے لوگ تمہارے مال سے مزے اڑائیں گے ویسے ویسے تم پر عذاب بڑھے گا۔ اس قسم کی باتیں سوچنے اور بخل کے نتائج پر غور کرنے سے امید ہے کہ انشاء اللہ بخل سے نجات مل جائے گی۔

عملی علاج یہ ہے کہ نفس پر جبر کرو اور خرچ کرنے کی بہ تکلیف عادت ڈالو۔ ضرورتوں کیوقت خرچ کرنے کی خوبی کا تصور باندھ کر اتنا زور ڈالو کہ خرچ کرنے کی رغبت ہونے لگے اور پھر بتدریج بُرے خیالات اور مذموم اخلاق کو دور کرتے رہو یہاں تک کہ بخل کی جڑ کٹ جائے اور اب مال کا خرچ کرنا خالصا" لوجہ اللہ عزّوجلّ بن جائے۔

(۶) شہرت سے محبت

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ دار آخرت کی بھلائیاں انہی کے لئے مخصوص ہیں جو زمین پر رہ کر بڑھنا چڑھنا اور فتنہ فساد کرنا نہیں چاہتے۔ حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ بکریوں کے گلے میں دو بھیڑیئے آپڑیں تو وہ نقصان نہ کریں گے جتنا مال و جاہ کی محبت دیندار مسلمان کے دین کا نقصان کرتی ہے (ترمذی) خوب سمجھ لو کہ رعونت اور حُبِّ جاہ بُری بلا ہے ان سے دل میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں وہ لوگ بڑے آرام میں ہیں جن کو کوئی جانتا بھی نہیں' پریشان حال غبار آلودہ کہ نہ لوگ ان کو پاس بٹھانا پسند کرتے ہیں' نہ امراء ان کو اپنی کوٹھی میں بنگلوں میں گھسنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اگر وہ نکاح کرنا چاہیں تو کوئی ان کو لڑکی دینا پسند نہیں کرتا' پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ذلت و مسکنت کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں انہی میں ایسے بندے ہوتے ہیں کہ اگر کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ عزّوجلّ ان کی خاطر اس کو پورا فرماتا ہے یاد رکھو کہ جہاں انسان کی شہرت ہوئی اور اس کو عزّت کی جگہ ملی اور لوگوں کے آگے آگے چلنا پسند آیا تو بس تباہی آگئی اللہ کے بندے اپنے آپ کو بہت چھپاتے ہیں البتہ بلا طلب و بلا خواہش اگر اللہ تعالٰی ہی ان کو ظاہر فرما دے تو اب ان کو چھپانا مناسب نہیں رہتا۔ دیکھو انبیاء علیہم السلام' خلفائے راشدین رضوان اللہ اجمعین میں اور اکثر اولیاء کرام رحمتہ اللہ علیہم کی دنیا میں شہرت ہوئی ہے مگر چونکہ ان میں سے کسی نے بھی اپنی شہرت کی آرزو یا خواہش نہیں کی بلکہ محض اللہ تعالٰی کی اطاعت کی کہ اس نے جس حال میں بھی رکھا اس پر راضی ہو گئے اس لئے نہ تکبّر پیدا ہوا اور نہ حُبِّ جاہ کیونکہ حب جاہ اس کا نام ہے کہ اپنی شہرت کو خود خواہش کرے اور ظاہر ہے کہ اس سے رعونت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ عزّوجلّ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے (آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم)

حُبِّ جاہ اور حب مال میں فرق :-

حُبِّ جاہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان لوگوں کے قلوب پر قبضہ کرنا چاہے اور اس کی خواہش کرے کہ ان کے دل میرے مطیع بن جائیں میری تعریف کیا کریں' میری حاجت کے ورا کرنے میں لپکیں اور جان تک دینے سے دریغ نہ کریں' مال کے ساتھ بھی انسان کو اسی غرض سے محبت ہوتی ہے کہ وہ دفع حاجت کا ذریعہ بنے اور جاہ و شہرت کی خواہش بھی اسی لئے ہوتی ہے کہ کوئی ضرورت بند نہ رہے پس مقصود کے اعتبار سے دونوں ایک ہی نفع کے سبب ہیں۔

چونکہ حب جاہ سے مال بھی حاصل ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اس کو چرا سکتا ہے نہ لوٹ سکتا ہے اور مال کے ذریعہ سے بسااوقات جاہ حاصل نہیں ہوتا اور مال میں چور کا اور لوٹ کا خطرہ بھی رہتا ہے اس لئے حُبِّ جاہ کا درجہ حُبِّ مال سے بڑھا ہوا ہے اور چونکہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی کی تعظیم کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تو لامحالہ لوگ اس کی تعریفیں کرتے اور دوسروں کو اس مضمون میں اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں اور جب ان کو اس کی دھن لگ جاتی ہے تو بسا اوقات کامیاب بھی ہو جاتے ہیں پس اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور آخر کار حُبِّ جاہ میں بلا تکلّف و بلا مشقت کامیابی ہو جاتی ہے برخلاف اس کے مال کے جمع کرنے میں بیسیوں تدبیریں اور حیلے کرنے پڑتے ہیں اور پھر بھی خاطر خواہ مال جمع ہونا مشکل ہوتا ہے اس وجہ سے انسان کو مال کی بہ نسبت جاہ کی محبت و خواہش زیادہ ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ فقراء بھی حُبِّ جاہ میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ حُبِّ جاہ کے بکثرت ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہر آدمی کو اپنی بڑائی اور عزت کی بالطبع خواہش ہوتی ہے اور ہر شخص چاہتا ہے کہ میں ایسا بے مثل ہو جاؤں کہ بس میں ہی میں ہوں حالانکہ یہ حقیقت الٰہیہ ہے اور اللہ عزّوجلّ ہی کو شایاں ہے کیونکہ یکتائی اسی کی شان ہے اور تمام مخلوق اس واجب الوجود کے نُورِ قدرت کا پرتو ہے پس جو انسان حُبِّ جاہ کے مرض میں گرفتار ہے وہ گویا اللہ عزّوجلّ کے ہم پلہ ہو جانے کا خواہش مند اور اس کے ساتھ اس نسبت کے قائم رکھنے سے ناراض ہے جو دھوپ کو آفتاب کے ساتھ ہوتی ہے گویا

اس کا نفس فرعون کی طرح اَنا ربّکم الاعلیٰ پکار رہا ہے کہ (میں ہی تم سب کا بڑا پروردگار ہوں) بس اتنا فرق ہے کہ فرعون نے یہ کلمہ زبان سے لوگوں کے سامنے کہہ دیا تھا اور دوسرے لوگ اس کو اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں مگر چونکہ شان یکتائی کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی اور اس آرزو میں کامیاب ہونا محال ہے اس لئے انسان کا نفس چاہتا ہے کہ مستقل وجود میں کامیاب نہ ہو تو کم از کم اتنا ضرور ہو کہ ساری مخلوق پر قبضہ ضرور حاصل ہو جائے کہ جس شئے پر جو چاہوں تصرف کروں مگر چونکہ آسمان' ستاروں' پہاڑ اور دوسری بڑی مخلوقات پر قبضہ ہونا دشوار نظر آیا اس لئے ذرا نیچے اتر کر اس کا متمنی نظر آیا کہ صرف زمین ہی کی مخلوق پر مالکانہ تصرّف حاصل ہو جائے یعنی حیوانات تابع ہو جائیں اور معدنیات و نباتات فرمانبردار بن جائیں اور ان آسمانی مخلوقات اور بڑی زمینی مخلوقات کی جن پر مالکانہ تصرّف حاصل ہونا ناممکن ہے پوری واقفیت اور مکمل علم نہ ہو جائے تاکہ ہاتھ کا قبضہ ہو تو علم ہی کا قبضہ قائم رہے اور دنیا کی آبادی سے عقل والے یعنی انسان اپنے دلوں کے اعتبار سے مطیع و اطاعت شعار بن جائیں کہ میری عظمت و بڑائی کے معتقد ہو کر مجھے صاحبِ کمال سمجھنے لگیں' ہاتھ باندھے میری تعظیم کرتے ہوں اور میری شہرت کا چرچا ان شہروں اور ملکوں تک پہنچ جائے جہاں میں خود نہیں پہنچ سکتا۔

شہرت کی عمر:۔

انسان ایک دن مرنے والا ہے اور جاہ و شہرت مرنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ پس اگر یہ ناپائیدار شہرت حاصل بھی ہوئی اور مخلوق میں عزّت اور جاہ بھی مل گئی تو کیا ہوا؟ یہ تو کوئی خوبی اور کمال کی بات نہیں کمال تو ایسی چیز کا حاصل کرنا ہے کہ جس میں موت کوئی خلل یا کمی نہ پیدا کرے اور وہ معرفتِ الٰہی ہے کہ صاحبِ معرفت شخص دنیا سے انتقال بھی کر جائے تب بھی معرفت کے بے شمار مراتب میں اس کی ترقی رہتی ہے لہٰذا اس رعونت اور طلب شہرت کا علاج کرو اور اس کی محبت دل سے نکالو یوں سمجھو کہ اگر مثلاً تمام دنیا تمہیں سجدہ بھی کرنے لگے تو کتنے دن کے لئے آخر ایک دن وہ ہو گا کہ نہ تم باقی رہو گے اور نہ سجدہ کرنے والے باقی رہیں

گے۔ تعجب ہے کہ زمانہ تو تمہارے ساتھ یہاں تک بخل کرتا ہے کہ شہر یا قصبہ تو درکنار تمہارے محلہ پر بھی تمہیں پورا قبضہ نہیں دیتا اور تم زمانہ کی ہمدردی میں ایسے ڈوبے کہ دائمی نعمت اور جاوید سلطنت چھوڑنے پر راضی ہو گئے کہ دنیا کی اس حقیر شہرت اور چند ایسے احمق و ضعیف لوگوں کی تعظیم و تکریم پر نازاں ہو گئے جن کو نہ کسی کی موت و حیات کا اختیار ہے اور نہ کسی کے ضرر اور نفع پر دسترس ہے اور اس کی بدولت اس ناپائیدار عزت اور عالم ملکوتی کی شہرت کو کھو بیٹھے جو اللہ عزّوجلّ اور اس کی برگزیدہ و پاک مخلوق یعنی فرشتوں میں تمہیں حاصل ہوتی ہے یہ ضرور ہے کہ انسان مال کی طرح بقدر ضرورت جاہ کا بھی محتاج ہے تاکہ اس کی وجہ سے مخلوق کے ظلم و تعدی سے محفوظ اور ظالم حاکموں کی دست برد سے بے خوف ہو کر باطمینان قلب عبادت میں مشغول رہ سکے لہٰذا اتنی طلب جاہ میں مضائقہ نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ بقدرِ ضرورت جاہ اپنی عبادتوں میں ریا اور دکھاوا کر کے نہ حاصل کرے کیونکہ ریا حرام ہے نیز متقی اور صوفی کی صورت بنا کر بھی مخلوق کو دھوکہ نہ دو کیونکہ اگر درویشانہ عالمانہ صورت کی بدولت مخلوق میں عزّت حاصل کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکار سمجھے جاؤ گے کہ جو مضمون قلب کو حاصل نہ ہو اور محض صورت بنا کر اس کا اظہار کیا جائے تو وہ دھوکہ اور مکر کہلاتا ہے اور ظاہر ہے کہ دھوکہ حرام ہے بہرحال طلب جاہ بڑی خطرناک چیز ہے کیونکہ اس کی ہوس انسان کو اس حالت پر قناعت نہیں کرنے دیتی پس اگر سچ پوچھو تو دین انہی لوگوں کا محفوظ ہے جن کا حال اتنا مخفی و پوشیدہ ہے کہ ان کو کوئی جانتا ہی نہیں کہ وہ کس رتبہ کے ہیں۔

تعریف میں لذت کی وجوہات :۔

اکثر حُبِّ جاہ کا سبب اپنی مدح و ثناء کی خواہش ہوا کرتی ہے کیونکہ انسان کو اپنی تعریف میں لذت محسوس ہوتی ہے اور اس لذت کے پیدا ہونے کی تین وجوہات ہیں۔

(i) چونکہ کمال اللہ عزّوجلّ کی صفت ہے اور ہر شخص کی مرغوب ہے کہ میرے اندر بھی یہ صفت پیدا ہو لہٰذا نفس اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے کیونکہ سمجھتا ہے

کہ تعریف کرنے والا میرے کمال سے واقف ہے اور یہی وجہ ہے کہ بے وقوف اور جاہل شخص کی تعریف سے اتنی خوشی نہیں ہوا کرتی جتنی کسی ہوشیار اور عقل مند آدمی کی تعریف سے ہوتی ہے۔

(ii) تسخیر کی خواہش ہر شخص کو ہے اور اپنی مدح سن کر چونکہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مداح کے قلب پر میرا قبضہ اور اثر ہو گیا ہے لہٰذا نفس کو اس میں مزہ آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ عزت شخص تعریف کرے تو زیادہ مسرت ہوتی ہے اور کوئی محتاج یا بھیک منگا فقیر مدح کرے تو بالکل خوشی نہیں ہوتی کیونکہ اس کے قلب پر قبضہ کرنا کوئی کمال یا خوبی نہیں سمجھی جاتی۔

(iii) یہ خیال ہوتا ہے کہ میرے آوازۂ شہرت کے بلند ہونے کا ذریعہ پیدا ہو گیا' کیونکہ لوگوں کو میری تعریف کرنے کی طرف توجہ ہوئی اور اب یہ آہستہ آہستہ پھیل کر دنیا بھر میں بہت جلد شہرت کرا دے گی لہٰذا مدح سے نفس پھولتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجمع میں تعریف ہونے سے جتنی مسرت ہوتی ہے تنہائی میں مدح ہونے سے اتنی مسرت نہیں ہوتی۔

حُبِّ مدح کا علاج :-

جان لو کہ اس حُبِّ مدح نے لوگوں کو برباد کر دیا اسی کی بدولت ریا اور طرح طرح کی معصیت میں مبتلا ہو گئے۔ پس اس کا علاج کرنا چاہئے غور کرو کہ تعریف کرنے والا کس بات کی تعریف کرتا ہے۔ اگر تمہارے مال اور عزت کی تعریف کر رہا ہے تو سمجھو کہ یہ تو کوئی کمال کی چیز نہیں ہے مسرت تو حقیقی کمال یعنی معرفتِ الٰہی کے حصول پر ہونی چاہئے اور وہی کمال تو رونے کا مقام ہے نہ کہ مسرت کا اور اگر تمہارے زہد اور اتقاء کی تعریف ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں یعنی یا تو یہ کہ درحقیقت تم زاہد اور متّقی ہو اور تمہاری تعریف اس بارے میں سچی ہو رہی ہے یا محض تمہیں خوش کرنے کے لئے تمہاری جھوٹی تعریفیں کی جا رہی ہیں پس اگر سچی تعریف ہے تو اس کا علاج اس طرح کرو کہ دل میں سوچو اور غور کرو کہ ان باتوں کا اپنے اندر آجانا اور اللہ تعالٰی کا قبول فرما لینا خوشی کی بات ہے نہ کہ دوسروں کا بیان

کرنا کیونکہ لوگوں کے اظہار کو قبولیت،اور قربِ الٰہی میں کچھ دخل نہیں ہے اور اگر زہد و اتقاء کی تعریف جھوٹی ہو رہی ہے تب تو خوش ہونا کھلی حماقت ہے کیونکہ اس کی مثال تو ایسی ہوئی کہ کوئی شخص تمہاری تعریف کرنے لگے کہ آپ کی آنتوں اور معدہ میں عطر کی خوشبو آرہی ہے حالانکہ تم واقف ہو کہ اس میں تو نجاست اور فضلہ بھرا ہوا ہے اور پھر اس بے جا مدح اور بے موقع بلکہ صریح جھوٹی تعریف پر خوش ہونے لگے تم ہی بتاؤ کہ اس سے زیادہ بے وقوفی کیا ہو گی اور جاہ و شہرت کا علاج ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس پر عمل کرنے سے امید ہے کہ حُبِّ مدح کی جڑ جاتی رہے گی۔

(۷) دنیا کی محبّت

دنیا صرف مال و جاہ کی محبّت ہی کا نام نہیں بلکہ موت سے پہلے جس حالت میں بھی تم ہو وہ سب دنیا ہے اور دنیا کی محبّت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ اس کے تمام جھگڑوں' بکھیڑوں اور مخلوقات اور موجودہ چیزوں کے ساتھ تعلق رکھنے کا نام دنیا کی محبّت ہے البتہ علم و معرفتِ الٰہی اور نیک کام جس کا صلہ مرنے کے بعد ملنے والا ہے ان کا وقوع اگرچہ دنیا میں ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ دنیا سے مستثنیٰ ہیں اور ان کی محبّت دنیا کی محبّت نہیں ہے بلکہ آخرت کی محبّت ہے' اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ ہم نے دنیا کی تمام چیزوں کو زمین کی زینت کا سامان بنایا ہے تاکہ لوگوں کو آزمائیں کہ کون ان پر فریفتہ ہو کر آخرت ضائع کرتا ہے اور کون بقدرِ ضرورت سفر کا توشہ سمجھ کر اپنی آخرت سنوارتا ہے۔

یاد رکھو کہ آدمی کو جاہ و مال کے علاوہ زمین کی بھی محبّت ہوا کرتی ہے مثلاً مکان بنائے یا کھیتی کرے' نباتات کی بھی محبّت ہوتی ہے مثلاً جڑی بوٹی ہو کہ اس کی دواؤں میں استعمال کرے یا ترکاری و دیگر پیداوار یا پھل پھول ہو کہ اس کو کھائے اور مزہ اڑائے اور معدنیات کی بھی محبّت ہوتی ہے مثلاً برتن اوزار بنائے یا زیور بنوا کر پہنے یا نقد جمع کرے' حیوانات کی بھی محبّت ہوتی ہے مثلاً شکار کرے اور کھائے یا ان پر سواری کرے اور اپنی زینت بڑھائے اور آدمیوں کی بھی محبت ہوتی ہے مثلاً یہ کہ عورتوں کو منکوحہ اور خادمہ بنائے یا مردوں کو غلام اور نوکر خدمت گار بنائے۔ انہی چیزوں کی محبت کا نام ہوائے نفس ہے جس کے بارے میں اللہ عزّوجلّ نے فرمایا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو خواہش سے روک لیا اس کا ٹھکانہ جنت ہے یاد رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا ہے اور اسی میں اکثر باطنی امراض مہلکہ مثلاً غرور' نخوت' کینہ' حسد' ریا' تفاخر اور تکبّر کی حرص پیدا ہوتی ہے اور جب انسان کو حیات دنیوی کی درستی و آرائش کا شوق پیدا ہوتا ہے تو صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کے ناپائیدار مشغلوں میں ایسا پھنس جاتا ہے کہ آگے پیچھے اور ابتداء و انتہا کی

اس کو کچھ خبر ہی نہیں رہتی اور ظاہر وباطن دونوں دنیا ہی کے ہو رہتے ہیں۔ دل دنیا کی محبت میں مشغول ہو جاتا ہے اور بدن اس کی اصلاح و تدبیر میں مصروف حالانکہ دنیا توشۂ آخرت ہے اور اس سے مقصود یہی ہے کہ مسافران آخرت باآسانی اپنا سفر ختم کر سکیں گے مگر بے وقوف اور احمق لوگوں نے اسی کو مقصودِ اصلی سمجھ لیا اور طرح طرح کے مشغلوں اور قسم قسم کی خواہشوں میں ایسے پڑے کہ آنے والے وقت کو بالکل بھول گئے ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص حج کی نیت سے روانہ ہو اور جنگل میں پہنچ کر سواری کے گھاس دانہ اور سواری کے موٹا تازہ کرنے کی فکر میں لگ جائے اور ساتھیوں سے پیچھے رہ جائے افسوس ہے اس کی اس حالت پر کہ تن تنہا جنگل میں رہ گیا اور قافلہ کوچ کر گیا جس نیت سے چلا تھا یعنی حج وہ بھی ختم ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جنگلی درندوں نے موٹی تازی سواری کو بھی چیر پھاڑ ڈالا اور اس کو بھی اپنے منہ کا نوالہ بنا گئے۔ یاد رکھو کہ دنیا آخرت کی کھیتی اور منزل کا پڑاؤ ہے اور تم اپنے جسم خاکی پر سوار ہو کر آخرت کا سفر کر رہے ہو اس لئے تمہیں چاہئے کہ اپنی سواری گھاس دانہ بقدر کفایت اٹھاؤ اور سفری ضرورتوں میں کام آنے والا سامان مہیا کر کے وہ بیج بوؤ جس کو آخرت میں کاٹو اور پھر دائمی زندگی آرام سے گزار سکو اگر اس ماتحت سواری کو پرورش و فربہی میں مشغول ہو جاؤ گے تو قافلہ کوچ کر جائے گا اور تم منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکو گے۔ دنیا میں مخلوق کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کشتی پر کچھ آدمی سوار ہوں اور کشتی کسی جزیرے کے کنارے پر آٹھہرے اور کشتی کا ملاح سواریوں کو اجازت دے دے کہ جاؤ جزیرے میں اتر کر اپنی ضرورتیں پوری کر آؤ مگر ہوشیاری سے کام لینا۔ جگہ خطرناک ہے اور ابھی طویل سفر سر پر ہے غرض سواریاں اتریں اور ادھر ادھر منتشر ہو کر کئی اقسام پر منقسم ہو گئیں۔

بعض تو ضروری حاجت سے فارغ ہوتے ہی لوٹ پڑے اور فضول وقت گزارنا انہیں اچھا نہ معلوم ہوا پس دیکھا کہ کشتی خالی پڑی ہے لہٰذا اپنی پسند کے موافق ساری کشتی میں اعلیٰ درجہ کی ہوادار اور فراغ جگہ منتخب کر کے وہاں بیٹھ گئے۔

اور بعض جزیرہ کی خوشگوار ہوا کھانے اور خوش الحان پرندوں کی سریلی آوازوں

ن کے سننے میں لگ گئے' سبز مخملی فرش اور رنگ برنگ کے پھول بوٹوں اور طرح طرح کے پتھروں اور درختوں کی گلکاریوں میں مشغول ہو گئے مگر پھر جلدی ہوش آگیا اور فوراً کشتی کی جانب واپس ہوئے یہاں پہنچ کر دیکھا کہ جگہ تنگ رہ گئی ہے اور پر بہار و پر فضا جگہوں پر ان سے پہلے آجانے والے لوگ بستر لگا چکے ہیں لہٰذا اس تنگ ہی جگہ میں تکلیف کے ساتھ بیٹھ گئے۔

اور چند لوگ اس ذخیرہ کی عارضی بہار پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ دریائی خوشنما سیپیوں اور پہاڑی خوب صورت پتھروں کے چھوڑنے کو ان کا دل ہی نہ چاہا پس ان کا بوجھ لاد کر انہوں نے اپنی کمر پر رکھا اور سمندر کے کنارے پر پہنچے کہ کشتی پر سوار ہوں' دیکھا کہ کشتی لبریز ہو چکی ہے کہ اس میں نہ اپنے بیٹھنے کی جگہ ہے نہ فضول بوجھ کے رکھنے کا کوئی امکان ہے اب حیران ہیں کہ کیا کریں ادھر تو بوجھ کے پھینکنے کو نفس گوارا نہیں کرتا اور ادھر اپنے بیٹھنے تک کو جگہ نہیں ملتی غرض قہر درویش بجان درویش' نہایت دقت کے ساتھ ایک نہایت تنگ جگہ میں گھس بیٹھے اور کنکروں' پتھروں کے بارِ گراں کو اپنے سر پر لاد لیا' اب ان کی حالت کا تم ہی اندازہ کر لو کہ کیا ہوگی کمر الگ دکھے گی' گردن جدا ٹوٹے گی اور جس مصیبت و تکلیف کے ساتھ وقت کٹے گا اس کو ان کا ہی دل خوب سمجھے گا۔

اور بعض لوگ جزیرہ کے دل افروز حسن پر ایسے عاشق ہوئے کہ کشتی اور سمندر سب بھول گئے' پھول سونگھنے اور پھل کھانے میں مصروف ہو گئے اور کچھ خبر نہ رہی کہ کہاں جانا ہے اور یہاں رہ کر کن درندوں اور موذی جانوروں نے ان کے نازک اور خوبصورت بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے یہی حال بعینہٖ دنیا داروں کا ہے اب تم خود غور کر کے سمجھ لو کہ کن لوگوں پر کون سی مثال چسپاں ہوتی ہے۔

کیا دو محبتیں اکٹھی رہ سکتی ہیں؟

جو شخص اپنے نفس کی ماہیت سے واقف ہو گیا اور معرفتِ الٰہی حاصل کر لی اور جس نے دنیا کی حقیقت سمجھ لی وہ خوب سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے ساتھ دنیا کی محبت کا جمع ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جس طرح ایک برتن میں آگ اور پانی کا جمع

ہونا ناممکن ہے اور جب تک انسان دنیا سے منہ نہ پھیرے گا کہ ان فانی تعلقات کو منقطع کرے اور بقدرِ ضرورت دنیا پر قناعت کر کے بہ اطمینان ہر لحظہ فکر و ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جائے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا نہ ہو گی اگر تمہاری ایسی حالت ہو جائے اور نورِ بصیرت کے مشاہدے سے یہ اسرار منکشف ہو جائیں تب تو کسی کے سمجھانے اور بتانے کی حاجت ہی نہیں ورنہ شریعت کے تابع بن کر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی کس قدر مذمت فرمائی ہے تقریباً تہائی قرآن اسی دل فریب سبزہ زار زہر ہلاہل کی برائیوں کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے چنانچہ فرمایا ہے کہ جنھوں نے سرکشی کی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی وہ جہنمی ہیں اور حضور پُرنُورِ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ذیشان ہے کہ تعجب ہے ان لوگوں پر جو عالم بقا کو سچا سمجھیں اور پھر اس ناپائیدار پر فریفتہ ہوں۔

جان لو کہ جو لوگ دنیا کو مقصود سمجھ کر اس کے کمانے میں مشغول ہو جاتے ہیں وہ سدا پریشان رہتے ہیں کہ ان کی طلب کبھی ختم نہیں ہوتی اور ان کی فکر کبھی رفع نہیں ہوتی اس کی آرزو کبھی پوری نہیں ہو سکتی' اس کا رنج و غم کبھی دور نہیں ہو سکتا سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور ایک کوڑے پر لا کھڑا کیا جہاں مردوں کی کھوپڑیاں اور نجاست و غلاظت کے ڈھیر اور بوسیدہ ہڈیاں اور پھٹے پرانے کپڑے پڑے ہوئے تھے اور فرمایا کہ "دیکھو ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) یہ ہے دنیا کی حقیقت ایک وقت وہ تھا کہ ان کھوپڑیوں میں بھی تمہاری طرح امیدیں اور آرزوئیں جوش میں ہوتی تھیں اور حرص و ہوس سے لبریز تھیں' اور آج کس برے حال میں کوڑے پر پڑی ہیں کہ چند روز میں خاک ہو جائیں گی اور ان کا نشان بھی نہ رہے گا اور دیکھو یہ غلاظت اور فضلہ جو تمہیں نظر آرہا ہے وہ تمہاری غذا ہے جس کے پیٹ کے اندر بھرنے میں حلال و حرام کا بھی امتیاز نہیں ہوتا ایک دن تھا کہ رنگ برنگ کے کھانے بن کر تمہارے پیٹ میں تھا اور آج یہاں کوڑے پر کس گندگی کی حالت میں پڑا ہوا ہے کہ اس کی بو سے لوگ بھاگتے اور گھنیاتے ہیں دیکھو یہی پرانے چیتھڑے کسی وقت تمہارے چمک دمک

والے لباس تھے اور آج ان کو ہوائیں ادھر ادھر اڑائے پھرتی ہیں اور کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا اور دیکھو یہ ہڈیاں کسی دن سواری کے جانور اور مویشی تھے کہ جن پر جانیں دیتے اور قتل و قتال کیا کرتے تھے۔

اے ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) ! یہ دنیا کی حقیقت ہے جس کا قابلِ عبرت انجام دنیا میں ظاہر ہو گیا پس جس کو رونا ہو روئے" (ابن ابی الدنیا) حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایک دن دنیا کی حقیقت منکشف ہوئی انہوں نے دیکھا کہ ایک بدصورت بڑھیا بناؤ سنگار کئے ہوئے زیور و پوشاک پہنے بنی ٹھنی بیٹھی ہے آپ علیہ السلام نے پوچھا کہ اے بڑھیا تو کتنے لوگوں سے نکاح کر چکی ہے بڑھیا نے جواب دیا کہ بے شمار آدمیوں سے آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان شوہروں کا انتقال ہو گیا یا تجھے طلاق دے بیٹھے بڑھیا نے جواب دیا کہ طلاق دینے کی ہمت تو کس کو ہوئی ہے میں نے سب کو مارا ڈالا یہ سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرے موجودہ شوہروں پر افسوس ہے کہ ان کو گذشتہ شوہروں کی حالت پر عبرت نہیں ہوتی۔ مسلمانو! ہوشیار ہو جاؤ اور سنبھلو دنیا بڑی بے وفا ہے اس سے بچو' اس کا جادو ہاروت و ماروت کے سحر سے زیادہ اور جلد اثر کرتا ہے اگر پرانا نمک جو کی روٹی کے ساتھ کھا کر اور ٹاٹ پہن کر زندگی گزار دو گے تب بھی گزر جائے گی مگر آخرت کی فکر کرو وہاں کی رتی برابر نعمت کا نہ ملنا بھی بڑی تکلیف کا سبب ہے۔

دنیا کے بارے میں ایک شیطانی وسوسہ :-

بعض لوگ دھوکا کھا جاتے اور سمجھتے ہیں کہ ہمارا بدن کتنا ہی دنیا میں مصروف رہے مگر ہمارا دل دنیا سے فارغ اور خالی رہتا ہے یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے بھلا کوئی شخص دریا میں چلے اور پاؤں نہ بھیگے یہ کیسے ہو سکتا ہے تمہیں دنیا کی طلب ہو گی اور ضرورت سے زیادہ دنیا کمانے کی تدبیروں میں لگے رہو گے تو ضروری بات ہے کہ پریشان رہو گے اور دین کو ہاتھ سے کھو بیٹھو گے یہ بھی یاد رکھو کہ دنیا کی طلب کبھی ختم نہ ہو گی اور اس کی حرص ہمیشہ بڑھتی رہے گی کیونکہ دنیا کی مثال سمندر کے کھارے پانی کی سی ہے کہ جتنا پیو گے اسی قدر پیاس زیادہ لگے گی' بھلا جو چیز ایک دن

تم سے چھوٹ جانے والی ہے اس میں مصروف ہونا اگر اپنے رنج کا سامان کرنا نہیں ہے تو اور کیا ہے دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے کہ چھونے میں نہایت نرم ہے مگر منہ میں قاتل و مہلک زہر لئے ہوئے ہے اس بے وفا کی مفارقت یقینی ہے لہٰذا اس کے ہاتھ آجانے پر خوش ہونا اور ہاتھ نہ آنے پر رنج و ملال کرنا دونوں فضول ہیں۔ دنیا کے زر و مال کو اپنے اطمینان کا ذریعہ سمجھنا بڑی حماقت ہے جہاں ہمیشہ رہنا نہیں وہاں اطمینان کیسا۔

دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مہمان نواز نے اپنا مکان آراستہ کیا اور شیشہ و آلات سے سجا کر مہمانوں کو بلایا اور ان کو اس میں بٹھا کر عطر اور خوشبو اور پھولوں سے بھرا ہوا طباق ان کے سامنے رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ صاحب مہمان کا مطلب اس سے یہ ہے کہ طباق میں رکھے ہوئے پھولوں کو سونگھو اور پاس والوں کے آگے سرکا دو کہ وہ اب اسی طرح نفع اٹھائیں اور بخوشی خاطر برابر والوں کے سامنے کر دیں یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے طباق پر تم ہی قبضہ کر بیٹھو۔ پس اگر کوئی شخص آداب مجلس سے واقف نہ ہو اور طباق کو اپنا نذرانہ سمجھ کر اپنے بغل میں دبائے تو اس کی حماقت پر تمام حاضرین مجلس ہنسیں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے اور اس کے بعد یہ نتیجہ ہو گا کہ مالک مکان زبردستی طباق چھین کر دوسروں کے سامنے رکھ دے گا تم ہی سوچو کہ اس وقت اس کو کیسی ندامت ہو گی۔ اسی طرح دنیا اللہ عزوجل کی میزبانی کی جگہ ہے اس لئے اللہ عزوجل کا یہ مقصود ہے کہ آخرت کے مسافر آئیں اور ضرورت کے مطابق اس طرح نفع اٹھائیں جس طرح معار چیزوں سے نفع اٹھاتے ہیں اور اپنی حاجتیں رفع کیا کرتے ہیں اس کے بعد بخوشی اس کو دوسروں کے سپرد کر کے اپنا راستہ لیں اور آخرت میں آپہنچیں پس مستعار چیزوں سے دل کا لگانا حقیقت میں چلتے وقت خود کو شرمندہ اور رنجیدہ کرنا ہے۔

(۸) تکبر

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ تکبّر کرنے والے کا بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ کبریائی خاص میری چادر ہے پس جو شخص بھی اس میں شریک ہونا چاہے گا میں اس کو ختم کر دوں گا۔

سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ذیشان ہے کہ "جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنّت میں نہ جائے گا" (حاکم) جو لوگ باجود صاحبِ عزت و مال ہونے کے تواضع کرتے ہیں اور عاجزی و انکساری کے ساتھ لوگوں سے ملتے ہیں ان کو مبارک ہو کہ ان کے بڑے درجے ہیں ان کی دنیا میں بھی عزّت بڑھتی ہے اور آخرت میں بھی۔ تکبّر کے معنی یہ ہیں کہ انسان خود کو صفاتِ کمالیہ میں دوسروں سے زیادہ سمجھے اور ظاہر ہے کہ جب انسان کا اپنے متعلق ایسا خیال ہوتا ہے تو نفس پھول جاتا ہے اور پھر اس کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں مثلاً راستہ میں چلتے وقت دوسروں سے آگے قدم رکھنا۔ مجلس میں صدر مقام یا عزت کی جگہ بیٹھنا دوسروں کو نظرِ حقارت سے دیکھنا یا اگر کوئی سلام کرنے میں پیش قدمی نہ کرے تو اس پر غصہ ہونا' کوئی اگر تعظیم نہ کرے تو ناراض ہونا کوئی اگر نصیحت کرے تو ناک بھوں چڑھانا' حق بات معلوم ہونے کے باوجود اس کو نہ ماننا اور عوام الناس کو ایسی نگاہ سے دیکھنا جس طرح گدھوں کو دیکھتے ہیں (نعوذباللہ منہا۔) چونکہ تکبّر بڑی بڑی خباثتوں کا مجموعہ ہے اس لئے جنہم کا پورا ذخیرہ ہے۔

اول :۔ کبریائی کہ یہ اللہ عزّوجلّ ہی کے لئے مخصوص اور اسی کی شان کو زیبا ہے پس انسان ضعیف البیان جس کو دوسرے کا اختیار تو درکنار اپنے ہی نفس کا اختیار نہیں اس صفتِ الٰہی میں ساتھی ہونے کی کس طرح جرأت کر سکتا ہے اور چونکہ متکبّر شخص باوجود اس ذلت و ضعف کے اللہ تعالٰی کی مشارکت چاہتا اور اس صفت کمال میں اس کے ساتھ منازعت کرتا ہے اس لئے پرلے درجے کا احمق اور خبیث النفس سمجھا جائے گا۔

دوم :۔ تکبّر کے سبب حق بات کے انکار کی نوبت آتی ہے جس سے دینی سعادت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور متکبر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو بنظرِ حقارت دیکھنے لگتا ہے اور یہ بات اللہ عزّوجلّ کو بہت ناگوار ہے۔ غور سے سنو اور یاد رکھو کہ ایک بزرگ نے نصیحت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا مندی کو اپنی اطاعت میں چھپا رکھا ہے لہٰذا کسی عبادت کو کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو حقیر نہ سمجھو کیا خبر ہے کہ اس کی رضا مندی اس میں چھپی ہوئی ہو اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ناراضگی اور غصّہ کو معصیت میں چھپا دیا ہے۔ پس کسی معصیت کو کیسی ہی ذرا سی کیوں نہ ہو کبھی معمولی نہ سمجھو کیا خبر ہے شاید اسی میں اس کی ناراضگی و غصّہ چھپا ہوا ہو اسی طرح اپنی ولایت و قرب کو اپنے بندوں میں مخفی رکھا ہے لہٰذا کسی بندہ کو کیسا ہی گنہگار کیوں نہ ہو کبھی حقیر نہ سمجھو کیا خبر ہے کہ شاید اسی عمل میں اس کی رضا مندی ہو جس کا ظہور اس کے انتقال کے وقت دفعتاً" ہو جائے۔

سوم :۔ تکبّرِ نفس کو کوئی شخص پسندیدہ صفت نہیں سمجھتا۔ تکبّر کرنے والا شخص تواضع سے محروم رہتا ہے۔ حسد اور غصہ کو دور کرنے پر قادر نہیں ہوتا ریا کاری کا ترک اور نرمی کا برتاؤ اس کو دشوار ہوتا ہے کسی اسلامی بھائی کی خیر خواہی اس سے ہو نہیں سکتی' غرض اپنی عظمت اور بڑائی کے غرہ میں مست اور ہمہ صفت موصوف ہونے کے خیالِ باطل میں ناصح کی نصیحت سے مستغنی اور نفس امارہ کی اصلاح سے بالکل محروم رہتا ہے۔ جب تک یہ بدخصلت دفع نہ ہو جائے آئندہ بھی اس کی اصلاح کی توقع نظر نہیں آتی لہٰذا اس کے علاج میں جلدی کرنی چاہئے۔ اوّل تو یہی سوچنا چاہئے کہ ہماری حقیقت اور اصلیت کیا ہے ظاہر ہے کہ ابتداء تو نجس اور ناپاک منی کا قطرہ ہے اور انتہا مردار لوتھڑا اور کیڑے مکوڑوں کی غذا۔ اب رہی متوسط حالت کہ جس کا نام زندگی اور حیات دنیا ہے سو اس کی حالت یہ ہے کہ منوں نجاست پیٹ میں بھری ہوئی ہے اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ "بیشک آدمی پر ایک وقت وہ گزرا کہ کہیں اس کا نام بھی نہ تھا"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے دیا مگر اب بھی بیسیوں امراض کا ہر

وقت نشانہ بنا ہوا ہے بھوک و پیاس کا محتاج الگ ہے ذرا سی تکلیف میں بے کار ہو کر بیٹھ جاتا ہے کسی شئے کا علم چاہتا ہے مگر نہیں ہو سکتا نفع حاصل کرنا چاہتا ہے' مگر نقصان ہو جاتا ہے کوئی لحظہ موت سے امن نہیں' اللہ جانے کس وقت بیمار ہو جائے' کس وقت عقل چھن جائے' کس وقت کوئی عضو بیکار ہو جائے اور کس وقت روح پرواز کر جائے پھر انجامِ کار موت کا شکار اور اس کے بعد تنگ و تاریک گھاٹیوں کا سامنا ہونا ہے' حساب و کتاب حشر و نشر پیش آنے ہیں' جنت دوزخ میں دائمی زندگی کا فیصلہ اور شہنشاہی فرمان کا صادر ہونا' بھلا تمہی بتاؤ کہ ایسے گرفتار معصیت اور ذلیل و ناکارہ غلام کو زبردست قدرت والے جبار و قہار شہنشاہ کی ہمسری کا خیال کیونکر زیبا ہو سکتا ہے' جس شخص کی یہ حالت ہو کہ اگر نجاست اس کے ہاتھ کو لگے تو تین تین مرتبہ دھوئے اور پھر اسی نجاست کو ہر وقت پیٹ میں لئے پھرے اس کو تکبّر کرنا کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔

تکبّر کی وجوہات اور ان کا علاج :۔

عموماً" چار وجوہات کی بنا پر انسان میں تکبّر پیدا ہوتا ہے۔ علم' تقویٰ' حسب و نصب اور مال و جمال چونکہ ہر وجہ کا علاج مختلف ہے چنانچہ ہر مضمون کو ہم جدا جدا بیان کرتے ہیں۔

(i) علم پر تکبّر اور اس کا علاج :۔

علماء تکبّر سے بہت کم خالی ہوتے ہیں' کیونکہ علم کے برابر کسی چیز کی فضیلت نہیں ہے' لہٰذا اس کو حاصل کر کے دو خیال پیدا ہو جاتے ہیں۔

اول :۔ یہ کہ ہمارے برابر اللہ کے یہاں دوسروں کا رتبہ نہیں ہے۔

دوم :۔ یہ کہ لوگوں پر ہماری تعظیم واجب اور ضروری ہے۔ پس اگر لوگ تواضع کے ساتھ پیش نہ آئیں' تو ان کو تعجب ہوا کرتا ہے۔

پہلا تکبر دینی تکبر ہے اور دوسرا تکبر دنیوی ہے۔ ایسے عالم کو جاہل کہنا چاہئے کیونکہ علم کا منشاء تو یہ تھا کہ انسان اپنے شریر نفس کی حقیقت اور اللہ عزّوجلّ کی

عظمت کو معلوم کرتا اور سمجھتا کہ خاتمہ کا اعتبار ہے اور اس کا حال کسی کو معلوم نہیں پس جو شخص اپنے آپ کو قابل عظمت سمجھتا ہو تو گویا وہ اپنی اصلیت سے ناواقف اور خاتمہ کے اندیشہ سے بے خوف ہے اور یہ بڑی معصیت ہے کیونکہ جاہل شخص اگر کسی گناہ کے ارتکاب میں اپنی ناواقفیت کی وجہ سے معذور سمجھا جائے تو کچھ عجب نہیں مگر عالم چونکہ جان بوجھ کر گناہ کر رہا ہے اس لئے وہ معذور نہیں ہو سکتا' چنانچہ سب جانتے ہیں کہ قانون دان شخص کا جرم عام لوگوں کے جرم سے بڑھا ہوا ہوتا ہے' پس تعجب ہے کہ عالم ہو کر جاہل بن گیا اور باوجود اس کے اپنی جہالت سے بے خبر ہے اسی کا نام جہلِ مرکب ہے۔ یاد رکھو کہ جس علم سے تکبّر پیدا ہو وہ علم جہل سے بھی بدتر ہے کیونکہ حقیقی علم انسان کو جتنا بھی زیادہ حاصل ہو گا اسی قدر اس کا خوف بڑھے گا' اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ حکم فرمایا کہ اپنے تمبع مسلمانوں کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کی زبان پر ہی رہے گا نہ حلق سے نیچے اترے گا اور نہ دل تک اس کا اثر پہنچے گا لوگوں سے کہیں گے کہ ہم قاری ہیں ہم عالم ہیں ہمارے برابر دوسرا نہیں۔ سن تو لو یہ لوگ دوزخ کا ایندھن ہوں گے سلف صالحین کے حالات دیکھو ایک مرتبہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نماز میں امام بنے اور سلام پھیر کر فرمانے لگے کہ بھائیو! اپنے لئے کوئی دوسرا امام تلاش کر لو یا علیحدہ علیحدہ نماز پڑھ لیا کرو' میں امامت کے لائق نہیں ہوں کیونکہ اس وقت میرے نفس میں یہ خطرہ آیا کہ چونکہ میرے برابر ساری جماعت میں کوئی شخص نہ تھا لہٰذا مجھے امام تجویز کیا گیا۔

یاد رکھو کتنا بڑا عالم کیوں نہ ہو یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا خاتمہ بخیر ہی ہو اور کیسا ہی جاہل کیوں نہ ہو یہ یقین نہیں ہے کہ اس کا انجام بخیر نہ ہو اور بری حالت میں مرے۔ جب عالم ہو کر اتنا سمجھتے ہو تو پھر تکبّر کس بنا پر کرتے ہو کیا علم پر عمل کرنا تم پر فرض نہیں ہے؟ حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ قیامت کے دن عالم لایا جائے گا اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس کی آیتیں اس کے گرد اس طرح گھومتی

ہوں گی جس طرح چکی کے گرد گدھا گھومتا ہے یا کولھو کا بیل چکر لگاتا ہے' لوگ تعجب کے ساتھ پوچھیں گے کہ آپ یہاں کیسے آئے وہ کہے گا کہ میں اپنے علم پر عمل نہ کرتا تھا' دوسروں کو نصیحت کیا کرتا تھا مگر اپنی خبر نہ لیتا تھا۔ اے اللہ عزّوجلّ! ہمیں اس سے محفوظ رکھ (آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم) دیکھو اللہ عزّوجلّ نے بلعم باعور (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا ایک عالم) کو جو بڑا زبردست عالم تھا' اس کتے کی مثل فرمایا ہے جو زبان باہر نکال دے اور علمائے یہود کو گدھا فرمایا ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں اور یہ اسی لئے کہ وہ شہواتِ نفسانی میں گرفتار تھے تکبّر کرتے اور خود کو بڑا سمجھتے تھے۔ دوسروں کو نصیحت کرتے تھے اور خود غافل تھے پس ان واقعات اور احادیث میں خود غور کرو گے تو تکبر جاتا رہے گا اور اگر اس پر بھی نہ جائے تو سمجھو کہ بے فائدہ علوم یعنی منطق و فلسفہ اور مناظرہ وغیرہ کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہنے کا ثمرہ ہے یا اپنی خباثت باطنی کا اثر ہے کہ اس کی وجہ سے دوا نفع نہیں دیتی بلکہ الٹا ضرر بڑھاتی ہے۔ پس ان کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کرو۔

(ii) تقویٰ پر تکبّر اور اس کا علاج

تکبّر کی دوسری وجہ تقویٰ اور پرہیز گاری ہے چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ عابد بھی اکثر تکبّر کرنے لگتا ہے اور بعض کی تو یہاں تک حالت ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو ایذا پہنچانے کو اپنی کرامت سمجھنے لگتے ہیں' مثلاً اگر کسی شخص سے ان کو ایذا پہنچے تو جھلا کر کہتے ہیں کہ دیکھتے رہو اللہ تعالیٰ اس کو کیسی سزا دیتا ہے اس نے ہم پر ظلم کیا ہے مگر عنقریب سزا بھی ایسی ملے گی کہ یاد رکھے گا' اس کے بعد اگر تقدیر سے وہ شخص بیمار پڑ گیا یا مر گیا تو اپنے دعویٰ کا ثبوت بھی پیش کرتے اور خوش ہو کر کہتے ہیں کہ دیکھا اللہ کے فقیر بندوں کو ایذا دینے کا کیسا نتیجہ رہا' اس احمق سے کوئی پوچھے کہ کافروں نے انبیاء کرام علیہم السلام کو ہزارہا ایذا پہنچائیں' مگر کسی نے بھی انتقام کا فکر نہیں کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایذا دینے والے کفار مشرف بایمان ہو گئے اور دنیا و آخرت کی بہبودی سے دامنوں کو بھر لیا' اگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنے دشمنوں سے انتقام لیتے یا ان کا مرجانا چاہتے تو بھلا اللہ تعالیٰ کی مخلوق کیوں کر ہدایت پاتی' کیا کوئی

عابد ولی کسی نبی سے بڑھ سکتا ہے' استغفراللہ' عابد کو ہر شخص کے سامنے تواضع کرنی چاہئے مثلاً کسی عالم گنہگار کو دیکھے تو اس کے سامنے علم کی وجہ سے جھک جائے اور اس کے گناہ کا خیال نہ کرے' کیونکہ علم کی بڑی فضیلت ہے اور جاہل فاسق کو دیکھے تو یوں سمجھے کہ کیا خبر ہے' شاید اس کی باطنی حالت مجھ سے بدرجہا بہتر ہو اور اس میں کوئی ایسی محدود صفت ہو جو اس کے ظاہری گناہوں کو چھپا لے اور میرے اندر کوئی ایسی خباثت ہو جس کے باعث میری ظاہری عبادتیں ضبط ہو جائیں۔ اللہ عزّوجلّ تو دلوں کو دیکھتا ہے صورت کو نہیں اور کسی کے دل کا حال سوائے علام الغیوب کے دوسرے کو معلوم نہیں پھر تکبّر کیسا؟ علاوہ ازیں خود تکبر بھی تو ایک باطنی خباثت ہے پس اپنی حالت کا بدتر ہونا تو خود ظاہر ہو گیا کہ اپنے اندر تکبّر موجود ہے اور وہ شخص جو فاسق نظر آ رہا ہے۔ تکبّر سے خالی ہے بنی اسرائیل کا ایک شخص ایک مرتبہ ایک عابد کے پاس اس نیت سے آبیٹھا کہ اللہ عزّوجلّ اس کی برکت سے مجھ پر بھی رحم فرما دے گا۔ اس کو پاس بیٹھا کر عابد اپنے دل میں کہنے لگا کہ مجھے اس سے نسبت کیا' کہاں یہ اور کہاں میں اس کے بعد اس سے کہا کہ جاؤ دور رہو' اسی وقت اس زمانہ کے پیغمبر پر وحی نازل ہوئی کہ ان دونوں سے کہہ دو کہ از سرنو عمل کریں کہ پہلا کیا کرایا برا تھا یا بھلا دونوں کو حبط کر دیا گیا کہ فاسق کے گناہ محو ہو گئے اور عابد کی نیکیاں مٹ گئیں اب آئندہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے اسی طرح ایک گستاخ شخص ایک عابد کی گردن پر سجدہ کی حالت میں آسوار ہوا۔ عابد نے غصّہ ہو کر کہا واللہ دفع ہو اللہ تیری کبھی مغفرت نہیں کرے گا اسی وقت الہام ہوا کہ اے متکبّر تیری مغفرت کبھی نہ ہو گی' کیا میری مغفرت تیرے ہاتھ میں ہے' کہ قسم کھا کر پختگی کے ساتھ ہمارے ایک بندہ کو اس سے ناامید بناتا ہے۔ حضرت عطا سلمی رحمتہ اللہ علیہ باوجود نہایت درجہ متقی اور عابد و زاہد ہونے کے جب کبھی تیز ہوا چلتی یا بادل گرجتا تو یوں فرمایا کرتے تھے کہ مجھ بدنصیب کی وجہ سے لوگوں پر مصیبت نازل ہوتی ہے' پس اگر عطا مرجائے تو ان مصیبتوں سے لوگوں کو خلاصی مل جائے' دیکھو اس اخلاص اور کثرتِ عبادت پر ان کو کس قدر تواضع اور اللہ تعالیٰ کا خوف تھا اور اس زمانہ میں تو

یہ حالت ہے کہ دو چار ظاہری اعمال پر نازاں ہوتے اور اللہ تعالیٰ پر احسان جتاتے اور اس کی حکومت و سلطنت جبروتی کی باگ اپنے ہاتھ میں لینی چاہتے ہیں کہ کسی کو ماریں، کسی کو جلائیں، حالانکہ ان عبادتوں میں ریا کا احتمال جدا ہے اور انجام و خاتمہ کا خطرہ الگ۔

(iii) حسب و نسب پر تکبّر اور اس کا علاج:-

خود کو اعلیٰ یا شریف خاندان کا فرد سمجھ کر تکبر کرنا حسب و نسب پر تکبر کہلاتا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے نسب پر غور کرو کہ وہ کیا چیز ہے ظاہر ہے کہ ہر شخص کا نسب اس کے باپ کا ناپاک نطفہ اور ذلیل مٹی ہی تو ہے کہ ہر شخص اسی سے پیدا ہوا ہے، پس دوسروں کے خصائل اور غیروں یعنی باپ دادا کی خوبیوں پر ناز کرنا کیسی غلطی کی بات ہے اگر آبا و اجداد کو گویائی مرحمت ہو تو یقیناً وہ بھی کہیں کہ صاحبزادہ دوسروں کے محاسن پر فخر کرنے والا تو کون، تو تو ان کے پیشاب کا کیڑا ہے۔ جنہوں نے قابلِ فخر کام کئے تھے، پس پیشاب کے کیڑے اور ناپاک نطفہ کو تو اپنی اصلیت دیکھنی چاہئے نہ کہ آبا و اجداد کے قابلِ تعریف اور بہادرانہ کام کہ میرے باپ ایسے بہادر تھے، اور دادا ایسے سخی تھے پھر اگر دنیا داروں کے نسب پر تکبّر اور فخر کیا جائے تب تو حماقت کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں، کیا خبر ہے کہ وہ نسب کہاں گئے ممکن ہے کہ جہنم کا کوئلہ بن گئے ہوں اور آرزو کرتے ہوں کہ کاش کتے اور سور پیدا ہوتے تاکہ اس مصیبت سے نجات ملتی، پس ان کی حالت تو ایسی اندیشہ ناک اور ان کے صاحبزادے دنیا میں ان کی اولاد ہونے پر ناز کریں اور اگر دیندار اور تواضع کی بدولت ہوا تھا، سو جب وہ اپنی دینداری پر خود ہی متکبّر نہ تھے تو ان کی اولاد کس عزت و شرافت پر تکبر کرتی اور ان کی ناخلف اولاد قرار پاتی ہے دیندار آبا و اجداد کا تو یہ حال تھا کہ وہ بعض وقت انجام و خاتمے کے خوف سے لرز اٹھتے اور تمنائیں کیا کرتے تھے کہ کاش گھاس ہوتے کہ کوئی جانور چر لیتا کاش پرند ہوتے کہ کوئی شکاری جانور یا انسان کھا لیتا۔ بھلا جن کو علم و عمل دونوں حاصل تھے وہ تو تکبّر سے کوسوں بھاگتے تھے اور تم باوجودیکہ دونوں صفتوں سے بے بہرہ ہو محض ان کی اولاد ہو کر نسب پر فخر کرتے اور متکبّر بنے جاتے

ہو۔

(iv) مال و جمال پر تکبّر اور اس کا علاج:-

مال و دولت اور حُسن و جمال پر فخر کرنا بھی تکبّر ہے اور یہ سراسر حماقت ہے۔
بھلا مال جیسی ناپائیدار چیز کہ ڈاکہ پڑ جائے یا کونبھل لگ جائے تو سب جاتا رہے۔
اسی طرح حسن وجمال جیسی عارضی چیز کہ مہینہ بھر بخار آئے تو سارا حسن و جمال خاک میں مل جائے اور چیچک نکل آئے تو صورت کا روپ بدل جائے' فخر کے قابل کس طرح ہو سکتے ہیں' حسین صورت اگر اندرونی نجاستوں میں غور کرے تو اپنے ظاہری جمال پر کبھی فخر نہ کرے یاد رکھو کہ جس حسن و جمال کو بناوٹ اور آرائش کی حاجت ہے وہ ہرگز فخر کے قابل نہیں ہے۔ اگر ہر ہفتہ غسل نہ کیا جائے تو دیکھ لو بدن کے رنگ و بو کا کیا حال ہوتا ہے۔ تھوک' بول و براز جیسی نجاستوں سے سارا بدن بھرا ہوا ہے' پھر بھلا نجاست کے ڈھیر اور غلاظت کے کوڑے کو کیا زیبا ہے کہ خود کو صاحبِ جمال سمجھے اور اس پر نازاں اور متکبر ہو۔

(۹) خود پسندی

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ نفس کو پاک و صاف اور اچھا نہ سمجھا کرو اور یہ کافروں کی نشانی ہے کہ اپنے اعمال اور خود کو اچھا سمجھیں۔

سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ذیشان ہے کہ خود پسندی تباہ کر دیتی ہے کیونکہ انسان جب خود کو نیک تصور کرنے لگتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے اور سعادتِ اخروی سے محروم ہو جاتا ہے۔

حضرت بشرابن منصور رحمتہ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ نماز پڑھی اور دیر تک پڑھی' اتفاق سے ایک شخص ان کو دیکھ رہا تھا' چونکہ خود پسندی کے احتمال کا موقع تھا اس لئے نماز سے فارغ ہو کر فرمانے لگے کہ میاں میری اس حالت سے دھوکہ نہ کھانا' شیطان نے چار ہزار برس اللہ عزّوجلّ کی عبادت کی مگر انجام اس کا جو ہوا وہ سب کو معلوم ہے غرض مسلمان کی شان نہیں ہے کہ اپنی عبادت کو عبادت اور اپنی طاعت کو طاعت سمجھے کیونکہ اوّل تو قبولیت کا علم نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ عبادت واقع میں عبادت ہوئی یا یوں ہی بیکار گئی۔ دوم یہ کہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور خاتمہ کا حال کوئی جانتا نہیں کہ کس حال پر ہونا ہے۔

خود پسندی اور تکبّر میں فرق :۔

خود پسندی بھی تکبّر کی ایک شاخ ہے فرق صرف اتنا ہے کہ تکبّر میں دوسرے لوگوں سے اپنے نفس کو بڑا سمجھا جاتا ہے اور خود پسندی میں دوسرے لوگوں کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے نفس کو اپنے خیال میں کامل سمجھ لینا اور اللہ عزّوجلّ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنا حق خیال کرنا یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ سمجھنا اور ان کے زوال سے بے خوف ہو جانا خود پسندی اور عجب کہلاتا ہے۔

ناز سے کیا مراد ہے؟

اگر یہاں تک نوبت آجائے کہ اللہ عزّوجلّ کے نزدیک خود کو ذی مرتبہ اور

باوقعت تصور کرنے لگے تو یہ ناز کہلاتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اپنی دعا کے قبول نہ ہونے سے تعجّب اور اپنے دشمن کو سزا و عذاب نہ ملنے سے حیرت ہوتی ہے کہ ہم جیسوں کی دعا قبول نہ ہو اور ہمارے دشمن نیست و نابود نہ ہوں' یاد رکھو کہ اپنی عبادت و ریاضت پر نازاں ہونا خود کو اللہ عزّوجلّ کا مقبول بندہ اور کسی قابل سمجھنا بہت بڑی حماقت ہے البتہ اگر اللہ عزّوجلّ کی نعمت پر خوش ہو اور اس کے چھن جانے کا بھی خوف دل میں رکھو اور اتنا ہی سمجھو کہ یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے فلاں علم یا عمل کے سبب مجھے مرحمت فرما دی ہے اور وہ مالک و مختار ہے جس وقت چاہے اسے مجھ سے لے لے تو یہ خود پسندی نہیں ہے کیونکہ خود پسند شخص نعمت کا منعِم حقیقی کی جانب منسوب کرنا بھول جاتا ہے اور جملہ نعمتوں کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔

خود پسندی کا علاج :۔

خود پسندی بہت بڑی جہالت ہے لہٰذا اس کا علاج کرنا ضروری ہے۔ پس اگر غیر اختیاری خوبیوں مثلاً قوت و زور یا حسن و جمال پر عجب ہو' تب تو یوں سوچو کہ ان چیزوں کے حاصل ہونے میں میرا دخل ہی کیا ہے کہ ناز کروں' اللہ تعالیٰ کا محض فضل و احسان ہے کہ اس نے بلا استحقاق یہ خوبیاں مجھے عطا فرما دیں' علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ سب خوبیاں معرضِ زوال میں ہیں' کہ ذرا سی بیماری اور ضعف لاحق ہوا تو سب جاتی رہیں گی۔ پس دوسرے کے ناپائیدار عطیہ پر عجب کیسا اور اگر عمل و علم یا زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت یعنی اختیاری افعال پر ناز ہو تو اس میں غور کرو کہ یہ کمالات اور محاسن کیونکر حاصل ہوئے اگر اللہ تعالیٰ ذہن رسا اور طاقت و ہمت' دماغ و بینائی' ہاتھ پاؤں' قصد و ارادہ مرحمت نہ فرماتا تو کوئی کمال کیونکر حاصل ہوتا' اسی کا حکم تھا کہ کوئی مانع پیش نہیں آیا ورنہ میں مجبور تھا کہ خود کچھ بھی نہ کر سکتا تھا' یہ ضرور مسلم ہے کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے جس سے وہ اچھے یا برے کام کرتا ہے مگر اختیار و ارادہ کی عطا بھی تو اسی اللہ تعالیٰ کی ہے اور پھر تمام اسباب کا مہیا کر دینا اور کامیابی دینا غرض ابتداء سے لے کر انتہا تک سب کچھ اللہ عزّوجلّ ہی کے اختیار میں ہے پس ایسی حالت میں ناز کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اگر خزانہ کی

کنجی بادشاہ کے ہاتھ میں ہو اور وہ خزانہ کھول کر تمہارے سپرد کردے اور تم اس میں سے جواہرات اپنی خواہش کے مطابق اپنی گود میں بھرلو اور پھر ناز کرنے لگو کہ میں نے اتنا روپیہ حاصل کیا تو ظاہر بات ہے کہ احمق سمجھے جاؤ گے کیونکہ اگرچہ جواہرت کے سمیٹنے والے تم تھے مگر خزانہ تو شاہی تھا اور کنجی تو بادشاہ ہی کے ہاتھ میں تھی اسی نے تم پر احسان کیا' اسی نے کنجی عطا فرمائی اور اسی کی اجازت سے تم خزانہ کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے پھر اتنی بے اختیاری پر تمہیں اپنے فعل پر ناز اور خود پسندی کیونکر درست ہو سکتی ہے۔

اعمالِ صالح پر نازاں ہونے کا علاج :۔

حیرانگی تو اس بات پر ہے کہ صاحبِ عقل اور سمجھ دار پڑھے لکھے ہوشیار لوگ اس موقع پر جاہل بن جاتے ہیں اور اپنی عقل و علم پر نازاں ہونے لگتے ہیں کہ اگر کسی جاہل و بے وقوف کو تونگر پاتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ ہم تو عاقل و عالم ہو کر مال سے محروم رہیں اور یہ جاہل و غافل ہو کر مالدار و متمول بن جائے بھلا کوئی پوچھے علم و عقل تمہیں نصیب ہوا اور جاہل اس نعمت سے محروم رہا' ایسا کیوں ہوا؟ کیا ایک نعمت کو دوسری نعمت کا سبب سمجھ کر اس پر استحقاق جتاتے ہو' اگر علم اور مال دونوں چیزیں تم ہی کو دے دی جاتیں اور جاہل فقیر دونوں سے محروم کر دیا جاتا تو یہ بات درحقیقت زیادہ تعجب کی تھی کہ مخلوق میں ایک کو تو سب کچھ مل گیا اور دوسرے کو کچھ بھی نہ ملا۔ بھلا کوئی بادشاہ تمہیں گھوڑا مرحمت فرما دے اور دوسرے شخص کو غلام دیدے تو کیا یوں کہنے کی تمہیں ہمت ہے کہ واہ صاحب اس کو غلام کیوں دیا گیا' اس کے پاس گھوڑا تو ہے ہی نہیں اور میں چونکہ گھوڑا رکھتا ہوں' لہٰذا غلام بھی مجھ ہی کو ملنا چاہئے تھا ایسا خیال کرنا بڑی بے وقوفی اور جہالت کی بات ہے' عقل مندی کی بات یہی ہے کہ عطائے الٰہی پر شکر ادا کرو اور جان لو کہ اللہ عزوجل کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ابتداء بلا استحقاق مجھ پر کرم فرمایا اور عقل و علم جیسی نعمت بخشی جس کے مقابلہ پر مال کی کوئی حقیقت ہی نہیں اور پھر شکر گزاری و عبادت کی توفیق مرحمت فرمائی' اور دوسروں کو اس سے محروم رکھا حالانکہ یہ محرومی

بھی کسی جرمِ سابق کی سزا یا قصور کا بدلہ نہیں ہے' پس جب ایسا خیال کرو گے تو خوف الٰہی پیدا ہو گا اور سمجھو گے کہ جس نے بلااستحقاق انعام فرمایا ہے' وہ اگر بلاقصور اس نعمت کو چھین بھی لے تو کوئی چون و چرا نہیں کر سکتا اور کیا خبر ہے کہ یہ نعمت مکر اور استدراج ہو اور وبالِ جان اور عذاب کا سبب بن جائے کیونکہ اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ ہم نے ان پر ہر نعمت کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہو گئے اور پھولے نہ سمائے تو یکایک ان کو پکڑ لیا' جب یہ خیالات ذہن نشین ہوں گے' خشیت اور خوف تم سے کسی وقت بھی دور نہ ہو گا اور کسی نعمت پر نازاں اور خوش نہ ہو گے' پس عجب سے باآسانی نجات مل جائے گی۔

(۱۰) ریا کاری

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ "ان نمازیوں کی خرابی ہے جو اپنی نماز سے بھولے بیٹھے ہیں وہ جو دکھاوا کرتے ہیں" اعمال میں اخلاص پیدا کرنا اور ریا کاری سے بچنا ہر مسلمان پر لازم ہے کیونکہ ریا شرک اصغر ہے۔

سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ذیشان ہے کہ بروز قیامت جب اللہ عزّوجلّ بندوں کو جزا و سزا دے گا اور انعامات عطا فرمائے گا تو ریا کاروں کو حکم دے گا کہ انہی کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو نمازیں پڑھتے اور عبادتیں کیا کرتے تھے' اپنی عبادتوں کا ثواب اور اطاعت کا صلہ بھی انہی سے لو دیکھو کیا دیتے ہیں (احمد و بیہقی) دوسری طویل حدیثِ مبارکہ میں آیا ہے کہ قیامت کے دن احکم الحاکمین کی شہنشاہی عدالت میں غازی' عالم اور سخی کی پیشی ہو گی اور تینوں اپنے جہاد فی سبیل اللہ' تعلیم اور مشغلہ علم و دین اور اپنی خیرات و صدقات کا اظہار کریں گے' حکم ہو گا کہ یہ سب اعمال تم نے چونکہ محض دکھاوے اور نام کے لئے اسی غرض سے کئے تھے تاکہ لوگ کہیں کہ فلاں شخص غازی ہے فلاں شخص بڑا عالم ہے فلاں شخص بڑا سخی ہے سو یہ باتیں حاصل ہو لیں کہ دنیا میں تمہیں شہرت حاصل ہوئی اور لوگوں نے تمہیں غازی اور سخی کہہ کر پکارا پھر جس مقصود کے لئے اعمال کئے تھے جب وہ حاصل ہو چکا تھا تو اب کیا استحقاق رہا اور یہاں کیا چاہتے ہو لہٰذا جاؤ جہنم میں۔ (مضمون مسلم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس عمل میں ذرہ برابر بھی ریا ہو گا اسے اللہ عزوجل ہرگز قبول نہ فرمائے گا۔ (اس کے حدیث ہونے میں شک ہے کیونکہ ایسا ہی ایک قول حضرت یوسف بن اسباط رحمتہ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے) اس ارشاد مبارک کو خوب غور سے سنو اور عبرت حاصل کرو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص روزہ رکھے تو اس کو چاہئے کہ اپنے سر اور داڑھی اور ہونٹوں کو تیل سے چکنا کر لیا کرے تاکہ لوگ اس کو روزہ دار نہ سمجھیں اور خیرات کیا کرے تو اس طرح کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو اور نماز پڑھے تو

پردہ ڈال لیا کرے تاکہ کوئی دیکھے نہیں، اس لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جو اپنا سر جھکائے بیٹھا تھا تنبیہہ کے طور پر یوں فرمایا تھا کہ بھائی گردن اٹھاؤ خشوع قلب سے ہوا کرتا ہے نہ کہ گردن سے "ریا کی اصلیت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنی عبادت اور عمل خیر کے ذریعہ سے وقعت اور منزلت کا خواہاں ہو اور یہ عبادات کے مقصود کے بالکل خلاف ہے کیونکہ عبادت سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہے اور اب چونکہ اس مقصود میں دوسرا شریک ہو گیا کہ رضائے خلق و حصولِ منزل مقصود ہے لہٰذا اس کا نام شرکِ اصغر ہے۔

ریا کی قسمیں :-

جان لو کہ ریا چھ طرح سے ہوا کرتا ہے۔

(i) بدن کے ذریعہ سے مثلاً شکستگی و ضعف اور غنودگی اور پلکوں کا جھپکانا ظاہر کیا جائے تاکہ روزہ دار اور شب بیدار خیال کریں یا مثلاً غمگین صورت بنائے تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کو آخرت کی بڑی فکر ہے یا مثلاً پراگندہ حال رہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ دین میں اس قدر مشغول ہیں کہ بال سنوارنے کی بھی فرصت نہیں اور نہ خط بنوانے کا موقع ملتا ہے' یا مثلاً آواز پست اور آہستہ نکالے تاکہ لوگ سمجھیں کہ ریاضت و مجاہدہ کرتے کرتے اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ آواز تک نہیں نکلتی۔

(ii) ہیئت کے ذریعہ سے مثلاً رفتار میں نرمی اور کمزوری ظاہر کرنا یا سر جھکانا' مونچھوں کا منڈوا لینا' سجدہ کے نشان کا باقی رکھنا' آنکھ کا بھینچنا اور ایسی صورت بنانا جس سے لوگ سمجھیں کہ حالتِ وجد میں ہیں یا مکاشفہ میں مشغول ہیں اور فکر کے اندر مستغرق اور محو ہیں۔

(iii) شکل و شباہت و لباس میں مثلاً صوف اور موٹے جھوٹے کپڑے پہننا پنڈلی تک پائینچہ چڑھانا' کپڑوں کا بوسیدہ اور میلا کچیلا رہنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ صوفی صاحب ہیں' حالانکہ تصوف سے اتنے کورے ہیں کہ اس میں حقیقت و ماہیت بھی نہیں جانتے' یا چوغہ یا ڈھیلی آستینوں کا جبہ پہننا تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس درجہ متقی ہیں کہ راستے کے غبار تک سے پرہیز کرتے ہیں کہ اللہ عزّوجلّ جانے کس کی ملکیت

ہو گی، پھر ان میں بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض تو وہ لوگ ہیں جو صوفیوں اور دینداروں کے دلوں میں قدر و منزلت کے طالب ہوتے ہیں اور ہمیشہ اسی نیت سے میلے کچیلے پرانے کپڑے پہنتے اور اس حالت میں رہتے ہیں کہ اگر کوئی نیا کپڑا جس کا پہننا شرعاً مباح ہو اور سلف نے بھی ایسا لباس پہنا اور استعمال کیا ہو ان کو دیا جائے کہ اس کو پہن لیجئے تو ان کو ایسا ناگوار گزرتا ہے جیسے کسی نے ذبح کر دیا اور وجہ اس کی یہی ہے کہ اس سے ان کا مطلب فوت ہوا جاتا ہے کیونکہ لوگ صاف ستھرا کپڑا پہنے دیکھیں گے تو ان کی وہ قدر نہ کریں گے جو میلے کپڑوں میں کرتے تھے بلکہ یوں کہیں گے کہ اب صوفی صاحب کے زہد میں کمی آگئی اور تصوف کا رنگ بدل چلا۔
بعض لوگ امیروں اور تاجروں میں وقعت پیدا کرنے کے خواہش مند ہوتے اور سوچتے ہیں کہ اگر پرانے پھٹے کپڑے پہنے تب تو امراء کی نظروں میں وقعت نہ ہو گی بلکہ ان کو ہمارے پاس بیٹھنے سے بھی نفرت ہو گی، اور اگر لباس فاخرہ پہنا تو لوگ زاہد اور صوفی نہ سمجھیں گے لہذا ایک نئی صورت اختیار کرتے ہیں کہ بیش قیمت باریک کپڑوں کو گیروا یا آسمانی رنگ کا رنگوا لیتے ہیں، اگر ان کی قیمت دیکھئے تو شاہانہ لباس کے برابر ہے اور رنگ و روپ ملاحظہ کیجئے تو درویشانہ صوفیانہ ہے اس طرح اپنا مطلب حاصل کرتے اور ریا کار بنتے ہیں، چنانچہ اگر ان کو پھٹے کپڑے پہننے کو دیئے جائیں اور کہا جائے کہ ان کو پہن لیجئے تو سخت ناگوار گزرتا ہے کیونکہ ایسے کپڑوں کا پہننا امیروں کی نظروں سے گر جانے کا سبب ہے اور اگر پشمینہ یا بانات یا کوئی دوسرا بیش قیمت کپڑا جو شرعاً مباح اور جائز ہو انہیں پہنایئے تو وہ بھی موت سے زائد ہے کیونکہ اس کو پہن کر لوگوں میں زاہد اور صوفی نہ سمجھے جائیں گے اور گویا درویشوں کی جماعت سے خارج ہو جائیں گے اس سے معلوم ہو گیا کہ ان کا لباس ریا کاری کا لباس ہے، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے۔

(iv) گفتگو اور زبان سے ریا کیا جائے جیسا کہ تم نے بعض دنیا دار مبلغین اور واعظوں کو دیکھا ہو گا کہ زبانیں موڑ موڑ کر مقفیٰ و مسجع عبارتیں بنا بنا کر سلف صالحین کی نقل اتارتے اور محض دکھاوے کی غرض سے کبھی آواز کا لہجہ پتلا بناتے

ہیں اور کبھی غمگین کہ دل پر اثر خاک بھی نہیں مگر بناوٹ اور تصنع یوں بتا رہا ہے کہ بڑے عالم اور صوفی ہیں کہ بالکل سلف کا نمونہ ہیں' اسی طرح مثلاً حفظ' حدیث اور مشائخ و علمائے زمانہ سے ملاقات کا دعویٰ اور اظہار کرنا کہ فلاں بزرگ کی ہم نے زیارت کی اور فلاں شیخ سے ملے یا مثلاً کسی حدیث کے متعلق صحیح یا ضعیف ہونے کا جلدی سے حکم لگا دینا تاکہ لوگ محقّق اور محدّث سمجھیں یا بدکاری و معصیت کے تذکرے پر زبان سے آہ اور ہائے افسوس کے کلمے نکالنا یا خلافِ شرع باتوں سے نفرت ظاہر کرنا اور کڑھنا حالانکہ ان کے دل میں رنج یا نفرت کا اثر نام کو بھی نہیں ہوتا بلکہ سب کچھ محض اس غرض سے ہوتا ہے کہ لوگ ان کو پارسا اور متبع شریعت سمجھیں۔

(v) عمل میں ریا مثلاً قیام زیادہ کرنا رکوع و سجدہ میں دیر تک رہنا سر جھکانا کسی طرف توجہ نہ کرنا' پلکوں کو جھکائے رکھنا وغیرہ تاکہ لوگ عابد و زاہد' باحیاء اور پارسا سمجھیں حالانکہ اللہ عزّوجلّ خوب جانتا ہے کہ ایسے لوگوں کے دل ان خوبیوں سے بالکل خالی ہیں اور اس کی شناخت یہ ہے کہ جب اکیلے نماز پڑھتے ہیں تو ایسے جیسے گھوڑا چھوڑ دیا ہو اور اگر کسی کے دیکھنے کا علم ہو جائے تو فوراً آہستگی و وقار کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر نماز پڑھنے لگتے ہیں تاکہ دیکھنے والا سمجھے کہ ان کی نماز خشوع و خضوع (عاجزی اور انکساری) سے لبریز ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ ریا نہیں تو اور کیا ہے؟

(vi) اپنے شاگردوں اور مریدوں کی کثرت کا اور مشائخ کا بکثرت تذکرہ کرنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کی بڑے بڑے مشائخ سے ملاقات ہوئی ہے اور بعض لوگ اس کے خواہاں ہوتے اور تدبیر کرتے ہیں کہ کسی طرح سلاطین و امراء و علماء و صلحاء ان کی زیارت کرنے کو آنے لگیں تاکہ ان کی شہرت ہو جائے کہ فلاں شخص ایسے بزرگ ہیں کہ ان کی خدمت میں ایسے ایسے بڑے لوگ حاضر ہوتے اور بادشاہ عالم سب ہی ان کی آستانہ بوسی کو اپنی عزت سمجھتے ہیں یاد رکھو کہ یہ سب دین میں ریا کاری ہے اور ریا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

ریا کے حرام ہونے کی وجوہات :۔

ریا کے حرام ہونے کی دو وجوہات ہیں۔

اول :۔ تو یہ ہے کہ اس میں لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنا معتقد بنانا لازم آرہا ہے اور دھوکہ دینا حرام ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی کو ایسی طرح روپیہ دے کہ دیکھنے والے یوں سمجھیں کہ اس کو ہبہ کر رہا ہے حالانکہ وہ ہبہ نہیں کرتا بلکہ اس کو قرض دیتا ہے تو چونکہ اس میں بھی دھوکہ لازم آرہا ہے اس لئے یہ بھی معصیت ہے' چہ جائیکہ بناوٹ اور تصنع کی صورت بنا کر لوگوں کے خیالات میں اس بات کا ڈالنا کہ یہ نیک اور قابلِ تعظیم ہیں اور اس طرح لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرنا سو اس کے دھوکہ ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے پھر ایسے مکار شخص کو فاسق کیونکر نہ کہا جائے۔

دوم :۔ ریا کاری اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص بادشاہ کے حضور میں خادم بن کر کھڑا ہوا اور اس کھڑے ہونے سے اس کی غرض خود کو شاہی خدمت گار اور ذلیل و محتاج غلام ظاہر کرنے کی نہ ہو' بلکہ بادشاہ کے غلاموں میں سے کسی کو تکنا یا کسی کنیز کو گھورنا مقصود ہو تو ظاہر ہے کہ وہ بادشاہ کے دربار کا گستاخ سمجھا جائے گا اور بے ادبی کا مجرم قرار پائے گا اسی طرح جب عبادت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود نہ ہوئی بلکہ اس کے بندوں کی رضا مطلوب ہوئی کہ اس کو نیک اور متقی سمجھیں اور اس کے معتقد ہوں تو گویا بندوں کو اللہ تعالیٰ کی بہ نسبت اپنے نفع اور نقصان پر زیادہ قادر سمجھا اور دل میں بندوں کی یہاں تک عظمت بٹھا لی کہ عبادت بھی انہی کے نذر گزار دی۔ ریا کو شرکِ اصغر کہا گیا ہے پھر اس غرض اور نیت میں جتنا فساد زیادہ ہو گا اسی قدر گناہ بھی زیادہ ہو گا' کیونکہ بعض ریا کاروں کا مقصود تو یہ صرف یہی ہوتا ہے کہ لوگ ہماری عزّت کیا کریں اور ہمیں مقتدا سمجھیں۔

بعض کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ لوگ ہمیں دیندار سمجھ کر ہمارے پاس امانتیں رکھیں' ہمیں اپنی اوقاف کا متولی بنائیں' یا یتیموں کے مال ہماری سپردگی میں دیں پس ان کو اپنے قبضے میں لا کر اڑانے کھانے کا موقع ملے ظاہر ہے کہ اس کا گناہ پہلے کی بہ

نسبت زیادہ ہے۔

بعض کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ ہمیں نیک بخت سمجھ کر عورتیں اور لڑکے ہمارے پاس آنے لگیں اور زنا و لواطت کرنے کا بخوبی موقع ملے یا ان ضعیف دل عورتوں' بچوں سے مال ہمارے ہاتھ آئے اور اس کو فسق و فجور اور لہو و لعب میں خرچ کر سکیں' ظاہر بات ہے کہ اس کا گناہ پہلی دونوں صورتوں سے زیادہ ہے' کیونکہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو معصیت کا آلہ اور جبّار و قہّار کی مخالفت کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ (والعیاذ باللہ)

مختلف عبادتوں میں ریا کے درجات :۔

جن عبادتوں میں ریا ہوتا ہے وہ بھی مختلف درجے کی ہیں کہ ان میں بعض کا گناہ بعض سے بڑھا ہوا ہے۔

پہلا درجہ :۔ اصل ایمان میں ریا جیسے منافق کہ اس کے دل میں ایمان تو نام کو بھی نہیں مگر اس نے اپنی صورت مسلمانوں کی سی بنا رکھی ہے تاکہ لوگ کافر سمجھ کر اس کے جان اور مال کو حلال نہ سمجھیں یا مثلاً ملحد و مرتد جس کا ایمان جاتا رہا مگر وہ کسی مصلحت یا لحاظ سے خود کو مسلمان ہی ظاہر کر رہا ہے اس ریا کا گناہ بہت سخت ہے چنانچہ قرآنِ حکیم میں مذکور ہے کہ "منافق جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے"

دوسرا درجہ :۔ اصل عبادتوں میں ریا کرنے کا ہے مثلاً لوگوں کے سامنے نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا اور اگر تنہا ہوں کہ کوئی شخص پاس نہ ہو تو نہ نماز ہے نہ زکوٰۃ' اس سے معلوم ہوا کہ یہ عبادت محض لوگوں کو دکھانے کی تھی مگر اللہ تعالیٰ تو دلوں کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ عبادت کس نیت سے ہو رہی ہے لہٰذا اس کا درجہ اگرچہ پہلے درجہ سے کم ہے مگر پھر بھی سخت اور شرکِ اصغر ہے۔

تیسرا درجہ :۔ جو سب سے ادنیٰ ہے یہ ہے کہ فرائض عبادتوں میں تو ریا نہ ہو مگر مستحب اور نوافل عبادتیں لوگوں کے دکھلانے کو کی جائیں مثلاً اگر لوگ اور موجود ہوں تو نوافل زیادہ پڑھے اور فرضوں کو بھی سنبھال کر ادا کرے جب عرفہ (۹ ذی

الحجہ) اور عاشورہ (۱۰ محرم الحرام) کا دن آئے تو اس کا روزہ بھی ضرور رکھے' اگر زکوٰۃ کا وقت ہو تو لوگوں کی موجودگی میں اس مد کے اندر عمدہ نفیس مال نکالے اور اگر سفر وغیرہ کی حالت یا خلوت و علیحدگی کا وقت ہو تو نہ نماز ٹھیک طرح ادا ہو نہ وہ نفل نمازیں قائم رہیں اور نہ نوافل روزے رکھے جائیں' فرض نماز بھی پڑھے تو کوے کی سی ٹھونگیں گویا ازبریاد ہے' اسی طرح زکوۃ تو ضرور دیتا ہے مگر سر کے اوپر سے محض بوجھ اتارنے کے لئے ردی مال سے زکوۃ دیتا ہے پس اس کا گناہ ایمان اور فرائض میں ریا کرنے کے گناہ سے کم ہے مگر یہ بھی حرام اور دین کی بربادی کے لئے کافی ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ ریا کے قصد میں تفاوت کی وجہ سے کبھی گناہ کے اندر بھی کمی بیشی ہو جاتی ہے مثلاً ایک صورت تو یہ ہے کہ عبادت سے مقصود محض دکھاوا ہو کہ عبادت کا قصد ہی نہ ہو مثلاً بلا وضو لوگوں کے دکھانے کو نماز پڑھنا یا لوگوں کے دکھاوے کو روزہ رکھنا کہ خلوت میں گئے اور افطار کر لیا پس اس کا گناہ تو نہایت ہی سخت ہے۔

ریا کی آمیزش والی عبادت کے درجات :۔

ریا کی آمیزش والی عبادت کے تین درجات ہیں۔

(i) پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مقصود محض عبادت ہے جس کی شناخت یہ ہے کہ اگر تنہا ہوتا تب بھی نماز پڑھتا' جیسے لوگوں کی موجودگی میں پڑھ رہا ہے مگر چونکہ دوسرے نے نماز پڑھتے ہوئے اس کو دیکھا ہے اس لئے طبیعت خوش ہو گئی اور نماز کا پڑھنا اس کو گراں معلوم نہ ہوا' پس اگر اتنی ہی بات ہے تب تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عبادت کو قبول فرما لے اور اس پر ثواب بھی مرحمت فرما دے باقی یہ دوسری بات ہے کہ اس کی ریا کی سزا بھی دے یا اس کی وجہ سے عبادت کے اجر و ثواب میں کمی فرما دے۔

(ii) دوسرا درجہ یہ ہے کہ عبادت کا قصد مغلوب اور دکھاوے کا خیال غالب ہو یعنی یہ حالت کہ جتنی عبادت لوگوں کی موجودگی میں کرتا ہے تنہائی اور خلوت کی حالت میں اتنی عبادت ہرگز نہیں ہو سکتی' پس یہ عبادت جس کی ریا کاری کی یہ حالت ہو

کسی طرح بھی قبول ہونے کے قابل نہیں ہے کیونکہ اس میں عبادت کا بھی اگرچہ ذرا سا قصد اور عبادت شامل ہے مگر وہ اتنا مغلوب ہے کہ اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے' لہٰذا اس کو صریح ریا کاری سمجھا جائے گا اور ایسی عبادت پر سخت عذاب کا اندیشہ ہے۔

(iii) تیسرا درجہ یہ ہے کہ عبادت اور ریا دونوں مساوی اور برابر ہیں مثلاً عبادت سے جس قدر طاعت الٰہی مقصود ہو اسی قدر لوگوں کو دکھانا بھی مقصود ہو یہ ایسی حالت ہے جس سے نفع اور نقصان چونکہ برابر ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس پر نہ عذاب ہو اور نہ ثواب ملے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جملہ شرکاء میں سب سے زیادہ شرک سے بے نیاز میری ذات ہے" لہٰذا کچھ عجب نہیں کہ اس صورت میں بھی نقصان کو نفع پر ترجیح دے کر عبادت کو باطل کہا جائے پس غیب کی خبر تو اللہ عزّوجلّ ہے کہ ایسے شخص سے کیا معاملہ ہو گا مگر بظاہر بہرحال یہ حالت گناہ سے خالی معلوم نہیں ہوتی۔

ریا جلی و خفی:۔

ریا کبھی تو جلی و ظاہر ہوتی ہے مثلاً یہ حالت کہ تنہائی میں ایسی عبادت نہیں ہوتی جیسی لوگوں کے سامنے ہوتی ہے اور کبھی خفی اور پوشیدہ ہوتی ہے مثلاً کوئی شخص تہجد پڑھتا تو ہمیشہ ہے مگر جب کوئی مہمان آجاتا ہے تو اس کے سامنے تہجد کے لئے اس کا نشاط اور مسرت زیادہ ہو جاتی ہے پس یہ بھی تو ریا ہے مگر پہلے کی نسبت اس میں پوشیدہ ہے اور اس سے زیادہ پوشیدہ وہ ریا ہے کہ کسی کے موجود ہونے سے نشاط میں بھی زیادتی نہ ہو مگر عبادت کے دوران میں یا عبادت سے فارغ ہونے کے بعد اگر کوئی شخص اس عبادت پر مطلع ہو جائے تو اس کے دل میں ایک قسم کی فرحت اور خوشی پیدا ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ دل کے اندر ریا اس طرح چھپا ہوا ہے جیسے راکھ کے اندر آگ چھپی ہوتی ہے کہ دوسروں کے مطلع ہونے پر اسی لئے تو سرور پیدا ہوتا ہے اور اس سے بھی زیادہ خفی ریا یہ ہے کہ اطلاع سے بھی خوشی نہ ہو لیکن اس کا آرزو مند رہے کہ کاش لوگ میری تعریف کریں سلام اور مصافحہ میں

ابتداء اور معاملات میں میری رعایت کریں اور اگر کوئی شخص ان کے ساتھ کچھ برائی کر بیٹھتا ہے تو اس کو تعجب ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ بھی ریا ہے کیونکہ ان خیالات اور آرزوؤں سے معلوم ہوا کہ لوگوں پر اپنی طاعت و عبادت کا احسان رکھنا چاہتا ہے اور اگرچہ لوگوں سے اس نے اپنے ریا کو چھپا رکھا ہے مگر اس کا اتنا اثر ضرور ظاہر ہے کہ توقیر اور احترام کی خواہش ہے اس قسم کے ریا بھی جن سے صدیقین ہی خالی ہوتے ہیں گناہ میں داخل ہیں اور اعمال کے ساقط ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ البتہ اگر اس عبادت پر لوگوں کے مطلع ہو جانے سے خوشی اس بنا پر ہوتی ہو کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے نیک اور عمدہ عمل ہی کا اظہار فرمایا اور ہماری کسی معصیت یا فعل قبیح پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیا محض اپنے فضل سے شانِ ستاری کا ظہور فرمایا اگرچہ میں تو طاعت ہو یا معصیت دونوں میں سے کسی کا اظہار بھی نہیں چاہتا تھا مگر خیر الحمدللہ لوگ مطلع ہوئے تو نیک عمل پر ہوئے برے عمل پر نہ ہوئے یا مثلاً اس وجہ سے خوشی ہو کہ اس عبادت پر لوگوں کے مطلع ہونے سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بھی مجھ سے اچھا ہی معاملہ فرمائے گا کیونکہ دنیا میں ستاری فرمانا علامت ہے کہ آخرت میں بھی رسوائی سے بچائے گا یا اس وجہ سے خوشی ہو کہ اس اطلاع کے سبب دوسروں کو بھی ہمت ہو گی اور میرا یہ فعل دوسروں کی عبادت کا سبب بن جائے گا تو اس قسم کی خوشی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ دوسرے شخص کی عبادت پر بھی کوئی مطلع ہو جائے تو اس اطلاع سے بھی اس کو اتنی ہی خوشی ہوتی ہو کیونکہ کسی کی عبادت دیکھ کر لوگوں کا اس عبادت میں رغبت و ہمت کرنا اپنی عبادت ہو یا دوسرے کی دونوں صورت میں حاصل ہے پس اگر مطلع ہونے والے کی اس عبادت میں رغبت و ہمت کرنے کا سوال اسی خوشی کا سبب ہوا ہو گا تو اپنا نفس اور غیر دونوں اس خوشی میں ضرور مساوی ہوں گے' چونکہ ریا کا مادہ نظر سے پوشیدہ ہوتا اور لوگوں کے دلوں پر چپکے چپکے حملہ کر کے برا اثر ڈالا کرتا ہے لہٰذا متقدمین نے اس میں بہت ہی احتیاط ملحوظ رکھی اور اپنی عبادتوں کو لوگوں کی نظروں سے بے حد مخفی رکھا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ

قیامت کے دن فقراء سے خطاب ہو گا کیا ہم نے تمہارے لئے ارزانی نہیں رکھی تھی، کیا تم اسلام میں ابتداء نہیں کرتے تھے کیا تمہاری ضرورتیں دوسروں کی بہ نسبت جلد رفع نہیں ہوتی تھیں پس چونکہ تم اپنے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں لے چکے ہو لہٰذا یہاں تمہارے لئے کچھ نہیں رہا، پس اے مسلمانو! اگر خلاصی چاہتے ہو تو لوگوں کو چوپاؤں اور بچوں کی طرح **لا یعقل** سمجھو کہ ان کا موجود ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں ان کا جاننا اور نہ جاننا ان کی واقفیت اور ناواقفیت غرض کوئی بھی قابل اعتبار نہ رہے پس چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کا جاننا کافی ہے لہٰذا اپنی عبادت اسی کو دکھاؤ کیونکہ وہی جزا دے سکتا ہے اور وہی عبادت کا قدر دان ہے باقی اس کے سوا تو دنیا اور دین میں کوئی بھی ایسا نہیں جو کسی کو کچھ بھی دے سکے اگر ایسا کرو گے تو اپنی عبادتوں میں ضرور نفع پاؤ گے ورنہ سخت ضرورت کے دن یعنی میدانِ حشر میں خالی ہاتھ رہ جاؤ گے۔

شاید تمہارا یہ خیال ہو کہ اس قسم کے خفی ریا سے تو بچنا محال ہے البتہ جلی ریا سے آدمی بچ سکتا ہے پھر نہ معلوم کون سی عبادت صحیح ہے اور کون سی فاسد لہٰذا ہم اس کی تشریح بھی کئے دیتے ہیں، عبادت میں ریا تین قسم کی ہوتی ہے۔

ریا کی صورتیں :۔

۱۔ یا تو اول ہی سے ریا موجود ہو مثلاً نماز کا پڑھنا شروع سے لے کر آخر تک سارا محض لوگوں کو دکھانے اور نمازی کہلانے کو ہو، یہ صورت تو نماز کے لئے مفسد ہے کہ ایسی نماز ہی صحیح نہ ہو گی کیونکہ اس میں عبادت کی نیت نہ ہوئی اور بلانیت کوئی عبادت معتبر نہیں ہے اور اگر کوئی شخص نماز تو جلوت ہو یا خلوت دونوں صورتوں میں پڑھتا ہے مگر اول وقت میں پڑھنا ریا کی نیت سے ہوتا ہے تو اس صورت میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرض ادا ہو جائے گا، البتہ اول وقت کی فضیلت حاصل نہ ہو گی اس لئے کہ اس میں ریا موجود ہے، اب رہی یہ بات کہ ریا کا قصد عبادت میں شامل ہوا سو اس کا گناہ جدا ہو گا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اثنائے عبادت اور تکمیلِ طاعت میں ریا ہو، مثلاً

نماز پڑھنے میں کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آگئی یا کوئی تماشا ہونے لگا تو دل للچایا کہ نماز توڑ کر ادھر متوجہ ہوتے، پس اگر ایسی حالت ہے کہ تنہائی کا موقع ہوتا اور کسی کا لحاظ مانع نہ ہوتا تو ضرور نماز کو توڑ دیتا مگر چونکہ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں اس لئے ان کی شرم اور اس خیال سے کہ دیکھنے والے یوں کہیں گے کہ دیکھو فضول مشغلہ کے لئے اس نے اپنی نماز توڑ دی، نماز کو نہ توڑے اور بادل نخواستہ پڑھے جائے تو اس نماز کو بھی باطل کہیں گے کیونکہ عبادت میں اول سے لے کر آخر تک نیت کا قائم رہنا ضروری ہے، اور جب درمیان میں ریا کی وجہ سے نیتِ عبادت جاتی رہی تو نماز بھی جاتی رہی یا مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا تھا اور لوگوں کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر اس خیال سے کہ میری عبادت پر یہ لوگ مطلع ہو گئے ہیں اس کی طبیعت کو اس قدر خوشی ہوئی کہ عبادت کی اصل نیت بالکل مغلوب ہو گئی اور نماز کا کوئی رکن ایسی حالت میں ادا ہوا جس میں لوگوں کی آگاہی کے سرور کو زیادہ دخل تھا تو غالب ہے کہ یہ نماز بھی صحیح نہیں ہوئی کیونکہ اس میں اگرچہ نیت منقطع نہیں ہوئی مگر تاہم ایسی مغلوب ہو گئی ہے کہ اس کا عدم اور وجود برابر ہے، پس اس نماز کو بھی باطل کہا جائے گا ہاں اگر ایسی معمولی خوشی ہو کہ وہ نیت پر غالب نہ آئے اور عبادت کا محرک اور اصل باعث رضائے الٰہی اور حکم الٰہی ہی رہے تو یہ نماز تو صحیح ہی ہو جائے گی، مگر قصدِ ریا کا گناہ ضرور ہو گا۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ عبادت سے فارغ ہو جانے کے بعد ریا ہو مثلاً لوگوں کے اس عبادت پر آگاہ ہو جانے سے اس کو مسرت ہو یا لوگوں سے خود ہی اس کا اظہار فخر کے انداز پر کرتا پھرے تو اس کو عبادت کے صحت اور فساد سے کوئی علاقہ نہیں اس لئے کہ جس وقت ریا ہوا ہے اس وقت عبادت ختم ہو چکی تھی، البتہ اس مسرت اور اظہار کا گناہ ہو گا اور پھر عبادت کا اظہار صراحۃً کنایۃً یا تعریضاً" جس طرح اور جس حیثیت سے ہو گا اس سے ریا کے جلی اور خفی ہونے کا اندازہ خود ہو سکے گا کہ صراحۃ" اظہار ہے تو ریا بھی جلی ہے اور اظہار اشارۃ" ہے تو ریا بھی خفی ہے۔

ریا کا علاج:۔

ریا بڑا مہلک مرض ہے اس کا علاج پوری مستعدی کے ساتھ ہونا چاہئے' یاد رکھو کہ ریا کا سبب اکثر یا تو حُبِّ مدح یعنی اپنی تعریف کی خواہش ہے یا مالِ دنیا کی حرص و طمع یا مذمت کا خوف و اندیشہ مثلاً کوئی شخص میدانِ جنگ میں اس غرض سے بہادری دکھائے کہ لوگ اس کو شجاع کہیں یا اس نیت سے عبادت کرے کہ لوگ اس کو عبادت گزار و پرہیز گار کہیں تو یہ حُبِّ مدح ہے اور اس کا علاج وہی ہے جو حب مدح کے علاج میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ شہرت اور دنیا کی نیک نامی محض فرضی اور وہمی ناقابل اعتبار کمال ہے' آج مرے کل دوسرا دن' تعریف کرنے والے اور ان کے تعریفی سپاسنامے یہیں رہ جائیں گے اور کسی سے کچھ بھی نفع حاصل نہ ہو گا۔ حقیقی کمال وہ ہے جو مرنے کے بعد بھی ساتھ رہے یعنی معرفتِ الٰہی' اس کو کبھی فنا ہی نہیں اس کے علاوہ ریا میں خصوصیت کے ساتھ یہ خیال کرنا بھی اس مرض کے لئے مفید ہے کہ یہی بہادری اور یہی شہادت جو آج مجھے لوگوں کی زبان سے شجاع اور عابد کہلا رہی ہے کل کو قیامت کے دن حشر کے میدان میں ساری مخلوق کے سامنے مجھے رسوا اور ذلیل کرائے گی کہ میرا نام فاجر و مکار اور ریا کار پکارا جائے گا' اس پر طرہ یہ کہ میرا کیا کرایا سب بیکار ہو جائے گا اور وہ اعمال جن کو بڑی محنت اور مشقّت کے ساتھ جمع کیا تھا' ضبط ہو جائیں پس لوگوں کی خوشنودی اور دنیا کی اس ناپائیدار مدح کے معاوضہ میں اللہ تعالیٰ کا غصہ اور محشر کی رسوائی اور ذلت خریدنا کس قدر عقل کے خلاف ہے علاوہ ازیں یہاں دنیا میں جن کی رضا مندی چاہتے ہو اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہم سے ان کو ناراض بھی کر دے اور مدح کے بدلے یہی لوگ ہماری الٹی مذمتیں کرنے لگیں کیونکہ قلوب اور زبانیں تو سب اس کے قبضہ میں ہیں پس چند روزہ موہوم و متحمل تعریف کو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی پر جو کہ اصل سعادت ہے کیونکر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

خوفِ مذمت کا علاج:۔

اسی طرح مذمت کا خوف ریا کا باعث ہو تو یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے کہ اگر میں اللہ عزّوجلّ کے نزدیک پسندیدہ ہوں تب لوگوں کی مذمت مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی، پھر ڈروں تو کیوں ڈروں، خصوصاً" جب کہ یہ بات یقینی ہے کہ مخلوق کو اس مذمت کے موہوم اندیشہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو ناراض رکھنا دنیا میں بھی ذلیل اور رسوا کر دیتا ہے بھلا اگر یہ باطنی ریا لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مجھے لوگوں کی مذمت سے ڈر معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے میں نیک لوگوں کی سی صورت بناتا اور پرہیزگار بنا پھرتا ہوں تو پھر اس خوف سے کچھ بھی نفع نہ ہو گا اور جس بات کا اندیشہ ہے وہ سامنے آجائے گی کہ مکاری کھلنے کی وجہ سے مذمتیں ہونے لگیں اور اگر اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کے لئے طاعت کروں تو جن لوگوں کی مذمت کا مجھے خوف ہے۔ وہ بھی میرے دوست بن جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے گی۔

حرص و طمع کا علاج:۔

ریا کا تیسرا سبب حرص و طمع ہے پس اگر یہ وجہ ہو تو خیال کرنا چاہئے کہ جس چیز کی طمع ہے اس کا حاصل ہو جانا ایک موہوم بات ہے اور اس ریا کی بدولت اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا ہاتھ سے جاتا رہنا یقینی ہے پھر بھلا کسی نفع کی موہوم امید پر اللہ تعالیٰ کے غصے کو سر پر لینا کون پسند کرتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے اس لئے یاد رکھو کہ ریا کاری سے جن دنیوی مطالب و مقاصد کے لئے عبادت کر رہے ہیں وہ بھی نہ حاصل ہو سکیں گے بلکہ مخلوق کے سامنے طمع کرنے میں ذلّت اور رسوائی جدا اٹھاؤ گے ان کے احسان مند الگ ہو گے کہ ہمیشہ گردن نیچی رہے گی اور اگر بے طمع ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری تمام ضرورتوں کا کفیل ہو جائے گا اور پھر اخلاص کی بدولت جو کچھ دائمی لذیذ نعمتیں تمہیں آخرت میں ملیں گی وہ اس کے علاوہ ہوں گی، غرض ان یقینی اور سچی باتوں کو ذہن نشین کر لو گے تو ریا کا نام و نشان بھی نہ رہے

گا اور اللہ تعالیٰ اخلاص کی توفیق بخش دے گا۔

عبادت کو مخفی رکھنے کے فائدے:۔

اس کے بعد غالباً" تمہیں یہ فکر ہو گی کہ ریا سے نفرت تو بے شک پیدا ہو گئی مگر بعض عبادتوں میں مخلوق کے مطلع ہونے پر یکایک جو ریا پیدا ہو جاتا ہے اس کا علاج معلوم نہیں ہوا' لہٰذا اس کی تدبیر بھی بتاتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے خلوت میں بیٹھ کر تنہائی کی حالت میں عبادت کیا کرو اور اپنی عبادت کو ایسا چھپایا کرو کہ جیسا اپنے عیوب اور گناہوں کو چھپایا کرتے ہو دیکھو حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ حداد کی مجلس میں کسی شخص نے ایک مرتبہ دنیا اور دنیا داروں کی مذمت بیان کی تو آپ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمارے حلقہ میں آج سے مت بیٹھا کرو' کیونکہ تم اس کے اہل نہیں اس لئے جو کام تمہیں چھپانا چاہئے تھا اس کو تم نے مجمع میں ظاہر کر دیا۔ یاد رکھو کہ عبادت کا پوشیدہ رکھنا شروع شروع میں ذرا دشوار معلوم ہو گا مگر چند روز ایسا کرو گے تو اس کی عادت پڑ جائے گی' بلکہ خلوت کی عبادت و مناجات میں لذت آنے لگے گی علاوہ ازیں اس کا لحاظ رکھو کہ جس وقت بھی اپنی عبادت پر لوگوں کی اطلاع سے دل میں مسرت پیدا ہو تو فوراً پہلی باتوں کو یاد کرو اور سوچو کہ کمزور مخلوق کا میری عبادت پر مطلع ہو جانا میرے لئے ذرہ برابر بھی نافع نہیں ہے لہٰذا اس بے نفع بات پر میرا خوش ہونا فضول اور اللہ تعالیٰ کے غصّہ کا نشانہ بن جانا بڑی خطرناک حالت ہے۔

پس جس وقت یہ خیال کرو گے تو وہ مسرت کراہت سے بدل جائے گی اور جب کراہت کا پلہ بھاری ہو گا تو عبادت اسی اخلاص کی طرف لوٹ جائے گی جو کہ مقصود ہے اور چونکہ اس سے زیادہ مضمون کے تم مکلّف بھی نہیں ہو اس لئے اگر اس پر بھی قلب میں مسرت کا اثر باقی رہے تو یہ طبعی بات ہے جس کا فکر و خیال کرنا فضول ہے کیونکہ یہ اختیاری نہیں ہے اور جو بات اختیاری نہیں ہوتی اس پر مواخذہ بھی نہیں ہوا کرتا الغرض تمہارا کام صرف اس قدر ہے کہ اپنی عبادت کو بالقصد ظاہر اور لوگوں میں شائع اور مشہور کرتے نہ پھرو اور اگر خود بخود لوگوں کو اس کی اطلاع ہو

جائے اور اس پر تمہیں مسّرت لاحق ہو تو اس کو مٹانے کی کوشش کرو کہ جس طرح ممکن ہو کراہت سے بدل لو تاکہ اس مسرت کا کسی عمل پر کوئی اثر نہ پیدا ہو اس کے بعد جو کچھ حالت رہے اب اس کا دور کرنا چونکہ تمہاری قدرت سے باہر ہے لہٰذا اس کا مطلق فکر نہ کرو۔

اظہارِ عبادت بعض جگہ مفید ہے:۔

اس نیت سے عبادت کے ظاہر کر دینے میں کچھ حرج نہیں ہے کہ لوگوں کو رغبت ہو گی اور وہ بھی میری طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے لگیں گے مگرہاں نیت کا صاف اور خالص ہونا ضروری ہے اگر نفسِ امارہ اس حیلہ سے تمہارا شکار کرنا چاہے یا اس سے کسی چھپی ہوئی خواہش کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو ہرگز اس کی جرأت نہ کرنا بلکہ عبادت کے مخفی ہی رکھنے کے پابند بنے رہنا اور اس کی علامت یہ ہے کہ عبادت کا اظہار تمہارے دل کی خواہش پر قائم رہے کہ اگر دوسرے لوگ اس بوجھ کو اٹھا لیں اور کسی دوسرے ہی کی عبادت دیکھ کر لوگوں کو رغبت پیدا ہو جائے تو بہت اچھا ہے لہٰذا دل کو ٹٹول لیا کرو کہ اس میں کیا خواہش ہے کیونکہ اگر یہ خواہش ہوئی کہ میری ہی عبادت دوسرے لوگوں کی رغبت کا ذریعہ بنے اور میں مقتدا بنوں اور مخلوق میری مقتدیٔ ہو تو بس یہی ریا اور طلب شہرت و حُبِّ جاہ ہے' کیونکہ اس صورت میں ظاہر ہے کہ اخلاص جاتا رہا اسی بناء پر اپنے گناہوں کا چھپانا اور ظاہر نہ کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس سے واقف ہو کر لوگ فاسق نہ کہیں۔

گناہوں کے مخفی رہنے پر خوش اور آشکارا ہونے پر رنجیدہ ہونے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے' عام ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی موافقت کے باعث ہو کہ وہ گناہوں کے چھپانے کو پسند اور اظہار کو ناپسند فرماتا ہے یا اپنے پر سے ایذا رفع کرنے کے سبب سے ہو کہ معصیت کے فاش ہونے پر لوگوں کو میری مذمت اور برائیاں کرنے کا موقع ملے گا اور اس سے میرے دل پر صدمہ ہو گا اور یہ صدمہ اختیاری نہیں ہے بلکہ طبیعت کا اقتضا ہے' یا اللہ تعالیٰ کی شان ستاری ہونے پر خوش ہونے کی وجہ سے ہو' بہرحال کسی نیت سے بھی کیوں نہ ہو گناہوں کے مخفی رہنے پر خوش ہونا

حرام نہیں ہے' البتہ عبادت پر اس نیت سے خوش ہونا کہ لوگ تعریف کریں گے اور متقی و عابد سمجھیں گے بے شک حرام ہے کیونکہ یہ خوش ہونا گویا عبادت کی اجرت لینا اور مخلوق کی مدح کو اپنی طاعت کا معاوضہ بنانا ہے اور یہ ناجائز ہے' اس مضمون کو دوسرے طریقہ سے یوں سمجھو کہ معصیت کے ظاہر ہونے میں عموماً" حیا اور شرم آتی ہے اور حیا چونکہ ریا نہیں ہے اس لئے اس غرض سے گناہ کا چھپانا اور اس پر خوش ہونا بھی حرام نہیں ہے برخلاف عبدیت کے اس کے ظاہر ہونے پر خوش ہونے کی وجہ بجز اس کے عبادت کا معاوضہ موہوم اور دنیائے دنی کا فائدہ قرار دیا ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں ہے لہٰذا حرام ہے' ہاں ریا کے خوف سے طاعت اور عبادت کا چھوڑنا بھی مناسب نہیں ہے بلکہ عبادت کو کرتے رہو اور اگر اس میں ریا پیدا ہو تو اس کے دور کرنے کی کوشش رکھو' البتہ اگر ایسے کام جن کا مخلوق سے تعلق ہو مثلاً نماز میں امام بنانا یا مقدمات میں قاضی یا پنچ قرار پانا یا قضاء یا تبلیغ کرنا اگر ان امور میں ریا کا غالب اندیشہ ہو کہ نفس ضرور شرارت کرے گا اور نیت میں اخلاص بالکل قائم نہ رہے گا' تو بے شک ان کاموں سے بھاگنا چاہئے کیونکہ سلف کا یہی طرز تھا اور ضرور اسی میں بہتری ہے۔

ریا کے اندیشہ سے معمولات ترک نہ کرنے چاہئیں :۔

اب رہے نماز' روزہ اور صدقات وغیرہ کے اعمال سو ریا کے اندیشہ سے ان کو ترک کرنا جائز نہیں' البتہ اگر بالکل ہی اخلاص نہ ہو اور اول سے آخر تک رضائے الٰہی اور عبادتِ الٰہی کی قطعی نیت نہ ہو اپنے جیسی محتاج مخلوق کو دکھانے کے لئے یہ کام کئے جائیں تو اس وقت ان کا کرنا بھی حرام اور چھوڑ دینا اولیٰ ہے اور اگر کسی نیک کام کے تم عادی و پابند ہو اور اتفاق سے لوگ جمع ہو جائیں تو اس وقت ریا کے احتمال کی وجہ سے اپنے معمول کو ترک مت کرو بلکہ عادت کے موافق اپنا کام کرو اور ریا کو جہاں تک ہو سکے دفع کرو کہ پاس نہ آنے پائے۔

اس باب کی ضروری ہدایات

اس باب کے اختتام پر چند ضروری باتوں کا ذکر اہمیت کا حامل ہے۔ اخلاق مذمومہ جس سے نفس کا تزکیہ کرنا ضروری ہے یوں تو بہت ہیں مگر اصول یہی دس ہیں جن کی تفصیلات کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور ان میں باہم ایسا تعلق ہے کہ ایک کے ساتھ دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا لگا ہوا ہے اس لئے جب تک سب ہی سے نجات نہ ملے گی اس وقت تک نفس قابو میں نہ آئے گا اور ایک کی اصلاح کرنا اور دوسرے سے بے روا رہنا کچھ مفید نہ ہو گا' کیونکہ جو شخص دس بیماریوں میں گرفتار ہو وہ تندرست اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ اس کی دسوں بیماریاں جاتی رہیں جس طرح کوئی خوبصورت آدمی حسین اسی وقت کہلا سکتا ہے کہ جب ہاتھ پاؤں' آنکھ' کان غرض کہ سارے اعضاء مناسب اور خوبصورت ہوں' اسی طرح انسان کو حُسنِ خلق اسی وقت حاصل ہو گا جب کہ اس کی تمام باطنی حالتیں قابلِ تعریف اور پسندیدہ ہوں بس اسی کا نام دین ہے اور اسی کی تکمیل کے لئے رسولِ اکرم علیہ الصلوۃ والسلام تشریف لائے تھے حُسنِ خلق کی تحقیق اور تجدید اور ثمرات و نتائج میں محققین کے اقوال مختلف ہیں مگر ہم اختصار کے طور پر اس کی تحقیق کرتے ہیں۔ جان لو کہ خُلق اور خلق دو مختلف لفظ ہیں۔

خلق سے مراد صورت ظاہری ہے اور خُلق سے مراد صورتِ باطنی ہے کیونکہ انسان جس طرح جسم سے ترتیب دیا گیا ہے اور ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان وغیرہ اعضاء اس کو مرحمت ہوئے ہیں جن کو قوتِ بصارت یعنی چرہ کی آنکھیں ادراک کر سکتی ہیں' اسی طرح انسان روح اور نفس سے ترکیب دیا گیا ہے اور اس کا ادراک بصیرت کی آنکھیں کرتی ہیں یہ ترکیب ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی اور ان دونوں ترکیبوں میں اللہ عزّوجلّ نے اپنی مخلوق کو جدا جدا صورتوں اور قسم قسم کی شکلوں پر پیدا فرمایا ہے کہ کوئی صورت اور سیرت حسین اور اچھی ہے اور کوئی صورت و سیرت بری اور بھونڈی ہے ظاہری شکل و ہیئت کو صورت کہتے ہیں اور باطنی شکل و ہیئت کو

سیرت کہتے ہیں ہاں سیرت کا مرتبہ صورت سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ اس کو اللہ عزّوجلّ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے چنانچہ **ونفخت فیہ من روحی** آیہ کریمہ میں روح کو اپنا فرمایا ہے اور **قل الروح من امر ربی** میں اس کا اظہار فرمایا کہ روح امر ربانی ہے اور خاکی نہیں ہے کیونکہ جسم کی نسبت مٹی کی جانب فرمائی اور **انی خالق بشرا من طین** ارشاد ہوا ہے اس مقام پر روح اور نفس سے ہماری مراد ایک ہی شئے ہے یعنی وہ شئے جو اللہ تعالیٰ کے الہام و القاء سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اشیاء کی معرفت اور ادراک حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال ثابت ہوا کہ زیادہ قابلِ لحاظ امر ربانی یعنی سیرتِ انسانی ہی ہے کہ جب تک اس باطنی ترکیب کی شکل و ہیئت میں حسن موجود نہ ہو گا اس وقت تک انسان کو خوب سیرت نہیں کہا جا سکتا۔

سیرت کے اعضاء:۔

چونکہ اس صورت کے اعضاء یعنی ہاتھ پاؤں کی سیرت کو بھی اللہ تعالیٰ نے باطنی اعضاء مرحمت فرمائے ہیں جن کا نام قوتِ علم، قوتِ غضب قوتِ شہوت اور قوتِ عدل ہے لہٰذا جب تک یہ چاروں اعضاء، سڈول اور مناسب حدِ اعتدال تک نہ ہوں گے اس وقت تک سیرت کو حسین نہ کہا جائے گا اور اسی طرح صورت جسمیہ میں کمی زیادتی ہو کہ پاؤں مثلاً گز بھر ہوں اور ہاتھ تین گز یا ایک ہاتھ مثلاً آدھ گز کا ہو اور دوسرا ہاتھ گز بھر کا تو ظاہر ہے کہ ایسا آدمی خوب صورت نہیں کہا جائے گا پس اسی طرح اگر کسی کی قوتِ غضبیہ مثلاً حد اعتدال سے کم ہے اور قوتِ شہوانیہ مناسب اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے تو اس کو خوب سیرت نہیں کہہ سکتے، اب ہم چاروں اعضائے مذکورہ کا اعتدال و تناسب اور حسن بیان کرتے ہیں۔

قوتِ علمیہ کا حسن:۔

اول قوتِ علم کا اعتدال اور حسن تو یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعہ سے اقوال کے اندر سچ اور جھوٹ میں امتیاز اور اعتقادات کے متعلق حق اور باطل میں تفریق کر سکے اور اعمال میں حسن اور قبیح یعنی اچھا اور برا پہچان سکے پس جس وقت یہ

صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو اس وقت حکمت کا وہ ثمرہ پیدا ہو گا جس کو اللہ عزّوجلّ ارشاد فرماتا ہے کہ جس کو حکمت نصیب ہوئی اس کو خیر کثیر عطا ہوئی اور درحقیقت تمام فضیلتوں کی جڑ اور اصل یہی ہے۔

قوتِ غضبیہ اور شہوانیہ کا حسن:۔

دوم و سوم قوتِ غضب و قوتِ شہوت ان کا اعتدال اور حسن یہ ہے کہ دونوں قوتیں حکمت اور شریعت کے اشارے پر چلنے لگیں اور مہذّب و مطیع شکاری کتّے کی طرح شریعت کی فرماں بردار بن جائیں کہ جس طرف بھی ان کو شریعت چلائے بلا عذر و بلا تامل اسی جانب لپکیں اور شکار پر حملہ کریں اور جس وقت وہ ان کو روکنا چاہے تو فوراً ٹھہر جائیں اور چپ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔

قوتِ عدل کا حسن:۔

چہارم قوتِ عدل' اس کا اعتدال یہ ہے کہ قوتِ غضبیہ اور شہوت دونوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے اور ان کو دین اور عقل کے اشارے کے ماتحت بنائے رکھے گویا عقل تو حاکم ہے اور یہ قوتِ عدل اس کی پیش کار ہے کہ جدھر حاکم کا اشارہ پاتی ہے فوراً اسی جانب جھک جاتی ہے اور اسی کے موافق احکام جاری کر دیتی ہے اور قوتِ غضبیہ اور شہوانیہ گویا شکاری مرد کے مہذّب کتّے اور فرماں بردار گھوڑے کی طرح ہیں کہ ان میں حاکم کا حکم اور ناصح کی نصیحت کا نفاذ اور اجر ہوتا ہے پس جس وقت یہ حالت قابلِ اطمینان اور لائق تعریف ہو جائے گی اس وقت انسان اچھی عادت والا اور خوب سیرت کہلائے گا اور اس کی بدولت انسان کے تمام اخلاق و عادات درست ہو جائیں گے۔

قوتِ غضبیہ کا اعتدال:۔

قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا نام شجاعت ہے اور یہی اللہ عزّوجلّ کے نزدیک پسندیدہ ہے کیونکہ اس میں زیادتی ہو گی تو اس کا نام تہور (بے باکی سے تباہ کرنا) ہے

اور اگر کمی ہو گی تو بزدلی کہلائے گی اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں حالتیں ناپسندیدہ ہیں' حالتِ اعتدال یعنی شجاعت، سے لطف و کرم' دلیری و جودت برداری و استقلال' نرمی اور غصّہ کے ضبط کا مادہ اور ہر کام میں دور اندیشی و وقار پیدا ہوتا ہے اور اس میں زیادتی ہوتی ہے تو ناعاقبت اندیشی' ڈینگ مارنا' شیخی بگھارنا' غصّہ سے بھڑک اٹھنا' ان سے تکبّر اور خود پسندی پیدا ہوتی ہے اور اگر اس میں کمی ہوتی ہے تو بزدلی و ذلت بے غیرتی اور وہ حرکات ظاہر ہوتی ہیں جو چھچھورا پن کہلاتی ہیں۔

قوتِ شہوانیہ کا اعتدال :۔

شہوت کی حالتِ اعتدال کا نام پارسائی ہے پس اگر شہوت اپنی حد اعتدال سے بڑھ جائے گی تو حرص و ہوا کہلائے گی' حالتِ معتدلہ یعنی پارسائی اللہ عزّوجلّ کو پسند ہے اور اس سے جو خصائل پیدا ہوتے ہیں وہ سخاوت' حیا' صبر' قناعت' اتقاء کہلاتے ہیں۔ طمع کم ہو جاتی ہے خوف و خشیت اور دوسروں کی مدد کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور حدِ اعتدال سے بڑھنے اور گھٹنے سے حرص و لالچ خوشامد و چاپلوسی امراء کے سامنے تذلل اور فقراء کو بنظرِ حقارت دیکھنا' بے حیائی' فضول خرچی' ریا' تنگ دلی' نامردانگی اور حسد وغیرہ خصائل بد پیدا ہوتے ہیں۔

قوتِ عقل کا اعتدال :۔

قوتِ عقل میں اگر اعتدال ہوتا ہے تو انسان مدبر و منتظم اور ذکی و سمجھ دار ہوتا ہے کہ اس کی رائے صائب ہوتی ہے اور ہر مضمون میں اس کی طبیعت چلتی اور جودت دکھاتی ہے اور اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو دھوکہ بازی' فریب دہی اور مکاری کہلاتی ہے اور اگر عقل کی قوت میں کسی قسم کا نقصان اور ضعف ہو گا تو کند ذہنی و حماقت اور بے وقوفی کہلائے گی' جس کا اثر یہ ہو گا کہ ایسا آدمی جلد دوسرے کے دھوکہ میں آجائے گا' غرض جس وقت یہ ساری قوتیں حد اعتدال پر ہوں گی تو اس وقت انسان کو حسن الخلق یعنی خوب سیرت کہا جائے گا کیونکہ اعتدال سے گھٹنا اور بڑھنا دونوں حالتیں حسن سے خارج ہیں **خیر الامور اوسطھا** اللہ عزّوجلّ فرماتا

ہے کہ اپنے ہاتھ گردن میں باندھ کر نہ ڈال لو کہ بخل کرو اور نہ بالکل کھول دو کہ اسراف کرنے لگو نیز فرماتا ہے کہ میرے بندوں کی یہ شان ہے کہ نہ وہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل بلکہ اس کے درمیان کی حالت پر رہتے ہیں۔

بداخلاقیوں کا علاج:۔

تمام بداخلاقیوں کی اصلاح کے لئے چونکہ ریاضت و مجاہدہ درکار ہے لہٰذا اگر کسی میں کوئی خلق برا موجود ہو تو اس کو چاہئے کہ نفس پر جبر کرے مثلاً اگر بخل کی عادت ہو تو جبراً و قہراً اس کو ترک کرے اور نفس کو ناراض کر کے خرچ کرنے کی عادت ڈالے اور اگر فضول خرچی کا خوگر ہو تو نفس کو فرضی سخاوت سے روکے اور خرچ کرنا بند کرے تاکہ صحیح خرچی کی عادت ہو جائے۔ پھر جب حالت اصلاح پر آجائے گی تو وہی درمیانی حالت پیدا ہو جائے گی جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے مگر یہ نہ سمجھنا کہ جبراً و قہراً خرچ کرنے سے سخی یا بہ تکلّف عاجزی کرنے سے متواضع کہلاؤ گے، نہیں ہرگز نہیں، سخاوت اور تواضع تو اس طبعی حالت کا نام ہے جو بلا تکلّف و بے تصنع مال کو موقع پر خرچ کرائے اور دوسروں کے سامنے انکساری کا مضمون خود بخود ظاہر کرائے نہ بہ تکلّف، ہاں یہ ضرور ہے کہ انشاء اللہ اس جبر و قہر اور تکلّف کے ساتھ خرچ کرنا یا لوگوں کے سامنے جھکانا اصل سخاوت اور تواضع کا وسیلہ بن جائے گا کیونکہ بتکلّف ایک کام کو کرتے کرتے اس کی عادت ہو جایا کرتی ہے اور جب عادت ہو جائے گی تو خصلتِ محمودہ سے دل ایسا متصّف ہو جائے گا کہ وہ عمدہ خصلتِ طبعی بن جائے گی۔

حسنِ خلق کے مراتب اور ثمرات:۔

جس طرح حُسنِ ظاہری میں کمی بیشی ہوا کرتی ہے کہ کوئی زیادہ خوب صورت ہوتا ہے اور کوئی کم، اسی طرح حسن باطنی میں بھی لوگ متفاوت ہوتے ہیں پس سب سے زیادہ خوب سیرت تو سرور عالم رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں آیہ کریمہ **انک لعلیٰ خلق عظیم** نازل ہوئی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس مسلمان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے ساتھ

جتنی مناسبت ہو گی اسی قدر اس کو حسین سیرت کہیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ سیرت باطنی میں جس قدر بھی جس کو حسن حاصل ہو گا اسی قدر اس کو سعادت اخروی حاصل ہو گی کہ کامل درجہ کا شخص معشوق اور محبوب بن جاتا ہے اور پرلے درجے کا قبیح و بدباطن شخص کمال بغض و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور درمیانی حالت میں محبت اور نفرت کے ہزارہا درجے نکلیں گے جن پر ان کی مقدار و کیفیت کی مناسبت سے ثمرات اور نتائج ہوں گے پس خوب سیرتوں اور بدسیرتوں کے افراد کی جانچ اس پیمانہ سے باآسانی کی جا سکتی ہے۔

بداخلاقی کی تشخیص :۔

انسان کو اپنے نفس کی حالت معلوم کرنے میں اکثر دھوکا ہو جاتا ہے کہ بدخلق شخص بھی کبھی اپنے آپ کو خلیق اور خوب سیرت سمجھنے لگتا ہے چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو غصّہ آجاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اللہ واسطے غصہ آیا ہے جو خوب سیرتی کے لئے ہونا ہی چاہئے یا مثلاً اپنی عبادتوں کو لوگوں پر ظاہر کرتا ہے اور نفس یہ دھوکا دے کر مطمئن بنا دیتا ہے کہ تم نے اس غرض سے عبادتوں کا اظہار کیا ہے تاکہ لوگ اس کام کی رغبت اور اس میں تمہارا اقتداء کریں یا مثلاً عابد' زاہد' متقی' پابند صوم و صلوۃ بنتا ہے اور باوجودیکہ یہ سب ریا اور دکھاوے کی نیت سے ہوتا ہے مگر نفس اس عیب کو ظاہر نہیں ہونے دیتا غرض اسی طرح یہ نفسِ امارہ بڑے بڑے دھوکے دیا کرتا اور بدحالی میں مبتلا رکھنے کے لئے اپنے آپ کو خوبی بنا کر ظاہر کیا کرتا ہے لہٰذا مناسب ہے کہ اپنی حالت کسی اپنے مخلص اور صاف گو دوست سے پوچھو کہ وہ تمہیں کیسا سمجھتا ہے چونکہ تمہاری خصلتوں اور عادتوں کا دوسرے لوگ اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں کیونکہ جن سے سابقہ اور واسطہ پڑتا رہے اور انہیں تمہارے اخلاق کے امتحان کا موقع ملے وہی اچھی طرح جانچ سکتے ہیں پس اگر تمہارے دوست کو تمہاری خیر خواہی ملحوظ ہو گی تو بلا تکلّف وہ تمہیں بتا دے گا کہ فلاں عادت تمہاری خراب ہے پس اسی کی اصلاح میں تمہیں مشغول ہو جانا چاہئے اور اگر چند عادتیں خراب ظاہر ہوں تو بڑی اور زیادہ بری کی فکر پہلے کرو اور جس کا نتیجہ زیادہ

خراب نکل رہا ہو اس کا علاج سب سے مقدم سمجھو' مثلاً دنیا کی محبت اور یہ ایسی بلا ہے کہ جس سے شاذ و نادر ہی کوئی شخص محفوظ ہو گا حالانکہ یہ دنیا گناہوں کی جڑ ہے پس اس کا علاج مقدم اور سب سے زیادہ ضروری سمجھنا چاہئے۔

دنیا کی محبت کا علاج :۔

دنیا کی محبت کا علاج یہ ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر سوچا کرو کہ آخر دنیا کی جانب مجھے اس قدر توجہ اور آخرت سے روگردانی کیوں ہے اگر تنہائی میں فکر کرو گے تو سمجھ میں آجائے گا کہ جہالت اور غفلت کے سوا اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لو کہ تمہاری عمر سو برس کی بھی ہوئی اور تمہیں تمام زمین کی سطح (اوپر کا حصہ) بھی سلطنت میں مل گئی مگر پھر کیا ہونے والا ہے؟ آخر فنا ہونا ہے عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ نہ تم رہو گے اور نہ تمہاری سلطنت و ملک رہیں گے یہ سب تو فنا ہو جائیں گے مگر اس کی بدولت ابدی سلطنت جس کے ختم ہونے کا کوئی وقت ہی نہیں تمہارے ہاتھ سے ضرور جاتی رہے گی اور ہمیشہ رہنے کی مقدار تمہارے خیال میں نہ آسکے تو یوں تصور کرو کہ تمام دنیا اس کنارہ سے لے کر اس کنارے تک اناج سے بھری ہوئی ہے اور ایک پرندہ پورے ایک ہزار برس میں اس لبریز دنیا میں سے ایک دانہ اٹھا لیتا ہے' پس اسی طرح پر ہزارہا سال میں اناج کا ایک ایک دانہ اٹھانے پر بھی ایک نہ ایک دن یہ دنیا اناج سے ضرور خالی ہو جائے گی۔ پس یہ مدت بھی جس کی ہزاروں ہزار گناہ پر تمہاری گنتی ختم ہوتی ہے' ابد اور دوام کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتی کیونکہ ابد اور دوام اس مدت سے بھی کروڑہا گنا زیادہ ہے کیونکہ وہ اتنی بے شمار مدت کا نام ہے جس کی کہیں انتہا ہی نہیں پھر بھی اس عارض اور فنا ہو جانے والی سلطنت کی جانب توجہ کرنا اور ابدی دائمی مملکت سے بے پروا اور مستغنی بننا نفس نے کیوں پسند کر لیا' پھر یہ بھی سوچو کہ ذرا سی دنیا کی معمولی تجارت میں تم کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا لیتے اور طلبِ ریاست میں کیسے کیسے دشوار سفر کر لیتے ہو' حالانکہ ان مصیبتوں اور دشواریوں کے بعد بھی مالک اور ریاست کا ملنا بالکل موہوم ہے ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی موت آجائے اور تجارت کا نفع یا سفر کا

انجام دیکھنا نصیب نہ ہو یا اگر ریاست بھی مل جائے تو ممکن ہے کہ وہ عیش و آرام و سکون و اطمینان حاصل نہ ہو جو ریاست سے مقصود ہوتا ہے بہرحال ایسی موہوم دنیوی راحت کی توقع پر بھی یہ مشکلات اور مصیبتیں گراں نہیں گزرتیں کیونکہ اپنے خیال میں جتنی عمر اپنی سمجھے ہوئے ہو اس کے مقابلہ پر تکلّف و محنت کے ایک یا دو برس کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے اور یوں خیال کرتے ہو کہ برس روز سفر میں رہنے کی تکلیف کے سبب عمر بھر کی عیش و عشرت مل جائے گی حالانکہ جو نسبت تمہاری تمام دنیا کی عمر کو ابد اور دوام کے ساتھ ہے اس کا ایک شمّہ بھی ایک برس کو تمہاری خیالی عمر کے ساتھ ہرگز حاصل نہیں ہے پھر دنیا کی زندگی کو اگر آخرت کی ابدی نعمت کے حاصل کرنے میں صرف کرو اور اس چند روزہ محنت اور تکلیف کو وہاں کی دائمی لذت کے لئے گوارا کرلو تو کیا مشکل ہے مگر کیا یہ ہو سکے گا؟

یہ سوچ کر غافل رہنا کہ اللہ عزّوجلّ کریم ہے:۔

نفس نے ایک شوشہ چھوڑ دیا اور دھوکہ میں ڈال رکھا ہے غفلت کئے جاتے ہو اور کہتے ہو کہ اللہ عزّوجلّ کریم ہے اور معاف کرنے والا ہے اور سب کچھ بخش دے گا اور برا عمل کرنے کے باوجود ہمیں جنت میں داخل کردے گا۔ بھلا میں پوچھتا ہوں کہ کھیتی اور تجارت میں ایسا کیوں نہیں خیال کرلیتے، کیا آخرت کا رب کوئی اور ہے اور دنیا کا کوئی اور؟ اور جب دونوں کا رب ایک ہی ہے تو دنیا کے کمانے کے متعلق اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر گھر میں کیوں نہیں بیٹھتے اور کیوں نہیں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے کہ جب وہ رزاق اور قادرِ مطلق ہے تو بلا محنت کئے ہوئے بھی ہمارا پیٹ بھر دے گا اور یہ امید کیوں نہیں رکھتے کہ وہ کسی ویرانے کا دبا ہوا خزانہ ہمیں خواب میں دکھا دے گا جس سے بلا محنت و مزدوری ہم خوب مالا مال ہو جائیں گے مگر افسوس ہے کہ یہاں تو یوں جواب دیتے ہو کہ معاش کے اسباب کا اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ مدفون خزانہ کا ہاتھ لگ جانا تو ایک اتفاقی امر ہے مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوا کرتا۔

ایک شیطانی فریب :۔

ایسا ہی آخرت کے متعلق بھی سمجھو کہ خراب اعمال اور بدکاریوں پر معافی و مغفرت کی توقع کرنا اس سے بھی زیادہ شاذ و نادر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ صاف فرما چکا ہے کہ ''انسان کو وہی ملے گا جو وہ کرے گا اور متقی بندے فاسق و فاجر لوگوں کی برابر نہیں ہو سکتے وغیرہ وغیرہ'' دنیا کے معاملات میں تو اسباب کے اختیار کرنے کو ضروری بھی نہیں فرمایا بلکہ ان سے بے توجہ بتایا اور یوں فرمایا ہے کہ کوئی جاندار زمین پر چلنے والا ایسا نہیں ہے کہ جس کا رزق ہمارے ذمہ نہ ہو' تو تعجب ہے کہ دنیا کمانے میں تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہیں ہے اور آخرت میں بد عملیوں کی معافی پر وثوق اور بے جا توقع رکھ کر اپنا دین برباد کر رہے ہو' خوب یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے جس نے مخلوق کو تباہ اور اعمال سے کاہل بنا کر عبادت و طاعت سے روک رکھا ہے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے (آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم)

غیب پر ایمان و یقین حاصل کرنے کا طریقہ :۔

اگر تم یہ کہو کہ چونکہ دنیوی معاملات کے نتائج تو آنکھوں سے دیکھتے اور رات دن تجربہ کرتے ہیں اور آخرت کے معاملات میں سے کوئی واقعہ بھی کسی نے مشاہدہ نہیں کیا اس وجہ سے دنیا کی تحصیل میں رغبت ہوتی ہے اور دین کی طلب میں غفلت ہے کیونکہ جس شے کو آدمی نے دیکھا نہیں اس کی واقعی تصدیق دل کے اندر نہیں ہوتی' اور یہ بھی بات ہے کہ ہر شخص نقد کو ادھار پر ترجیح دیا کرتا ہے' لہٰذا طلب دنیا میں ساری تکلیفیں برداشت کر لی جاتی ہیں اور دین کے متعلق نوافل تو درکنار اصل ارکان اور فرائض بھی ادا ہونے مشکل و دشوار پڑ جاتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے قلب کی آنکھیں روشن فرما دے اور تم صاحب بصیرت بن جاؤ تو پھر دینی امور کے انجام بھی دنیا ہی کی طرح تمہارے مشاہدے میں آجائیں گے اور اگر بصیرت حاصل نہ ہو تو بصیرت والوں یعنی انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کے ارشادات میں غور کرو اور دیکھو کہ اس بڑی جماعت میں کوئی

بھی ایسا نہیں تھا جو آخرت کی دائمی نعمت اور دائمی تکلیف کا قائل نہ ہو اور یہ یقینی بات ہے کہ آخرت کی دائمی خوشی اللہ عزّوجلّ کی طرف رجوع کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور جب تک دنیا کی طرف سے منہ نہ پھیرو گے تب تک اللہ عزوجل کی جانب توجہ کیونکر ہو گی پس جب ان باتوں کو سوچو گے تو تمہیں آخرت پر ایمان اور دل کو امورِ غیبیہ پر سکون و اطمینان حاصل ہو جائے گا کیونکہ جو شخص خود اندھا ہو اس پر لازم ہے کہ آنکھ والے شخص کا تابع ہو کر چلے کیونکہ راستہ کی اونچ نیچ اور منزلِ مقصود تک پہنچنے والی سڑک اسی کو نظر آرہی ہے بھلا اگر طب کے بارے میں تمہیں کچھ علم نہ ہو اور بیمار ہو جاؤ تو کیا ایسے حالات میں طبیب کے کہنے پر چلنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ خصوصاً" اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ جس پر تمام اطباء متفق ہوں تو اس میں تمہیں کسی قسم کا شک نہ ہو گا' پس یہی حال عقائد کا سمجھو کہ انبیاء کرام علیھم الصلوٰۃ والسلام' اولیائے کرام رحمتہ اللہ علیھم اجمعین اور تمام اہلِ بصیرت ہستیاں اور روحانی طبیب ہیں اور وہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ آخرت ضرور ہونے والی ہے اور اس چند روزہ زندگی کے نیک و بد اعمال کا بدلہ ضرور ملنے والا ہے لہٰذا اس میں شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

روحِ انسانی کی حقیقت :۔

ہاں چند آدمی ایسے بھی ہیں جو روح کی حقیقت کو سمجھے ہی نہیں کہ وہ کیا چیز ہے ان کی نظر اسی روح جسمانی تک محدود رہ گئی جس کے ذریعہ سے انسان حس و حرکت کرتا ہے یعنی وہ بخارات جو قلب سے اٹھتے ہیں اور بدن کی تمام رگوں میں پھیل جاتے ہیں پس انہوں نے اسی کو انسانی روح سمجھ لیا حالانکہ یہ روح حیوانات میں بھی موجود ہے پھر انسان اور حیوان میں فرق ہی کیا ہوا؟ خوب سمجھ لو کہ روح انسانی کی نسبت اللہ تعالٰی کی طرف ہے چنانچہ اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ "اور تم سے روح کو پوچھتے ہیں تم فرماؤ روح میرے رب کے حکم سے ایک چیز ہے" پس یہی وہ روح ہے جس کا ذکر ہم کر رہے تھے اور روحِ الٰہی کی حقیقت کو چونکہ یہ کوتاہ نظر طبیب اور منجم نہیں سمجھ سکتے لہٰذا ان کو دھوکہ ہوا اور آخرت کے منکر ہو کر دہریہ بن گئے کہ جب بدن

سے نکل گئی اور بدن کا حس و حرکت جاتا رہا تو وہ مٹی ہو کر مٹی میں مل گیا کہ نہ اس کو اب راحت کا شعور ہو سکتا ہے نہ تکلیف کا' ان کم سمجھ لوگوں کی سمجھ پر افسوس ہے کہ اول تو ایک جم غفیر کے مقابلہ پر ان چند لوگوں کا قول ہی قابل التفات نہیں ہے اور اگر کچھ ہو بھی تو میں پوچھتا ہوں کہ تم بالکل یقینی سمجھتے ہو یا تھوڑا بہت اس میں جھوٹ کا بھی احتمال ہے پس اگر جھوٹ کا احتمال ہے تو اب تم ہی بتاؤ کہ احتیاط کس بات کو چاہتی ہے؟ ظاہر ہے کہ احتیاط کا مقتضٰی یہی ہے کہ آخرت کے لئے سامان جمع کرو اور اس کی فکر کرو کیونکہ اگر مثلاً تمہیں بھوک ہو اور کھانا بھی سامنے رکھا ہوا ہے مگر کوئی شخص وثوق کے ساتھ بیان کرے کہ اس کھانے میں زہر ملا ہوا ہے اور دوسرا شخص کہے کہ نہیں، اس میں زہر نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ احتیاط کی بناء پر تم اس کھانے سے ضرور پرہیز کرو گے اور یہ سمجھو گے کہ اگرچہ اس میں زہر ہونے کا یقین نہیں ہے مگر پھر بھی اس کا شبہ اور احتمال چونکہ ضرور ہے لہٰذا ایک وقت کا بھوکا رہنا اس مشکوک کھانا کھانے سے بہتر ہے کیونکہ اس کی ایک شق میں مرجانے کا احتمال ہے اور دوسری صورت میں موت سے تو حفاظت ہے ہاں اگر ہے تو تھوڑی سی بھوک ہی کی تکلیف ہے جس کو آسانی سے برداشت کر سکتے ہیں کہ ذرا لذّت اگر حاصل نہ ہوئی نہ سہی زندگی تو باقی رہے گی اگر زندگی ہے تو سب کچھ ہی دیکھو ایک شاعر باوجود کثافت عقل کے کیا کہتا ہے اس کے عربی اشعار کا ترجمہ یہ ہے کہ منجم و طبیب نے مجھ سے کہا کہ مرجانے والے انسان دوبارہ کبھی زندہ نہ ہوں گے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ جاؤ دور رہو اور اگر تم سچے ہو تو میرا اس وقت بھی کوئی نقصان نہ ہو گا بس اتنا ہی اعمال کچھ کام نہ آئیں گے سو نہ سہی تکلیف تو نہ ہو گی اور اگر تم جھوٹے نکلے تب تو ظاہر ہے کہ میں نفع میں رہا اور خسارہ تمہیں اٹھانا پڑا کہ تم آخرت کے منکر ہونے کی وجہ سے اس کا کچھ بھی سامان ساتھ نہ لائے اور میں دنیا ہی میں اس کا فکر کر کے تیار ہو آیا تھا۔ الغرض دنیا میں رہ کر دینی امور کی سعی کرنے اور نیک اعمال کا ذخیرہ فراہم کرنے کی صورت میں تو بہرحال نفع ہی نفع ہے اور اگر تم یہ کہو کہ ہمیں تو جاہل نجومی اور زندیق طبیب کا قول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس

سے نکل گئی اور بدن کا حس و حرکت جاتا رہا تو وہ مٹی ہو کر مٹی میں مل گیا کہ نہ اس کو اب راحت کا شعور ہو سکتا ہے نہ تکلیف کا' ان کم سمجھ لوگوں کی سمجھ پر افسوس ہے کہ اول تو ایک جم غفیر کے مقابلہ پر ان چند لوگوں کا قول ہی قابل التفات نہیں ہے اور اگر کچھ ہو بھی تو میں پوچھتا ہوں کہ تم بالکل یقینی سمجھتے ہو یا تھوڑا بہت اس میں جھوٹ کا بھی احتمال ہے پس اگر جھوٹ کا احتمال ہے تو اب تم ہی بتاؤ کہ احتیاط کس بات کو چاہتی ہے؟ ظاہر ہے کہ احتیاط کا مقتضٰی یہی ہے کہ آخرت کے لئے سامان جمع کرو اور اس کی فکر کرو کیونکہ اگر مثلاً تمہیں بھوک ہو اور کھانا بھی سامنے رکھا ہوا ہے مگر کوئی شخص وثوق کے ساتھ بیان کرے کہ اس کھانے میں زہر ملا ہوا ہے اور دوسرا شخص کہے کہ نہیں' اس میں زہر نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ احتیاط کی بناء پر تم اس کھانے سے ضرور پرہیز کرو گے اور یہ سمجھو گے کہ اگرچہ اس میں زہر ہونے کا یقین نہیں ہے مگر پھر بھی اس کا شبہ اور احتمال چونکہ ضرور ہے لہٰذا ایک وقت کا بھوکا رہنا اس مشکوک کھانا کھانے سے بہتر ہے کیونکہ اس کی ایک شق میں مرجانے کا احتمال ہے اور دوسری صورت میں موت سے تو حفاظت ہے ہاں اگر ہے تو تھوڑی سی بھوک ہی کی تکلیف ہے جس کو آسانی سے برداشت کر سکتے ہیں کہ ذرا لذّت اگر حاصل نہ ہوئی نہ سہی زندگی تو باقی رہے گی اگر زندگی ہے تو سب کچھ ہی دیکھو ایک شاعر باوجود کثافت عقل کے کیا کہتا ہے اس کے عربی اشعار کا ترجمہ یہ ہے کہ منجم و طبیب نے مجھ سے کہا کہ مرجانے والے انسان دوبارہ کبھی زندہ نہ ہوں گے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ جاؤ دور رہو اور اگر تم سچے ہو تو میرا اس وقت بھی کوئی نقصان نہ ہو گا بس اتنا ہی اعمال کچھ کام نہ آئیں گے سو نہ سہی تکلیف تو نہ ہو گی اور اگر تم جھوٹے نکلے تب تو ظاہر ہے کہ میں نفع میں رہا اور خسارہ تمہیں اٹھانا پڑا کہ تم آخرت کے منکر ہونے کی وجہ سے اس کا کچھ بھی سامان ساتھ نہ لائے اور میں دنیا ہی میں اس کا فکر کر کے تیار ہو آیا تھا۔ الغرض دنیا میں رہ کر دینی امور کی سعی کرنے اور نیک اعمال کا ذخیرہ فراہم کرنے کی صورت میں تو بہرحال نفع ہی نفع ہے اور اگر تم یہ کہو کہ ہمیں تو جاہل نجومی اور زندیق طبیب کا قول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس

میں جھوٹ کا مطلق احتمال نہیں تمام انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کو تو نعوذ باللہ دھوکہ ہو گیا پس نہ آخرت کوئی چیز ہے اور نہ ثواب اور عذاب کوئی بات ہے۔ بدقسمتی سے اگر تمہارا خیال ایسا ہو جائے تو اب تمہارا مرض لاعلاج ہے کیونکہ تمہارے مزاج کا فساد اور عقل کی کمزوری عیاں ہو گئی اور پھر بھی تم اسے عقل مندی تصوّر کرتے ہو کہ بلا دلیل ایک وہمی اور لغو بات کو یقینی بتاتے ہو ایسی صورت میں علاج اور صحت کی کیا صورت ہو سکتی ہے پس ہم بھی ایسے شخص کو نصیحت کرنے سے منہ پھیر لیں گے البتہ چلتے چلتے اتنا پھر سمجھائیں گے کہ اگر دنیا ہی تمہاری مجرب ہے اور یہیں کی راحت اور آرام کے شیدا ہو تب بھی ہمارے کہنے کے موافق ناپائیدار دنیا کے تعلقات کا کم کرنا تمہیں ضروری ہے کیونکہ جو مزہ' راحت اور آرام آزادی میں ہے وہ پابندی میں نہیں ہے پس اگر تم نفس کے پابند ہو گئے اور خواہشات و تعلقات میں جکڑے گئے تو یاد رکھو کہ ہر قسم کی ذلت و رسوائی اٹھانی پڑے گی کہ جوتیاں کھاؤ گے اور اپنی جیسی محتاج مخلوق کے آگے ہاتھ پھیلاتے اور خوشامدیں کرتے پھرو گے دیکھو دنیا کے تعلقات اور بکھیڑے ایسے برے ہوتے ہیں کہ بہت سے کافر جو آخرت پر ایمان نہ رکھتے تھے وہ بھی تو ان سے گھبرا اٹھے اور تارکِ دنیا ہو کر جوگی اور راہب بن گئے' انہوں نے بھی اتنا سمجھ لیا کہ دنیا دل لگانے کے قابل چیز نہیں ہے کیونکہ اس ناپائیدار جہان کو ایک دن چھوڑنا ضرور پڑے گا اور یہاں رہ کر جس کسی سے بھی محبت یا تعلق رکھا جائے گا وہ بہت جلد منقطع ہو جائے گا کہ یا ہم اس کو چھوڑ کر رخصت ہو جائیں گے یا وہ ہمیں چھوڑ کر روانہ ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ مفارقت کا انجام سوائے مصیبت' رنج' صدمہ اور تکلیف کے کچھ بھی نہیں ہے۔ پس جب کافروں کو آخرت کا بالکل انکار ہونے کی صورت میں دنیا کے تعلقات ترک کرنے میں راحت معلوم ہوتی ہے تو تم پھر بھی مسلمان کہلائے جاتے ہو پھر معلوم نہیں کہ ان تعلقات میں پھنسنے کو راحت کا سامان کس طرح سمجھتے ہو اور اگر کسی شخص کو دنیا کی آفتیں اور ناپائیداری بھی نظر نہ آئے اور ترکِ خواہشات و تعلقات کو عقلاً" بھی مفید نہ سمجھے کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ عزّوجلّ فرماتا

ہے "ذرھم یا کلوا ویتمعتوا"

الحمد اللہ ان چند ہدایات کے ساتھ تیسرا باب اختتام پذیر ہوا اللہ عزوجل اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس تحریر کو وسیلۂ ہدایت بنا دے۔ (آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم)

اصلاح قلب کے دس اصول

(۱) توبہ

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ "بے شک اللہ پسند کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو" سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کر لی وہ گویا بے گناہ ہو گیا (ابن ماجہ و طبرانی و بیہقی) اللہ عزّوجلّ کو بندہ کی توبہ سے جتنی خوشی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے کرو کہ اگر مثلاً کوئی شخص کسی بے آب و گیاہ اور دہشت ناک جنگل میں پہنچ جائے اور اس کی سواری مع توشہ کے جو اس پر رکھا ہوا تھا گم ہو جائے کہ وہ اس کو ڈھونڈتا تھک جائے اور اس وجہ سے کہ سواری کے بغیر نہ جنگل میں سے باہر نکل سکتا ہے اور نہ توشہ کے بغیر فاقہ کی موت سے جان بچا سکتا ہے زندگی سے مایوس ہو جائے کہ نہ پیدل چلنے کی طاقت ہے اور نہ وہاں آب و دانہ میسر آنے کی امید' اس لئے مایوس ہو کر کسی درخت کے نیچے آلیٹے اور اپنے ہاتھ پر سر رکھ کر اس فکر میں ڈوبا ہوا سو جائے کہ اب موت آیا چاہتی ہے اور پھر دفعتاً" اس کی آنکھ کھل جائے اور وہ دیکھے کہ اس کی کھوئی ہوئی سواری اس کے پاس کھڑی ہے اور کھانے پینے کا سامان جو اس پر لدا ہوا تھا وہ صحیح سلامت موجود ہے تو اس کو ایسی حالت میں اپنی زندگی سے ناامید ہونے کے بعد سرمایہ حیات ہاتھ لگنے کی وجہ سے جتنی خوشی دفعتاً" حاصل ہو گی اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو اس وقت خوشی ہوتی ہے جب کہ بندہ اس کی جانب رجوع کرتا اور اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہے' توبہ کے معنی رجوع کرنے اور بعید سے قریب کی طرف لوٹ آنے کے ہیں مگر اس کے لئے بھی ایک ابتداء ہے اور ایک انتہا ہے۔

ابتداء تو یہ ہے کہ قلبِ پُر نُورِ معرفت کی شعاعیں پھیل جائیں اور دل کو اس مضمون کی پوری گہرائی حاصل ہو جائے کہ گناہ زہرِ قاتل ہے اور تباہ کر دینے والی شے ہے اور پھر خوف و ندامت پیدا ہو کر گناہ کی تلافی کرنے کی سچی اور خالص رغبت اتنی پیدا

ہو جائے کہ جس گناہ میں مبتلا تھا اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کے لئے اس گناہ سے بچنے اور پرہیز کرنے کا مصمم قصد کر لے اور اس کے ساتھ ہی جہاں تک ہو سکے گذشتہ تقصیر و کوتاہی کا تدارک کرے جب ماضی' مستقبل اور حال تینوں زمانوں کے متعلق توبہ ہ یہ ثمرہ پیدا ہو جائے گا تو گویا توبہ کا وہ کمال حاصل ہو گیا جس کا نام توبہ کی انتہا ہے۔ توبہ کے معنی اور حقیقت سمجھنے کے بعد واضح ہو گیا ہو گا کہ توبہ ہر شخص پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مخاطب بنا کر فرماتا ہے کہ "اے ایمان والو تم سب توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ" چونکہ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کو اخروی زندگی کے لئے زہرِ قاتل اور مہلک سمجھے اور ان کے چھوڑنے کا عزم کرے اور اتنا مضمون ایمان کا جزو ہے اس لئے ہر مومن پر اس کا واجب اور ضروری ہونا تو ظاہر ہے۔

خمیرِ انسانی اور خصائلِ بد کا تعلق :-

تمام بنی نوع انسان پر توبہ کا وجوب لازم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان چار قسم کی صفات سے مرکب ہے جو کہ اس کے خمیر میں شامل ہے۔

(i) حرص و شہوت اور فسق و فجور داخل ہے جو بہائم کی خصلت ہے۔

(ii) غصہ' حسد' بغض و عداوت کا وہ مادہ اس کے اندر موجود ہے جو درندوں کی خاصیت ہے۔

(iii) مکر و فریب اور دھوکہ دہی و مکاری اس میں رکھی ہوئی ہے جو شیطانی اخلاق ہے۔

(iv) کبر و نخوت و تعلی و تفاخر حبّ مدح حکمرانی و سلطنت حکومت و شان اور غلبہ و عزت کی طلب کا مادہ اس میں موجود ہے اور یہ سب ربوبیت کی صفات ہیں۔

ان چاروں خصائل کا اپنے اپنے وقت پر غلبہ اور اثر ظاہر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے زمانہ طفولیت میں تو بہائم (چوپائے) اور حیوانات کی خصلتیں غلبہ کیا کرتی ہیں اور انسان شہوت و حرص میں گویا چوپایہ اور جانور بن جاتا ہے اس کے بعد جب نوجوانی کا زمانہ آتا ہے تو درندوں کی عادتوں کا غلبہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے پر

حسد کرتا ہے باہم عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی سے بغض ہے کسی سے عناد کسی پر غصہ آرہا ہے کسی کو ذرا خلاف طبع بات پر پھاڑے کھاتا ہے اور آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، چیختا، چلاتا اور ڈانٹتا ہے کسی کو نعمت اور خوشحالی میں دیکھتا ہے تو جلتا کلستا اور چھیننے جھپٹنے کی فکر میں طیش کھایا کرتا ہے غرض اس حالت میں وہ اس درندہ کا گویا ہم جنس بن جاتے ہیں پھر جب اس کے بعد عالم شباب کا شباب ہوتا ہے اور بدن میں قوت آجاتی ہے تو یہ بہائم و درندوں کی خصلتیں چاہتی ہیں کہ اپنی خواہشیں پوری کریں یعنی مرغوب و پسندیدہ شے کو حاصل کریں اور دشمن و ناپسندیدہ امر کو زیرِ خاک کر دیں۔ پس اس وقت شیطانی اخلاق ظاہر ہوتے ہیں اور اپنا غلبہ کرتے ہیں کہ ابھی کسی شے کی خواہش پوری ہوئی اور فریب و دھوکہ بازی نے مدد کرنے کا اقرار کیا ابھی کسی دشمن پر غصّہ آیا اور فوراً مکاری و جعل سازی نے اپنی دانائی اور ہوشیاری کو پیش کیا غرض کہ اخلاق شیطانیہ اس زمانہ میں چوپایوں کی سی عادات اور درندوں کے سے خصائل کے نفاذ میں معاون و مددگار بنتے اور انسان کو شیطانِ مجسم بنا دیتے ہیں اور جب اس میں کامیابی و ظفر اور اپنی حسبِ منشاء کاروائیوں میں فتح نظر آنے لگتی ہے تو پھر تکبر و تعلی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کی مدد کرے ہر شخص اس کا مطیع و فرماں بردار ہو جائے ہر شخص اس بڑائی و کمال کا معترف ہو، ہر شخص اس کو عقل مند اور واجب التعظیم سمجھے غرض ایسی فرعونیت ذہن میں سماتی ہے کہ "ہم چوما دیگرے نیست" کا پتلا مجسم بن جاتا ہے اور جب ان چاروں خصلتوں کا ظہور ہو لیتا ہے تو اب عقل کی قندیل اپنا منہ دکھاتی ہے جس میں ایمان کا چراغ روشن ہوتا ہے اور ان کو بھلے برے میں امتیاز کا موقع دیتا ہے اگر یہ روشنی ظاہر نہ ہو تو خصائل مذکورہ کی ظلمت و تاریکی سے نجات ملنی دشوار ہو جائے گی مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی ہے کہ قندیلِ عقل اور مشعلِ ایمانی کا نور چالیس سال کی عمر میں کمال کو پہنچتا ہے اور جو بد خصلتیں بلوغ کے وقت سے پیدا ہونے لگی تھیں۔ اب ان کی اصلیت اور حقیقت اچھی طرح کھل جاتے ہیں۔ پس جس وقت یہ نور نظر آتا ہے تو انسان کا دل گویا جنگ کا وسیع میدان ہوتا ہے جس میں اس ظلماتی لشکر یعنی چاروں

خصائل مذکورہ کی اس خدائی لشکر یعنی عقل اور نورِ ایمان کے ساتھ جنگ ہوتی ہے اور دونوں میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کو مغلوب اور اپنا تابع فرمان غلام بنا لے مگر نورِ عقل کمزور ہوا تو شیطانی لشکر فتح یاب ہو کر قلب پر مسلط ہو جاتا ہے اور دشمن سے بے خوف ہو کر قلب انسان پر قبضہ اور حکومت کرنے لگتا ہے اور اگر شیطانی گروہ پسپا ہو اور میدان جنگ عقل اور ایمان کے ہاتھ رہا تو انسان کی حالت سنور جاتی اور طبیعت مہذّب بن جاتی ہے اور چونکہ بنی آدم کی فطرت ہی اس جنگ و کارزار کی مقتضی ہے اس لئے ہر شخص کے لئے اس کا پیش آنا لازمی ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ توبہ سے کوئی شخص بھی مستغنی نہیں ہے کیونکہ اس نور عقل ہی کا نام توبہ ہے جو معرکہ کے وقت ظلماتی لشکر یعنی حیوانی و شیطانی خصائل کا مدِمقابل بنتا اور انسان کو اس پاکیزہ شریعت کا تابعدار بنانے کی کوشش کرتا ہے جس سے آخرت کی فلاح اور نجات حاصل ہوتی ہے۔

کوئی انسان کسی وقت بھی گناہ سے خالی نہیں :-

چونکہ کوئی انسان کسی وقت بھی گناہ سے خالی نہیں ہے اس لئے کوئی وقت بھی ایسا نہ ہو گا جس میں کوئی شخص توبہ سے مستغنی ہو' کیونکہ انسان کسی حال اور کسی رتبہ کا بھی ہو یہ ضروری ہے کہ یا تو اس کے اعضاء میں سے کوئی عضو کسی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہو گا یا دل سے کوئی گناہ ثابت ہو رہا ہو گا یعنی یا تو ظاہری اعضاء کسی خلافِ شرع کام میں ملوث ہوں گے یا قلب کسی مذموم خصلت میں ضرور مبتلا ہو گا کہ جس کی اصلاح کے لئے توبہ کی حاجت ہو گی اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ کوئی انسان فرشتہ سیرت اور ایسا مہذّب بن گیا کہ اس کی کوئی عادت اور کوئی خصلت بھی ایسی نہیں ہے جس کی اصلاح کی ضرورت ہو تب بھی کوئی وقت تو ایسا ضرور ہو گا جس میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے اس کو غفلت ہو گی اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب پروردگار کو بھولو تو فوراً یاد کر لو اس لئے پھر بھی اس حالت سے رجوع کرنے اور غفلت سے یاد کی طرف پلٹنے کی ضرورت ہوئی اور اس رجوع کا نام توبہ ہے۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی شخص اللہ عزّوجلّ کی یاد میں ہر آن مستغرق ہے کہ کوئی

لحظہ بھی دل غافل نہیں ہوتا اگرچہ اس درجہ استغراق دشوار بلکہ قریب ناممکن کے ہے تاہم اگر ایسا مان بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ انسان جس مقام اور جس مرتبہ میں ہے اس سے عالی مرتبہ پر پہنچنے سے پہلے پہلے پھر بھی توبہ کا محتاج ہے کیونکہ ہر مقام اور ہر مرتبہ اپنے سے عالی اور مافوق مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ناقص کہلاتا ہے اور ناقص سے باہر نکلنا اور عالی و کامل پر پہنچنا ہر شخص پر لازمی ہے پس جب تک بھی اس میں رہے گا اور جب دوسرے درجہ پر پہنچے گا تو چونکہ وہ درجہ بھی اپنے مافوق درجہ کے اعتبار سے ناقص ہے اس لئے جب تک اس سے باہر نہ نکلے اور اوپر نہ پہنچے اس وقت تک وہاں بھی توبہ کا حاجت مند ہو گا' اسی طرح سلسلہ چڑھتا رہے گا اور چونکہ مراتب قربِ الٰہی غیر متناہی ہیں یعنی کوئی مرتبہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے مافوق اور بالا کوئی دوسرا مرتبہ نہ ہو' لہٰذا کوئی حالت بھی ایسی نہ نکلے گی جس میں انسان کو نسبتاً ناقص مرتبہ میں رہنے کی وجہ سے خطاوار و عاجز اور عالی مرتبہ تک پہنچنے کے سبب توبہ کا ضرورت مند نہ کہا جائے یہی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی معصوم و بے گناہ ذات گرامی کے لئے فرماتے ہیں کہ "میں رات دن میں ستر مرتبہ توبہ اور استغفار کیا کرتا ہوں" (مسلم' نسائی ابو داؤد' احمد) ہاں یہ ضرور ہے کہ عام لوگوں کی توبہ ظاہری گناہوں سے ہوا کرتی ہے اور صالحین کی توبہ باطنی گناہوں اور مذموم اخلاق سے ہوا کرتی ہے اور متقین کی توبہ شک و شبہات کے ابتلاء سے ہوتی ہے اور محبین کی توبہ اس غفلت سے ہوتی ہے جس نے ذکر الٰہی کو کسی لحظہ میں بھلا دیا تھا اور عارفین کی توبہ اس مقام سے ہوتی ہے جس پر پہنچے ہوئے ہیں مگر اس کے مافوق دوسرا مرتبہ جس پر ان کو پہنچنا چاہئے اور چونکہ اللہ تعالٰی کے قرب کے مراتب و مقامات غیر متناہی و بے شمار ہیں اس لئے عارفین کی توبہ کی انتہا نہیں اور نہ اس کے خاتمہ کا کوئی وقت معین ہے۔

توبہ کی قبولیت کب مشکوک نہ رہے گی؟

یاد رکھو! توبہ کی جب تمام شرائط پوری ہو جائیں گی تو اس کی قبولیت میں شک نہ ہو گا کیونکہ قبول ہونے کے یہ معنی ہیں کہ انسان کے دل میں انوارِ معرفت کی

تجلیات کے قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے اور ظاہر ہے کہ انسان کا دل آئینہ کی مانند ہے جس پر خواہشاتِ نفسانیہ اور حرص و ہوا کے باعث غبار جم جاتا ہے یا گناہ کی وجہ سے سیاہی چھا جاتی ہے مگر نیک کام جو بمنزلۂ نور کے ہیں اپنی روشنی اور چمک دمک سے اس تاریکی کو دور کر کے آئینہ قلب کی صیقل کرتے رہتے ہیں اس لئے جب انسان کوئی بڑا کام کرے گا اور نادم و پشیمان ہو کر اللہ عزّوجلّ کی طرف متوجہ ہو گا تو ضرور ایسی حالت ہو گی جیسے کپڑے پر صابن لگانے سے ہوتی ہے کہ اگر صابن باقاعدہ لگایا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میل نہ اترے اسی طرح اگر دل اخلاص و توجہ کے ساتھ اللہ عزّوجلّ کی طرف متوجہ ہوا ہے تو ممکن نہیں کہ قلب میں صفائی اور تجلیات معرفت کی استعداد و قابلیت نہ پیدا ہو' ہاں بعض بزرگوں کو توبہ کے بعد قبولیت توبہ میں جو شک ہوا ہے وہ حقیقت میں قبولیت توبہ کی شرائط جمع ہونے میں شک ہوا ہے کہ نجانے تمام شرائط پوری ہوئیں یا نہیں' جیسے کوئی شخص مسہل دوا پیئے اور پھر بھی اس کو دستوں کے آنے میں شک ہو تو یہ شک دوا کے دست آور ہونے میں نہیں ہے بلکہ اس امر میں شک ہے کہ مسہل کی شرائط پوری طرح ادا ہو گئیں یا نہیں؟ یعنی دوا کے اجزاء پوری مقدار پر تھے بھی یا کم و بیش ہو گئے' موسم اور وقت اسہال کے مناسب بھی تھا یا نہ تھا اور اگر ان جملہ امور میں اطمینان ہو تو پھر دستوں کے آنے اور غلیظ و متعفن مادہ کے خارج ہو جانے میں کبھی شک نہ ہو گا۔ اسی طرح اگر توبہ کی تمام شرائط جمع ہونے کا پورا یقین ہو جائے تو پھر اس کی قبولیت میں شک ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ غرض جب ثابت ہو گیا کہ ہر شخص کو توبہ کی ضرورت ہے اور ہر فردِ بشری اس معالجہ کا محتاج ہے تو اس میں غفلت کرنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ غفلت اور ہوائے نفس ایسا مہلک مرض ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی معصیت اور گناہ کے کام پر اصرار و مداومت کرنے لگتا ہے اور ظاہر ہے کہ اصرار یعنی بار بار کرنے سے صغیرہ گناہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے پس جب اس اصرار کو چھوڑ دو گے تو اس باطنی مرض سے نجات مل جائے گی۔

مرضِ غفلت:۔

خوب یاد رکھو کہ غفلت کا باطنی مرض جاڑا' بخار' پھنسی' پھوڑا وغیرہ یعنی جسم کے ظاہری امراض سے بہت بڑھا ہوا ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

(i) اس وجہ سے کہ بدن کے امراض نظر آتے ہیں اور یہ مرض نظر نہیں آتا' اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی شخص کے چہرہ پر برص کے داغ سفید ہوں اور اتفاق سے آئینہ بھی موجود نہ ہو جس میں منہ دیکھ کر اپنا مرض معلوم کرے تو یہ مرض زیادہ خطرناک ہو گا کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرے کے کہنے کا اس کو یقین نہ آئے اور اس بے اعتباری میں اس کا مرض دن بدن بڑھتا جائے۔

(ii) اس وجہ سے کہ غفلت کے باطنی مرض کا انجام انسان نے دیکھا نہیں اور اس انجام کے نہ دیکھنے ہی کی وجہ سے اللہ عزّوجلّ کی معافی پر بھروسہ کر کے ایسا مطمئن اور بے فکر ہو بیٹھا کہ علاج کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا برخلاف بدنی امراض کے کہ ان کا نتیجہ و انجام اس کے تجربہ میں آچکا ہے اور اس لئے یہاں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہیں ہوتا بلکہ علاج میں غایت درجہ کی کوشش کی جاتی ہے' حالانکہ ظاہر ہے کہ ہر قسم کے امراض کا پیدا کرنے والا اور شفا دینے والا وہی اللہ عزّوجلّ ہے خواہ امراض جسمانی ہوں یا روحانی اور ظاہری ہوں یا باطنی۔

(iii) طبیب خود مریض بن گئے ہیں اور علماء و مبلغین خود دنیا کی محبت میں غرق ہو گئے ہیں اس وجہ سے کہ اس باطنی مرض کے طبیب مفقود ہو گئے اور یہ بات نہایت درجہ افسوس و حسرت کے قابل ہے کیونکہ اس قلبی مرض کے طبیب علماء شریعت اور عقلاء زمانہ تھے اور وہ خود باطنی بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں پھر جب ان کو اپنے ہی علاج کی خبر نہیں تو دوسروں کا علاج وہ کیا کریں گے ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ مہلک مرض دنیا اور مالکِ دنیا کی محبت ہے اور اس پُر آشوب دور میں سب سے زیادہ اس مرض میں علماء ہی گرفتار نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دوسروں کو دنیا کی محبت سے روکنے اور منع کرنے کی ان کو جرات نہیں ہوتی بلکہ اپنی رسوائی کے اندیشہ سے وہ یہ بھی نہیں ظاہر کر سکتے کہ دنیا کی محبت بری چیز اور باطنی امراض میں ایسا مہلک مرض

ہے جس سے جانبری دشوار ہے پس یہی وجہ ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہو گیا کیونکہ جب طاعون یا وبائی مرض عام طور پر پھیل جائے اور دوا کا پتہ نہ مل سکے اور طبیب خود مریض اور اسی مرض کے بیمار بنے ہوئے ہوں تو بھلا اس سے نجات کیونکر حاصل ہو' سب سے زیادہ مصیبت یہ ہے کہ ان روحانی طبیبوں یعنی علماء کی دیکھا دیکھی عوام الناس کو محبت دنیا کی رغبت بڑھ گئی اور پرہیز یا دوا و علاج کی طرف توجہ کرنے کی کوئی سبیل بھی باقی نہ رہی کیونکہ یہی وہ اصحاب ہیں جن کی تقلید کی جاتی ہے اور عام آدمی انہی کو اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہیں پس جب انہی کو محبت دنیا میں گرفتار دیکھیں گے تو پھر اس کو اچھی بات سمجھ کر کیوں نہ اقتدا کریں گے اور جب اقتدا کریں گے تو پھر اصلاح کی کیا صورت رہ جائے گی؟ افسوس کہ جن کو طبیب بنا کر دنیا میں بھیجا گیا تھا' انہوں نے بجائے علاج کے مرض کو اور بڑھا دیا جو لوگ مصلح بن کر آئے تھے وہ مفسد بن گئے اور جن کو رہبر تجویز کیا گیا وہ خود گمراہ ہو کر دوسروں کا راستہ کھوٹا کرنے کے درپے ہو گئے گویا شیریں چشمہ کے دہانہ پر پتھر رکھ کر اڑ گئے کہ نہ خود پانی پئیں نہ دوسروں کو پینے دیں اے کاش ان سے دنیا خالی ہو جائے اور یہ پتھر دہانہ سے سرک جائے۔ اگر وہ خود ناقابل ہیں تو ناقابل ہی سہی مگر چشمہ کا دہانہ کیوں روکے ہوئے ہیں؟ دور ہوں الگ ہٹیں کہ دوسرے پیاسے لوگ تو سیراب ہو جائیں غرض اس باطنی مرض کا خلاصہ علاج یہ ہے کہ سبب ڈھونڈو اور گناہ کے اصرار پر توجہ کرو کہ کیوں ہے۔

توبہ نہ کرنے کی وجوہات اور ان کے علاج :۔

جان لو کہ کسی گناہ پر جو اصرار ہوا کرتا ہے تو پانچ اسباب میں سے ایک سبب ہوا کرتا ہے۔

(i) یہ کہ گناہ پر جو سزا اللہ عزّوجلّ نے تجویز فرمائی ہے وہ گناہ کرتے ہی دست بدست نہیں ملا کرتی اور ظاہر ہے کہ جس فعل کا نتیجہ دست بدست نہیں ملا' ذہن میں اس کی واقعت نہیں ہوا کرتی لہٰذا گناہ پر اصرار ہونے لگتا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ سوچنا اور جاننا چاہئے کہ جو چیز ایک نہ ایک دن ضرور آنے والی ہے وہ قریب ہی ہے

کیونکہ بعید تو اس کو کہنا چاہیئے جو آئے نہیں اور جو ایک دن آنے والی ہے وہ بعید کہاں خصوصاً" موت کہ جس کا آنا یقینی بھی ہے اور پھر اس کا وقت بھی مقرر نہیں تو اس کے بعید ہونے کے تو کوئی معنی ہی نہیں، کیا خبر ہے کہ آج ہی کا دن آخری دن اور یہی مہینہ آخری مہینہ اور یہی سال تمہاری عمر کا آخری سال ہو، اس کی طرف سے غفلت کرنا حماقت ہے پھر یہ بھی سوچا کہ آئندہ کے افلاس کے اندیشہ سے معاش کے حاصل کرنے کی فکر میں تم کیسے دور دراز کے سفر اور مصائب برداشت کرتے ہو تو کیا آخرت کی پائیدار زندگی کا اتنا بھی فکر نہ ہو جتنا دنیا کی بہت ہی جلدی ختم ہونے والی ناپائیدار زندگی کا ہے۔

(ii) یہ کہ نفس کو اپنی مرغوب خواہشوں اور لذتوں میں مزہ آرہا ہے لہٰذا ان کا انکار چھوڑنا اسے ناگوار گزرتا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ سوچا اور غور کیا کرو کہ اگر کوئی انگریز ڈاکٹر یوں کہہ دے کہ جناب ٹھنڈا پانی آپ کے لئے نقصان دہ ہے اس لئے آپ اس کے پاس تک نہ جائیے گا ورنہ موت واقع ہو جائے گی تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ ڈاکٹر کی اس ہدایت کا تم پر کیا اثر ہو گا؟ ظاہر ہے کہ زندگی برباد ہو جانے کے خوف سے ٹھنڈے پانی جیسی لذیز نعمت بھی تم سے چھوٹ جائے گی حالانکہ یہ ایک انسان کا قول ہے اور انسان بھی کافر؟ پس اس میں جھوٹ کے بیسیوں احتمال نکل سکتے ہیں پھر بھلا رب کریم کی مضر بتائی ہوئی خواہشات کو توڑنے میں کیا تامل ہے؟ کیا اللہ عزّوجلّ اور اللہ عزّوجلّ کے سچے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد کسی کافر طبیب کے قول کے برابر بھی نہیں ہے یا جسمانی مرض سے مر جانا کیسا؟ ہمیشہ آگ میں جلنے سے بھی زیادہ تکلیف والا ہے پھر یہ بھی تو سوچا کہ جب تمہارا نفس اس قدر لذت پسند اور خواہشات کا پابند ہے کہ دنیا میں چند روز کے لئے معمولی لذتوں کا چھوڑنا بھی اس کو شاق گزرتا ہے تو یہاں ان ناپائیدار لذتوں کے حاصل کرنے کی بدولت جب آخرت کی دائمی نعمتیں چھن گئیں تو ان کے چھوڑنے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگ میں جلنے کو وہ برداشت کس طرح کرے گا۔

(iii) یہ کہ نفس نے تمہیں سُست و کاہل بنا دیا ہے اور یہ شوشہ چھوڑ دیا ہے کہ

جناب توبہ کی ایسی جلدی ہی کیا ہے آج نہیں تو کل کر لیں گے' غرض اسی طرح دن گزرتے رہتے ہیں اور توبہ کی توفیق نہیں ہوتی' اس تاخیر اور آج کل میں وقت برابر ہو جاتا ہے اور موت آجاتی ہے پس اگر گناہ پر اصرار کرنے کا باعث یہ کاہلی ہوئی تو اس مضمون کو سوچنا چاہئے کہ انجام کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ کب ہو گا' کون کہہ سکتا ہے کہ تم کل تک زندہ بھی رہو گے اور توبہ نصیب ہو جائے گی' خوب یاد رکھو کہ ایسے ہی لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے جنہوں نے توبہ کرنے کو التواء میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ موت نے آپکڑا دوسرے یہ بھی سوچنے کے قابل بات ہے کہ جب نفس کو لذت کا چھوڑنا آج دشوار ہو رہا ہے تو بھلا کل جب کہ شہوت کی لذت اور مضبوط ہو جائے گی تو نفس سے کیونکر چھوٹ سکے گی اس کی مثال تو ایسی ہو گی جیسے تمہیں کسی درخت کے اکھاڑنے کا حکم ہو جائے اور تم یوں کہو کہ جناب اس سال تو نہیں ہاں اگلے سال اکھاڑوں گا حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ درخت کی جڑ دن بدن مضبوط ہو گی اور تمہاری قوت روز بروز گھٹے گی اور کمزوری بڑھے گی پس جس درخت کو آج نہیں اکھاڑ سکے تو اس کو آئندہ سال کس طرح اکھاڑ سکو گے۔

(iv) یہ کہ نفس نے اللہ عزّوجلّ کے عفو و کرم کا آرزو مند بنا رکھا ہے اور یہ شوشہ چھوڑ دیا ہے کہ جناب اللہ تعالیٰ کو ہمارے گناہوں کی کیا پرواہ' وہ تو بڑا غفور و رحیم ہے سارے گناہ بخش دے گا۔ یاد رکھو کہ یہ نفس کی مکاری ہے کہ شیطان نے اس ڈھرہ پر چڑھا کر اپنا کام بنا لیا اور اس گھمنڈ کو اپنی کاربرآری کا آلہ گردان لیا ہے۔ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ عقل مند وہی ہے جس نے اپنے نفس کو اپنا تابعدار بنا لیا اور مرنے کے بعد کام آنے والا ذخیرہ اکٹھا کیا جبکہ احمق ہے وہ شخص جس نے خواہشات کا اتباع کیا اور پھر اللہ عزّوجلّ سے عفو و کرم کا آرزو مند رہا۔ (احمد' ترمذی' حاکم)

(v) یہ کہ معاذ اللہ قیامت کے آنے اور آخرت کے معاملات کے پیش آنے میں شک ہے اس کا علاج تیسرے باب کے آخر میں دی گئی ضروری ہدایات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ وہاں دیکھو اور اس پر عمل کرو۔

کبیرہ گناہوں سے توبہ:۔

یوں تو گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے مگر کبیرہ گناہوں سے توبہ کرنا نہایت ہی ضروری ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ صغیرہ گناہ بھی اصرار کرنے سے کبیرہ ہو جاتا ہے بلکہ صغیرہ گناہ جب بار بار کیا جاتا ہے تو ایک مرتبہ کسی کبیرہ گناہ کر لینے کی بہ نسبت دل کو زیادہ سیاہ کر دیتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سخت پتھر پر ایک ایک قطرہ کا بار بار متواتر ٹپکنا اور ایک بار کی موسلا دھار بارش کا برس جانا یہ ظاہر ہے کہ ایک قطرہ باوجودیکہ حقیر اور بہت ہی بے وقعت چیز ہے مگر بار بار پڑنے کی وجہ سے ایک نہ ایک دن پتھر میں بھی سوراخ کر دے گا برخلاف موسلا دار بارش کے کہ اگرچہ وہ کئی لاکھ قطروں کا مجموعہ ہے، مگر ایک بار کی برسنے سے اس کا وہ اثر نہ ہو گا جو ایک قطرہ نے آہستہ آہستہ کر دکھایا تھا اسی طرح چھوٹا گناہ آہستہ آہستہ دل پر جو اثر کرتا ہے وہ کبیرہ گناہ کے یکبارگی اثر کی بہ نسبت بہت ہی اندیشہ پاک ہوتا ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

(i) صغیرہ گناہ کی ذہن میں وقعت نہیں ہوتی اور اس کو معمولی گناہ سمجھ کر بے پروائی کی جاتی ہے بر خلاف کبیرہ گناہوں کے کہ اس کی بڑائی کے سبب امید ہے کہ اس سے بچنے اور باز آجانے کی طرف توجہ ہو جائے اسی بنا پر ایک بزرگ کا قول ہے کہ جس گناہ کی بخشش نہ ہو گی وہ گناہ وہ ہے جس کو بندہ معمولی سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ کاش سارے گناہ ایسے ہی ہوتے۔

(ii) صغیرہ گناہ کو بسا اوقات انسان نعمت سمجھتا اور خوش ہوتا ہے چنانچہ لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ دیکھا میں نے اس کو کیسا جواب دیا کیا بدلہ لیا' کیسی آبرو خاک میں ملا دی کیسا دھوکہ دیا اور ظاہر ہے کہ گناہ پر خوش ہونا زیادہ مضر رساں اور دل کا سیاہ کرنے والا ہے۔

(iii) اکثر اللہ عزّوجلّ کی پردہ پوشی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا اور اپنی کرامت و بزرگی سمجھنے لگتا ہے یعنی خیال کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرتبے والا شخص ہوں اسی لئے میرے گناہ ظاہر نہیں ہوئے اور یہ خبر نہیں کہ اللہ عزّ و جلّ کی طرف

سے ڈھیل دی جا رہی ہے تاکہ گناہ زیادہ ہو جائیں اور ایک دم دھر لیا جائے اوا سفل السا فلین (جہنم کے سب سے نچلے طبقے) میں جھونک دیا جائے۔

(iv) صغیرہ گناہ کو اس کے صغیرہ ہونے کی بنا پر لوگوں میں ظاہر اور شائع کرتا پھرتا ہے حالانکہ حدیث مبارکہ ہے کہ تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے مگر گناہوں کا اعلان و افشاں کرنے والے لوگ نہ بخشے جائیں گے۔ اگر کسی عالم یا صوفی یعنی مقتدا سے کوئی صغیرہ گناہ ہوتا ہے تو اس کا اثر اور بھی زیادہ برا پڑتا ہے کیونکہ عام لوگ اس کو دیکھ کر اس گناہ میں بے باکانہ مبتلا ہو جاتے ہیں اور اسی طرح گناہ کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے گویا یہ صغیرہ گناہ اتنا دراز ہو جاتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے اس کو دیکھا دیکھی جن لوگوں نے بھی اس گناہ کو اختیار کیا ہے سب کا وبال اس کے نامہ اعمال میں درج ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ باقی رہنے والا گناہ ختم ہو جانے والے گناہ سے بدتر ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس گناہ کا بقا صغیرہ ہونے کی وجہ سے ہی ہوا ہے پس خوش قسمتی اس کی جو اپنے مرنے کے ساتھ اپنے گناہ بھی دنیا سے لے جائے۔

بنی اسرائیل کے ایک عالم نے جب اپنے گناہوں سے توبہ کی تو اس زمانہ کے پیغمبر علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس کے گناہ میرے اور اس کے درمیان ہی رہتے تو میں بخش دیتا مگر اس نے تو مقتدا بن کر میرے دوسرے بندوں کو بھی گناہوں میں مبتلا کیا اور جہنم میں داخل کرایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ توبہ کرنا ہر گناہ سے ہر فرد پر ضروری ہے اور توبہ اسی وقت ہو سکتی ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو لہٰذا مناسب ہے کہ خوف کی فضیلت بیان کر دی جائے۔

(۲) خوف

اللہ عزّوجلّ کا خوف تمام اچھے اعمال کی طرف رغبت حاصل کرنے اور تمام برے اعمال سے بچنے کا ذریعہ ہے' خوف رکھنے والوں کی شان میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ "کسی بندہ کو دو خوف نصیب نہ ہوں گے" یعنی جو بندہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خوف رکھے گا وہ آخرت میں بے خوف ہو گا اور جو دنیا میں اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرے گا اس کو آخرت میں اطمینان نصیب نہ ہو گا۔

خوف کی حقیقت اور حاصل کرنے کا طریقہ :۔

خوف کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ کسی آنے والی تکلیف کے اندیشہ سے دل دکھے اور سوزش پیدا ہو اور ظاہر ہے کہ جب تک اللہ عزّوجلّ کی صفاتِ جلالیہ کی معرفت حاصل نہ ہو گی اس وقت تک خوف پیدا نہ ہو گا اور جب یہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز پر ایسا قادر ہے کہ دم بھر میں جو چاہے کرے کہ مخلوق میں کوئی شخص چوں بھی نہیں کر سکتا تو اس وقت خوف و خشیت پیدا ہو جائے گی' اگر خوف پیدا کرنا ہو تو اللہ عزّوجلّ کے جلال اور اس کی بے نیازی پر نظر کرو اور سوچو کہ جنّت پیدا اور اس میں جانے والی مخلوق بھی تجویز ہو چکی ہے اور اسی طرح دوزخ بھی موجود ہے اور اس کی سزاوار مخلوق بھی معین ہو چکی ہے اور خوش قسمتی و بدنصیبی کا قطعی حکم ہر شخص کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور اس ازلی حکم کا کوئی روکنے والا نہیں پس اے نفس معلوم ہوا کہ تیرے حق میں کیا حکم صادر ہوا ہے اور تیرا خاتمہ کس حال میں ہونا لکھا ہے ممکن ہے تو جنت میں جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیرے لئے جہنم کی دائمی سزا تجویز ہوئی ہو۔ خوب جان لے اور یاد رکھ کہ انجام کے پوشیدہ حال سے صرف وہی شخص نہیں ڈرتا جس کو حقیقی معرفت حاصل نہ ہو لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ان کاملین اور خاصان پروردگار کے حالات پڑھا اور سُنا کر جنہیں معرفت میں کمال حاصل ہوا ہے یعنی انبیائے کرام علیہم

الصلوٰۃ والسلام، علمائے کرام اور اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔ غور کر! ان نفوسِ قدسیہ کو باوجود کمال درجہ تقرب کے کس قدر خوف تھا۔ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کبھی حضرت جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام میرے پاس وحی لے کر آئے تو ربِّ جبار و قہار کے خوف سے لرزتے اور کانپتے آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا دل مبارک نماز کی حالت میں خوفِ الٰہی کی وجہ سے ایسا جوش مارتا تھا جیسے چولہے پر ہانڈی کھولتی ہے اور جوش و خروش کی آواز ایک میل کی مسافت سے سنائی دیا کرتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن کامل سربسجود گریہ کرتے رہے یہاں تک کہ آنسوؤں کے سبب آس پاس کی زمین پر گھاس پیدا ہو گئی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک پرند کو مخاطب بنا کر فرمایا کہ اے کاش! میں بھی تجھ جیسا پرندہ ہی ہوتا کہ شریعت و احکامِ الٰہی کا مکلف نہ ہوتا یا کاش پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ کاش میں بھولی بسری ہو جاتی" غرض خوب یاد رکھو کہ جن حضرات کو اللہ عزوجل کی بے نیازی اور جلال کی معرفت حاصل ہے وہ ہرگز بے خوف اور نڈر نہیں رہ سکتے نڈر ہونا انہی غفلت شعار امراء کا شیوہ ہے جن کی نہ اپنے خاتمہ پر نظر ہے اور نہ اصلاح آخرت کی طرف توجہ، یہ غفلت کے پتلے اس بے خوف بچہ کی مثل ہیں جس کو زہریلے سانپ سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ مگر بچہ دوسرے کے سمجھانے سے سمجھ تو جاتا ہے پس اے کاش جس طرح ناسمجھ بچہ اپنے سمجھ دار باپ کو سانپ سے ڈرتا ہوا اور بچتا ہوا دیکھ کر خود بھی بھاگتا اور عقل سیکھتا ہے اسی طرح غافل اور بے خبر مسلمان بھی اپنے محسن و مربی طبیبوں اور خاصان پروردگار کی حالت خوف کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی جانب دوڑتا ہے۔ لہٰذا اسی حد تک پسندیدہ ہے جب تک کہ نیکوکاری کا آلہ بنے، یعنی اتنا زیادہ نہ ہو کہ بیکار بنا دے اور مایوسی کی حد تک پہنچا کر اعمال چھڑا دے۔

زیادہ خوف بھی نقصان دہ ہے:۔

حد سے بڑھا ہوا خوف جس سے ناامیدی پیدا ہو جائے شرعاً" مذموم ہے اس لئے امید یعنی رجا بھی ضروری ہے البتہ گناہ گار مسلمان کو خوف غالب رکھنا چاہئے

اور جب دیندار بن جائے تو دونوں مساوی درجہ پر رکھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "اگر اللہ کا حکم صادر ہو کہ ساری مخلوق میں سے صرف ایک شخص جنت میں جائے گا تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ شخص میں ہی ہوں گا اور اگر فرمان صادر ہو کہ دوزخ میں صرف ایک ہی شخص داخل ہو گا تو مجھے خوف ہے کہ وہ شخص کہیں میں ہی نہ ہوں" یہ حالتِ مساوات ہے جس میں خوف و رجا دونوں کے پلے برابر ہیں۔

جوانی میں خوف اور بڑھاپے میں رجا کا غلبہ مفید ہے :۔

یاد رکھنا چاہئے کہ جوانی و تندرستی کے زمانہ میں مسلمان کو خوف غالب رکھنا چاہئے کہ اس غلبہ شہوت کے زمانہ میں شہوت نفسانیہ کے توڑنے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے مہذّب بنانے کو خوف کے کوڑے کی ضرورت ہے اور بڑھاپے یا مرض کے زمانہ میں جب کہ موت قریب ہو تو رجا یعنی امید کو غالب رکھنا چاہئے کہ اول تو ضعف و نقاہت اور مرض کی وجہ سے کچھ ہوتا ہی نہیں پھر اگر اس حالت میں خوف کا غلبہ ہوا تو جو کچھ ہو رہا ہے اتنا بھی نہ ہو سکے گا اور بالکل ہی ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ مسلمان کو مرتے وقت اپنے رب کے ساتھ نیک گمان رکھنا چاہئے۔

رجا اور ہوس میں فرق :۔

نیک گمان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کچھ اعمالِ صالح پاس ہوں کیونکہ انسان جب کاشت کے لئے زمین میں بیج ڈالتا ہے پھرپانی دینے اور ہل چلانے میں اپنی طرف سے جتنی محنت کر سکتا ہو کر لیتا ہے اس کے بعد اللہ عزّوجلّ کے فضل پر بھروسہ کر کے اچھی پیداوار یعنی بوئے ہوئے کو کاٹنے کی امید رکھتا ہے اور جب تک بیج نہیں ڈالا اس وقت تک اناج کی خواہش رکھنا رجا (امید) نہیں بلکہ لالچ' ہوس اور شیطانی دھوکہ ہے۔ اس لئے اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے "وہ جو ایمان لائے اور وہ جنھوں نے اللہ کے لئے اپنے گھربار چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے وہ رحمتِ الٰہی کے

امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے" اس سے معلوم ہوا کہ امید کوشش کے بعد ہوا کرتی ہے) جس طرح کاشت کار بونے جوتنے کی پوری محنت کر لینے کے بعد منتظر ہوتا ہے کہ اگر آسمانی آفت سے حفاظت ہوئی اور بجلی، اولہ، آگ وغیرہ سے کھیت کو (اللہ عزوجل نے بچائے رکھا تو امید ہے کہ جتنا بیج ڈالا ہے ایک ایک کے بدلے ستر ستر بلکہ اس سے بھی زیادہ حاصل ہوں گے) اسی طرح مسلمانوں کو اللہ عزوجل کی اطاعت میں پوری مشقت اٹھانے اور مجاہدہ دریافت کرنے کے بعد امید رکھنی چاہئے کہ اگر اللہ عزوجل نے اپنے فضل سے میرے اعمال و افعال کو قبول فرما لیا تو ایک ایک نیکی کا سات سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اجر ملے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ عذاب کے خوف کے باعث گناہوں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے رکنا چاہئے اور رحمت الٰہی کے سبب نیکیوں میں رغبت ہونی چاہئے۔ پس خوف کو اسی وقت معتبر سمجھو جب کہ وہ تمہیں گناہوں سے روکے اور گناہ کی جرات نہ ہونے دے اور اگر یہ حاصل نہ ہو تو وہ خوف نہیں بلکہ عورتوں جیسی رقت قلبی اور وہم و خیال ہے جس کا کچھ اعتبار نہیں اور چونکہ خوف جب کمال کو پہنچتا ہے تو دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے جس کا نام زہد ہے لہٰذا مناسب ہے کہ کچھ زہد کا بیان کیا جائے۔

١ - ایک شخص کی خوف کی وجہ سے اپنے بچوں کو وصیت اور خدا کا فضل -

٢ - ایک نوجوان کی موت اور ماں کو تسکین دینا اور خدا کا فضل -

٣ - امام زین العابدین کا طواف کے دوران خوف کا عالم -

٤ - ایک نوجوان کی [illegible] کا توبہ کا واقعہ اور دعا قبول -

(۳) زہد

زہد شرح الصدور کی علامت ہے:۔

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ "اے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) اس مال و جاہ کی فکر نہ کرو جو ہم نے کافروں کو دنیا کی تازگی کی جنس سے دے رکھا ہے کہ اس سے مقصود ان کو فتنہ میں ڈالے رکھنا ہے اور تمہارے پروردگار کی عطا بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔"

قارون ملعون کے قصہ میں اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ "تو وہ اپنی قوم پر نکلا اپنی آرائش میں' بولے وہ جو دنیا کی زندگی چاہتے ہیں کسی طرح ہم کو بھی ایسا ملتا جیسا قارون کو ملا بے شک اس کا بڑا نصیب ہے اور بولے وہ جنہیں علم دیا گیا خرابی ہو تمہاری اللہ کا ثواب بہتر ہے اس کے لئے جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے"

اس قصّہ سے معلوم ہوا کہ زہد علم کا پھل ہے۔ حضور پُرنُور عُشاق کے دل کے سرور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ذیشان ہے کہ جو شخص صبح اٹھتے ہی دنیا کے غم میں گرفتار ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا دل پریشان کر دیتا ہے اور ملتا اسی قدر ہے جتنا اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور جو شخص صبح اٹھتے ہی آخرت کی فکر میں لگ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا قلب مطمئن رکھتا ہے اور اس کی دنیا کی خود حفاظت و کفالت فرماتا ہے اس کا دل غنی کر دیتا ہے اور دنیا اتنی مرحمت فرماتا ہے کہ یہ منہ پھیرتا ہے اور دنیا اس کے پیچھے بھاگی چلی آتی ہے۔

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ "اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا شرح صدر کر دیتا ہے"

صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کی شناخت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا سے بے رغبتی دین کی جانب توجہ اور موت سے پہلے موت کا انتظام کرنا شرح الصدور کی

خاص پہچان ہے سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ جسے اللہ عزوجل زاہد بناتا ہے اس کے دل میں حکمت القا فرماتا ہے اور دنیا کی بیماری و علاج سے آگاہ فرما دیتا ہے اور اس فانی دنیا سے بے لوث باہر نکال کر دارالسلام میں پہنچا دیتا ہے (ابن ابی الدنیا) اس کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے فرمایا کہ "اے صحابہ (رضوان اللہ اجمعین) اللہ تعالیٰ سے حیا کرو" صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیا تو کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جہاں رہنا نہیں ہے وہاں مکانات بناتے ہو اور جو کھا نہیں سکتے وہ جمع کرتے ہو یاد رکھو کہ بندہ کا ایمان اس وقت کامل ہوتا ہے جب کہ گوشہ گمنامی میں پڑے رہنے کو شہرت سے زیادہ پسند کرے اور دنیا کے متعلق ہر شے کی قلت کو اس کی اکثریت سے زیادہ محبوب سمجھے' خوب سمجھ لو کہ جب انسان دنیا میں زاہد بنتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے اور جب وہ اللہ عزّوجلّ کا محبوب بن جاتا ہے تو مخلوق کی نظروں میں بھی محبوب ہو جاتا ہے۔

حقیقی زہد یہ ہے کہ انسان دنیا کے مال و متاع کی جانب التفات نہ کرے اور باوجود اس کے حاصل کرنے کی قدرت کے پھر اس کی جانب متوجہ نہ ہو اور زہد کی اصل وہ نور اور علم ہے جو اللہ عزّوجلّ کی طرف سے بندہ کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سینہ کھل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کے جملہ ساز و سامان مکھی کے پر سے بھی زیادہ حقیر ہیں اور آخرت ہی بہتر اور پائیدار ہے جس وقت یہ نور حاصل ہوتا ہے تو اس حقیر دنیا کی آخرت کے مقابلہ میں اتنی بھی وقعت نہیں رہتی جتنی قلب میں ایک پھٹے پرانے چیتھڑے کی وقعت ہوا کرتی ہے اور زہد کا ثمرہ یہ ہے کہ بقدرِ ضرورت و کفایت دنیا پر قناعت حاصل ہو جائے پس زاہد اسی مقدار پر کفایت کیا کرتا ہے جتنا کسی مسافر کو سفر کا توشہ اپنے پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے اور وہ ضروری سامان جس کی ہر شخص کو احتیاج ہے یا طعام ہے یا لباس یا گھر کا سامان اور ہر ایک میں زہد کے مراتب اور مدارج ہیں جن کی تفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔

مراتبِ زہد اور مدت طعام :-

طعام کی ضرورت رفع کرنے میں زہد تین مراتب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی مدت' مقدار اور جنس۔ بس مدت کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا زہد تو یہ ہے کہ صرف ایک وقت کے کھانے پر قناعت کرے یعنی اگر صبح کو بھوک رفع ہو جائے تو شام کے لئے کچھ پاس نہ ہو اور شام کو پیٹ بھر جائے تو صبح کے لئے کچھ ذخیرہ نہ ہو اور اوسط درجہ یہ ہے کہ مہینہ بھر یا چالیس دن کی خوراک مہیا ہو اس سے زیادہ کی پرواہ نہ ہو اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صرف سال بھر کا ذخیرہ جمع کر لیا جائے اور سال سے زیادہ کا سامان جمع کرنا تو زہد سے بالکل خارج ہے البتہ اگر کسی قسم کا ذریعہ کسب اور تحصیل معاش کے لئے دنیا کا کوئی مشغلہ نہ ہو تو سال سے زیادہ کا ذخیرہ جمع کر لینا بھی زہد کے منافی نہیں ہے چنانچہ حضرت شیخ داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بیس درہم تھے جس پر آپ رحمتہ اللہ علیہ نے کامل بیس سال قناعت کی تھی چونکہ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اس لئے بیس سال کا ذخیرہ جمع رکھنا زہد کے خلاف نہ ہوا۔

مراتبِ زہد اور مقدار طعام :-

طعام میں مقدار کے اعتبار سے ادنیٰ درجہ کی مقدار جس کو زہد کا اعلیٰ درجہ کہنا چاہئے نصف رطل یعنی پاؤ (سیر کا چوتھا حصہ) اناج ہے اور اوسط درجہ کی مقدار آدھ سیر اور اعلیٰ مقدار جو زہد کا ادنیٰ درجہ ہے سیر بھر غلہ ہے پس جس نے اس سے زیادہ مقدار کھائی تو سمجھو کہ زہد کے خلاف کیا۔

مراتبِ زہد اور جنس طعام :-

جنس کی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کا زہد اس جنس کے کھانے پر قناعت کرنا ہے جس میں غذائیت پائی جائے گی اگرچہ اناج کی بھوسی ہی کیوں نہ ہو اور اوسط درجہ جو کی روٹی ہے اور ادنیٰ درجہ گیہوں کے بے چھنے آٹے کی روٹی کا کھانا ہے' اگر آٹا چھان لیا تو اس کا نام زہد نہیں بلکہ تنعم اور تلذذ ہے اور ترکاری میں اقل درجہ کی

ترکاری جو زہد کا اعلیٰ درجہ ہے سرکہ اور سبزی اور نمک کا استعمال ہے اور اوسط درجہ چکنائی کا استعمال کرنا ہے اور اعلیٰ ذرجہ کی ترکاری جو زہد کا سب سے نیچے کا درجہ ہے گوشت کھانا بشرطیکہ ہفتہ میں صرف ایک یا دو مرتبہ ہو اور اگر ہمیشہ گوشت کھانا عادت بن گئی تو پھر زہد سے بالکل باہر نکل گیا۔ سنو اور غور کرو کہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "چالیس چالیس روز گزر جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ میں آگ تک نہ سلگتی" (ابن ماجہ) اسی طرح یہ حقیقت بھی معتبر کتب سے ثابت ہے کہ حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد کبھی بھی مسلسل تین روز گیہوں کی روٹی تناول نہ فرمائی۔

اللھمّ صلّ علی حبیبک وصفیک بقدر زھدہ وکمالہ

لباس اور زہد کے درجات:۔

لباس میں اعلیٰ درجہ کا زہد یہ ہے کہ صرف اتنے کپڑے پر قناعت کرے جس سے ستر چھپ جائے اور سردی گرمی رفع ہو سکے اور ادنیٰ درجہ کا زہد یعنی اعلیٰ درجہ کا لباس یہ ہے کہ کسی کھردرے کپڑے کا کرتہ پاجامہ اور ایک رومال رکھے پس اگر دو کرتے بھی پاس ہوں گے تو زہد ہاتھ سے جاتا رہے گا زہد میں کم سے کم یہ تو ضرور ہونا چاہئے کہ اگر پہنے ہوئے کپڑوں کے دھونے کی ضرورت پیش آئے تو دوسرا جوڑا پاس نہ نکلے بلکہ رومال باندھ کر دھو لے اور پھر ان کو پہن لے حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے صوف کی ایک چادر اور ایک موٹا کرتہ نکال کر مجھے دکھایا اور فرمایا کہ ان دو کپڑوں میں سرورِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا (بخاری و مسلم) ایک مرتبہ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے نعلین مبارک کا ایک نیا جوڑا استعمال فرمایا تو فوراً سربسجود ہوئے اور فرمایا کہ مجھے یہ نعلین اچھی معلوم ہوئیں اور اندیشہ ہوا کہ اللہ عزّوجلّ کو یہ ناگوار نہ گزرے اس لئے میں تواضعاً" سربسجود ہو گیا یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور جو مسکین سب سے پہلے ملا اسے مرحمت فرما دیا۔ حضرت

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی قمیص میں بارہ پیوند گنے گئے جن میں سے بعض چمڑے کے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ مقتداء پر ضروری ہے کہ ادنیٰ حیثیت کے لوگوں جیسا لباس پہنے تاکہ امراء اور اہل مال اس کا اقتداء کریں اور فقراء و نادار خود کو حقیر تصور نہ کریں۔

مکان اور زہد کے درجات :۔

مسکن میں ادنیٰ درجہ کا مسکن جو زہد کا اعلیٰ درجہ ہے یہ ہے کہ مسافر خانہ یا مسجد کے حجرہ میں زندگی گزار دے اور اعلیٰ درجہ کا مسکن یہ ہے کہ سکونت کے لئے کوئی خاص جگہ تجویز کرے یعنی بقدر ضرورت ایک حجرہ خواہ خرید لے یا کرایہ پر لے لے بشرطیکہ حاجت سے زیادہ اس میں وسعت نہ ہو اور نہ اس کی اونچی دیواریں ہوں نہ قلعی چونا ہو نہ استرکاری مکانات میں رہائش تو زہد سے خارج ہے' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم مکان میں چونا استرکاری کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ بھائی وقت تو اس سے پہلے برابر ہو جانے والا ہے" مطلب یہ ہے کہ انسان کو ناپائیدار زندگی گزارنے کے لئے استحکام و پائیداری کی کیا ضرورت ہے موت آجائے گی اور یہیں دھرا رہ جائے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے رہائش کے لئے پھونس کا ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا' اسی میں زندگی بسر فرماتے تھے لوگوں نے عرض کیا کہ یا نبی اللہ علیہ السلام ایک گھر بنا لیجئے تاکہ آرام ملے آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ مرنے والے کے لئے تو یہ پھونس کا گھر بھی بہت ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ضرورت سے زیادہ جو شخص مکان بنائے گا قیامت کے دن اس کو تکلیف دی جائے گی کہ اس مکان کو سر پر اٹھائے پس اب تم خود سمجھ لو کہ ضرورت کس چیز کا نام ہے اور کس مقدار و حیثیت کے مکان سے رفع ہو سکتی ہے ظاہر ہے کہ جس حد تک گرمی و سردی رفع ہو وہ تو ضرورت میں داخل ہے اور اس سے زیادہ سجاوٹ یا وسعت تو عبث بیکار اور آخرت کے لئے مخدوش و خطرناک ہی ہے۔

گھر کا سامان اور زہد کے درجات:۔

گھر کے ساز و سامان کے کئی درجے ہیں۔ ادنیٰ درجہ کا سامان جس کو زہد کا اعلیٰ درجہ ہونا چاہئے وہ ہے جو حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوۃ والسلام کا حال تھا کہ ایک کنگھا اور ایک آب خورہ پاس تھا یہی گھر کا اثاثہ اور یہی سفر و حضر کا سامان ایک بار چلے جا رہے تھے کہ ایک شخص نظر آیا جو انگلیوں سے کنگھے کا کام لے رہا تھا اور بال درست کر رہا تھا یہ دیکھ کر حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام نے کنگھا پھینک دیا اور فرمایا کہ یہ تو ضرورت سے زائد چیز نکلی اب آب خورہ رہ گیا اس کو لے کر آگے چلے تو ایک شخص کو دیکھا کہ ہاتھ کے چلو سے پانی پی رہا ہے پس آب خورہ بھی پھینک دیا اور فرمایا کہ اللہ عزّوجلّ کے عطا کئے ہوئے بدن ہی کے عضو سے جو کام نکل آئے اس کے لئے دوسرا انتظام کرنا بے کار ہے اور اوسط درجہ یہ ہے کہ معمولی برتن رکھے اور وہ بھی ہر قسم کی ضرورت کے لئے ایک عدد سے زیادہ نہ ہو اور اس میں بھی یہ لحاظ رہے کہ جہاں تک ہو سکے کئی ضرورتیں ایک ہی برتن میں رفع ہو جائیں' چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ نے شہر حمص کے حاکم حضرت عمر بن سعد رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تمہارے گھر میں دنیا کی ضرورتوں کے لئے کیا کیا اسباب ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک تو لاٹھی ہے کہ اس سے سہارا کا کام لے لیتا ہوں اور اسی سے موذی جانور سانپ بچھو وغیرہ کو مار دیتا ہوں اور ایک تھیلا ہے جس میں کھانا رکھ لیتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں کھانا رکھ کر کھا لیتا ہوں اور اسی میں بقدر ضرورت سر اور کپڑا دھو لیتا ہوں اور ایک برتن ہے جس میں اتنا پانی آجاتا ہے جو پینے اور وضوء کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے پس یہ چار عدد چیزیں میرے پاس موجود ہیں اور ساری ضرورتیں الٹ پھیر کر اسی میں پوری ہو جاتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرما کر کہ سچ کہتے ہو' خاموش ہو رہے۔ تم نے سنا ہو گا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر مبارک جس پر استراحت فرماتے تھے ایک تو چرمی تکیہ تھا جس میں لیفہ گھاس بھری ہوئی تھی اور ایک کمبل تھا۔ غرض زاہدوں کے یہ حالات ہیں جو نمونہ کے طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔

زاہدوں کی محبت اختیار کرو:۔

اگر اس مرتبۂ کمال کے حاصل کرنے سے خدانخواستہ محروم رہو تو کیا اس سے بھی گئے گزرے ہو کہ اس محرومیت پر افسوس ہی کرو تاکہ زہد کی قلب میں محبت اور اس کے حصول کی خواہش تو باقی رہے نیز اس کا ہمیشہ خیال رکھو کہ لذت پسند اور ذی ثروت لوگوں کے قرب کی نسبت نیک لوگوں یعنی زاہدوں کی محبت اختیار کرو اور جہاں تک ہو سکے زاہدوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے رہو۔

زہد کے درجات:۔

(i) یہ کہ نفس دنیا کی طرف مائل ہو مگر اس کو جبراً بے التفات بنایا جائے اور دنیا حاصل کرنے سے زبردستی روکا جائے اس حالت کو زہد کہنا تو ٹھیک معلوم نہیں ہوتا البتہ اگر تزہد (اظہارِ زہد) کہا جائے اور زہد کی ابتداء سمجھا جائے تو مناسب ہے۔

(ii) یہ کہ نفس دنیا سے اتنا متنفر ہو کہ اس کی طرف مائل ہی نہ ہو اور سمجھ جائے کہ دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا یکجا ہونا چونکہ ناممکن ہے اس لئے آخرت کی لذتوں کے حاصل کرنے میں دنیا کے مال و متاع پر اس طرح خاک ڈال دینی چاہئے جس طرح کسی بیش بہا جوہر کے خریدنے میں چند روپے کو خرچ کرنے میں دریغ نہیں ہوتا بلکہ روپیہ دے کر نہایت خوشی سے جوہر لے لیا جاتا ہے ایسے ہی دنیا کا ساز و سامان چھوڑ کر بڑی مسرت کے ساتھ آخرت کی نعمتیں حاصل کر لی جائیں۔

(iii) یہ کہ دنیا کے مال و متاع کا عدم اور وجود برابر ہو جائے اور یہ خیال رہے کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہے وہ اللہ عزّوجلّ کے بے شمار خزانوں کے بحر ناپید کنار کا ایک قطرہ ہے پس اگر مل جائے تو کچھ مسرّت نہیں اور اگر نہ ملے یا آیا ہوا ہاتھ سے چلا جائے تو کچھ حسرت نہیں' اس درجہ میں تو دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ اس سے متنفّر ہوتا ہے اور یہی زہد کے کمال کا درجہ ہے کیونکہ تنفّر بھی ایک قسم کی توجہ ہے اور اس شئے کے باوقعت ہونے کی علامت ہے اس لئے کہ جس شئے کی وقعت ذہن سے نکل جایا کرتی ہے اس کی دونوں اطراف یعنی تنفّر اور توجہ برابر ہو جایا کرتی

ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت رابعہ عدویہ رحمتہ اللہ علیہا کی مجلس میں لوگوں نے دنیا کی مذمت بیان کرنی شروع کی تو آپ رحمتہ اللہ علیہا نے فرمایا کہ دنیا کی قدر و منزلت تمہارے دلوں میں ہے اسی لئے تم اس کی مذمت کر رہے ہو' بھلا ایک ذلیل اور بے قدر چیز کی بھی کوئی مذمت کیا کرتا ہے۔ خوب جان لو کہ جب دنیا کی وقعت دل سے نکل جائے گی تو رغبت اور نفرت دونوں سے انسان خالی الذہن ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک لاکھ درہم آئے اور آپ رضی اللہ عنہا نے ان سے نفرت کا اظہار نہ فرمایا بلکہ قبول فرما کر اسی روز مساکین میں تقسیم فرما دیئے۔ خادمہ نے عرض کیا کہ اے اُم المومنین رضی اللہ عنہا! ایک درہم کا گوشت ہی خرید فرما لیتیں جس سے آپ رضی اللہ عنہا کی افطاری کا اہتمام ہو سکتا تو ارشاد فرمایا کہ اگر پہلے یاد دلاتی تو یہ بھی کر لیتے اب تو کچھ باقی نہیں رہا یہ درجہ غنا کہلاتا ہے پس ناعاقبت اندیش جاہل صوفی دھوکہ کھاتے اور اپنے مال کے بڑھنے اور حرص کو غنا کا درجہ سمجھ جاتے یعنی یوں خیال کرتے ہیں کہ چونکہ ہمارے دل کو دنیا سے علاقہ نہیں رہا اس لئے ہمارے واسطے یہ مال و متاع کی کثرت نقصان دہ نہیں حالانکہ ان کا یہ خیال شیطانی دھوکہ ہے' امتحان کرنے سے اس کی کھوٹ معلوم ہو جائے گی مثلاً اگر سارا مال یک لخت چوری ہو جائے تو دیکھو ان کا کیا حال ہوتا ہے' اگر اپنا مال چوری جانے کا اسی قدر اثر ہو جتنا کسی اجنبی کا مال چوری جانے سے ہوتا ہے تب سمجھو کہ بے شک ان کے دل کو مال سے محبت نہیں ہے اور ان کے نزدیک مال کا رہنا اور چلا جانا دونوں برابر ہیں ورنہ دل کی چوری پکڑی گئی الغرض زہد کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ زہد سے بھی زہد حاصل ہو جائے یعنی دنیا کی جانب سے بے التفاتی کو بھی وقعت کی نظر سے نہ دیکھے بلکہ یوں سمجھے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی ہو جس کا چھوڑنا ہمت اور بہادری سمجھی جائے یا مسرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اس کی تو اہلِ بصیرت کے نزدیک اتنی بھی قدر نہیں ہے جتنی کسی بڑے بادشاہ کے نزدیک ایک پیسے کی قدر ہوا کرتی ہے اس بے حیثیت دنیا کو چھوڑ کر یہ سمجھنا کہ ہم سب نے کچھ چھوڑ دیا حقیقت میں اس کے درجہ کا اس کی حیثیت سے بڑھانا ہے اس کی مثال تو ایسی سمجھو

جیسے کوئی شخص شاہی دربار میں داخل ہونا چاہے اور اس کو دروزے پر بیٹھا کتّا داخلہ سے روک رہا ہو۔ پس یہ اس کے سامنے ایک روٹی کا ٹکڑا ڈال دے تاکہ کتا اس کے کھانے میں لگ جائے اور یہ اپنے مطلوب کے دربار میں جا داخل ہو اسی طرح شیطان اللہ عزوجل کے دروازے کا کتّا ہے جو سالک کو مطلوب تک پہنچنے سے روک رہا ہو اور ساری دنیا روٹی کے ایک ٹکڑے سے بھی زیادہ بے وقعت ہے جس کو اس کے سامنے ڈال کر سالک نے اپنے مطلوب تک پہنچنے کا راستہ صاف کر لیا ہے پس تم ہی سوچو کہ شاہی دربار کی حاضری کا اعزاز حاصل کرنے کے لئے جو کتّے کو روٹی کا ٹکڑا ڈالا گیا ہے نہ اس کی ذہن میں وقعت ہو گی اور نہ اس کو قابلِ ذکر و خیال امر سمجھا جائے گا بلکہ روٹی کے ٹکڑے اور دنیوی بادشاہ میں تو کچھ مناسبت بھی معلوم ہوتی ہے کہ دونوں ایک دن فنا ہونے والے پس فانی شئے کے حصول کے لئے ایک فانی شئے کا کھو دینا جب وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تو دنیا اور آخرت میں تو کوئی مناسبت ہی نہیں ہے اس لئے کہ اگر دنیا لاکھوں بھی ہوں گی تو ایک دن فنا ہو جائیں گی۔ پس آخرت کی جاوید نعمتوں اور پائیدار ملک کی دائمی سلطنت حاصل کرنے کے لئے گر دنیا کو ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے اور شیطان کے حوالہ کر دیا جائے تو اس کا خیال اور ذکر ہی کرنا فضول ہے۔

زہد کے اسباب :۔

(i) کبھی تو دوزخ کا خوف اور عذاب کا اندیشہ زہد کا سبب بن جاتا ہے اور اس زہد کو **خائفین** کا زہد کہتے ہیں اور یہ **سالکینِ طریقت** کے نزدیک ادنیٰ درجہ ہے۔

(ii) کبھی اخروی نعمتوں اور لذتوں کی رغبت کا باعث ہو جاتی ہے اور اس کو راجین کا زہد کہتے ہیں اور یہ درجہ پہلے درجے سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ رجا یعنی امید محبت کو مقتضیٰ ہے اور محبت کی فضیلت تمہیں معلوم ہو چکی ہے۔

(iii) تیسرا درجہ جو سب سے اعلیٰ ہے وہ یہ ہے کہ ماسوی اللہ عزّوجلّ کی جانب سے بے توجہی اور نفس کا غیر اللہ کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دینا زہد کا باعث ہو اس کو حقیقی زہد کہتے ہیں کیونکہ پہلے دونوں درجوں کے زہد تو ایسے ہیں کہ جیسے کسی نافع سودے کی

خرید و فروخت ہوتی ہے کہ ایک حقیر چیز کو اس لئے چھوڑ دیا کہ تکلیف دینے والی مصیبت اس کی وجہ سے دور ہو جائے اور راحت و نفع دینے والی چیز ہاتھ لگ جائے اور اس درجہ میں ماسوی اللہ عزّوجلّ کی جانب التفات کرنے ہی کو فضول سمجھا گیا ہے کیونکہ وہ کوئی چیز ہی نہیں ہے پس اس درجہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا جو چیز بھی ہو خواہ مال ہو یا جاہ اور کوئی ایسی شئے جس سے عموماً" لذت حاصل ہوا کرتی ہے سب ہی سے زہد حاصل ہوتا ہے اور بعض سے نہیں ہوتا اور یہی وجہ ان درجوں کے ضعیف ہونے کی ہے کیونکہ انسان کو جاہ کی محبت مال کی بہ نسبت زیادہ ہوا کرتی ہے اور جس کی محبت زیادہ ہو اسی سے زہد حاصل ہونا قابل اہتمام وجہ بھی ہے۔

زہد اور فقر میں فرق:۔

زہد کے معنی یہ ہیں کہ باوجود دنیا حاصل کر سکنے کے دنیا سے ایسی بے رخی اختیار کی جائے کہ دنیا اس کے پیچھے بھاگے اور یہ اس سے دامن چھڑائے اور اگر معاملہ برعکس ہو کہ یہ دنیا کو حاصل کرنا چاہے مگر دنیا اس کے ہاتھ نہ آئے تو اس کو زہد نہیں کہتے بلکہ اس کا نام فقر ہے اور فقر کا درجہ زہد کے برابر نہیں ہے ہاں فقر کو تونگری پر فضیلت ضرور ہے کیونکہ تونگری میں دنیا کی لذتوں سے دل بستگی ہو جاتی ہے اور اس لئے مرتے وقت ان مرغوبات کے چھوڑنے سے حسرت ہوا کرتی ہے اور دنیا گویا جنّت معلوم ہوتی ہے اور آخرت قید خانہ' برخلاف فقر کے کہ اس حالت میں لذتوں سے اگرچہ جبرا" قہرا" باز رکھا گیا ہے تاہم چونکہ کسی چیز کا ذائقہ اور مزہ کبھی منہ کو نہیں لگتا اس لئے مرتے وقت کسی چیز کی محبت میں دل نہ لگائے گا بلکہ دنیا کو مصائب و آلام کا گھر سمجھے گا اور جنت اسے آخرت کی آزادی کا گھر معلوم ہو گی۔ اس میں شک نہیں کہ فقر بھی اللہ عزّوجلّ کی بڑی نعمت اور سعادت اخروی کا مضبوط ذریعہ ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ "اللہ عزّوجلّ اپنے نیک بندے کو دنیا سے ایسا بچاتا ہے جیسے تم اپنے عزیز بیمار کو کھانے پینے کا پرہیز کراتے ہو' میری اُمّت کے فقراء جنّت میں امراء سے پانچ سو برس پہلے داخل ہو جائیں گے جب کسی فقیر کو دیکھا کرو تو خوش ہو جایا کرو اور کہا کرو کہ صالحین کے

طریقے پر چلنے والے مرحبا" (حاکم صحیح)

حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام نے ایک بار اللہ عزّوجلّ سے عرض کیا کہ یا باری تعالیٰ! تجھے کونسے بندے محبوب ہیں؟ مجھے بتا تاکہ میں ان سے محبت کروں، ارشاد ہوا کہ فقیر جن کو لوگ پاس بھی نہ کھڑا ہونے دیں۔ یاد رکھ کہ اگر فقیر اپنی حالت پر قانع ہو اور طلب مال کا زیادہ حریص نہ ہو تو اس کا درجہ زاہد کے قریب قریب ہے۔ سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ اس کو مبارک ہو جسے اسلام کی ہدایت ہوئی اور بقدرِ کفایت معاش ملی اور وہ اس پر قانع ہوا، قانع فقیر اللہ عزّوجلّ کو بہت پسند ہے (ترمذی) حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اے اسماعیل (علیہ السلام) مجھے شکستہ دل لوگوں کے پاس ڈھونڈا کرو۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دریافت کیا کہ یا الٰہی! وہ کون لوگ ہیں ارشاد ہوا کہ "صابر فقیر" خلاصہ یہ ہے کہ اگر فقیر کے ساتھ قناعت اور صبرو رضا بھی ہو تو نُورٌ علیٰ نُور اور اس کا ثواب بہت ہی زیادہ ہے اور چونکہ زہد کی ابتداء فقر پر صبر کرنا ہی ہے اس لئے صبر کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۴) صبر

اللہ عزّوجلّ نے جتنی صبر کرنے والوں کے لئے صفات جمع فرمائی ہیں اتنی دوسروں کے لئے نہیں فرمائیں چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔ "صبر کرنے والوں پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمتیں ہیں اور وہی کامیاب ہیں" اور فرمایا "صبر کرنے والوں کو بے شمار اجر دیا جائے گا" وغیرہ۔

قرآنِ حکیم میں کم و بیش ستر مرتبہ صبر کا ذکر آیا ہے اور سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ذیشان ہے کہ صبر نصف ایمان ہے اور جنت کے خزانوں کا ایک خزانہ ہے (ابو نعیم۔ صحیح) جس شخص کو یہ خصلت مرحمت ہوئی اور وہ بڑا خوش نصیب ہے۔ شب بیداری کرنے والے اور ہمیشہ روزہ رکھنے والے سے اس کا درجہ افضل ہے۔

صبر سے کیا مراد ہے؟

صبر کے حقیقی معنی ہوئے نفس کے مقابلہ میں اللہ عزّوجلّ کے حکم پر مستقل اور ثابت قدم رہنے کے ہیں کہ یہ صرف انسان ہی کو حاصل ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس پر دو مخالف لشکر مسلط اور حملہ آور ہیں جن میں ایک لشکرِ الٰہی یعنی فرشتوں اور عقل و شریعت کا لشکر ہے جن کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو اپنے قابو میں لائیں اور ہدایت پر قائم رکھیں اور دوسرا شیطانی لشکر یعنی غیظ و غضب اور نفس کی خواہشوں اور اس کے اسباب کا لشکر ہے جو چاہتا ہے کہ انسان کو اپنے قبضہ میں رکھے اور پابند ہوا و حرص بنائے، انسان کو بالغ ہو کر دونوں میں امتیاز کرنا اور شیطانی گروہ سے جنگ و جدل کرنا پڑتا ہے پس اگر عقل کو غلبہ ہوا کہ دین اسلام اور شریعت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر استقلال نصیب ہوا تو صبر کا مرتبہ اس کو حاصل ہو گیا اور چونکہ چوپایوں میں صرف شہوات و خواہشات کا مادہ ہے عقل اور دین کا شعور نہیں ہے اور فرشتوں میں

صرف قربِ الٰہی کی استعداد پیدا کی گئی ہے وہ شہواتِ نفسانی اور غیظ و غضب سے بالکل پاک ہیں کہ ہروقت تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے ہیں اور جانتے ہی نہیں کہ شہوت کیا چیز ہے لہٰذا صبر کا مرتبہ ان دونوں میں سے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا اور انسانوں میں چونکہ متضاد صفتیں موجود ہیں یعنی خواہشاتِ نفسانیہ بھی ہیں اور برا بھلا سمجھنے کا شعور اور عقل و فطرت سلیمہ بھی موجود ہے پس ایک کو مغلوب اور دوسرے کو غالب کرنا جس کا نام صبر ہے انسان ہی کے لئے مخصوص ہے یاد رکھو کہ جب یہ دونوں حالتیں اپنا اپنا رنگ جمانا چاہتی ہیں تو اس وقت انسان کو عقل سے کام لینے اور انجام سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے' تاکہ دین کو غالب رکھ کر مقام صبر پر پہنچے اس کی ایسی مثال ہے جیسے مریض کو تلخ دوا اور عقل چاہتی ہے کہ اگرچہ اس کی تلخی ناگوار گزرے گی مگر آنکھیں بند کر کے جبراً" قہراً" پی لی جائے تاکہ شفاء جلد حاصل ہو' پس اگر عقل کو غلبہ ہو گا تو بے شک دوا کی تلخی پر صبر کیا جائے گا' اسی طرح اگر دینی مقابلہ میں عقل اور فطرتِ سلیمہ کو غلبہ ہو گا تو ضرور ہے کہ ریاضت اور مجاہدہ کی دشواریوں کو برداشت کیا جائے گا اور چونکہ ایمان ہے علم اور عمل کا اور عمل کی دو اطراف ہیں جن میں بعض کا کرنا مقصود ہے اور بعض سے باز رہنا' اسی طرح اخلاق اور عادات میں عاداتِ محمودہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے اور خصائل رذیلہ سے خالی اور پاک رہنا لازمی ہے اور یہ درجہ بغیر صبر کے حاصل نہیں ہو سکتا لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کو آدھا ایمان فرمایا ہے اور صبر چونکہ کبھی شہوت کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور کبھی غصہ کے مقابلہ میں اور وہ شہوت کے توڑنے کا نام ہے لہٰذا روزہ کو نصف صبر ارشاد فرمایا ہے۔

صبر کے درجات:۔

یاد رکھو کہ صبر کے تین درجے ہیں۔

(i) اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ شہوت اور ہوائے نفس کے مادہ ہی کا قلع قمع ہو جائے کہ اس کو مقابلہ کی قدرت ہی نہ رہے اور دین پر ثبات و بقا نصیب ہو اور انہی نفوس کو نفسِ مطمئنہ کے خطاب سے مخاطب بنا کر مرتے وقت بشارت دی جائے گی

کہ اے نفسِ مطمئنہ چل اپنے پروردگار کی طرف کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی۔

(ii) سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہوائے نفسانی غالب آجائے اور قلب شیطانی لشکر کے حوالہ ہو جائے ایسی خطرناک حالت والوں کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرا فرمان صادر ہو چکا ہے کہ تم سے جنہم بھر دوں گا" (اللہ پناہ میں رکھے) اس کی دو علامتیں ہیں ایک یہ کہ ایسا شخص کہا کرتا ہے کہ "مجھے صبر کا شوق تو ہے مگر مجھ سے ہو نہیں سکتا اور اس لئے اب اس کی کچھ خواہش بھی نہیں رہی" یہ یاس اور ناامیدی کا درجہ ہے جو مہلک ہے اور جانبری کی امید نہیں' دوسری صورت یہ ہے کہ توبہ کا شوق بھی نہ رہے اور کہنے لگے کہ اللہ رحیم و کریم ہے اسے میری توبہ کی کچھ پروا نہیں ہے اگر توبہ کئے بغیر وہ مجھے جنّت میں بھیج دے گا تو اس سے جنت جیسی وسیع جگہ چھوٹی نہیں پڑ جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت شاملہ میں کچھ کمی نہیں آجائے گی' یہ بے چارہ کم عقل متحیّر ہے اس پابند ہوا وہوس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کافروں کے ہاتھ میں قید ہو جائے اور کافر اس کو کبھی خنزیروں کے چرانے اور ان کے کھلانے پلانے کی خدمت سپرد کر دیں اور کبھی اس کی گردن اور کمر پر شراب کے پیپے لدوا کر اپنے گھروں تک لے جائیں اور یہ اس ذلیل حالت کو ذلیل نہ سمجھے' پھر بھلا اس کی نجات کی کیا صورت ہو سکتی ہے' تمہی بتاؤ کہ اگر بادشاہ کی کسی پیاری اولاد کو پکڑ کر کسی ذلیل و بے عزّت غلام کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ اس کو اپنا غلام بنائے پاؤں دبوائے اور جو چاہے خدمت لیا کرے تو اس بے چارے شہزادے کا کیا حال ہو گا اسی طرح اس غفلت شعار مسلمان کا حال ہے۔ جس نے اللہ عزّوجلّ کے قرب پر دنیائے فانی کو ترجیح دی اور ہوائے نفسانی کا قیدی ہو گیا کہ توبہ اور اللہ عزوجل کی طرف توجہ کا شوق بھی اس کے دل سے جاتا رہا۔

(iii) متوسط درجہ یہ ہے کہ لشکرِ الٰہی اور شیطانی گروہ میں جنگ و جدال قائم رہے کہ کبھی اس کا پلہ بھاری ہو جائے اور کبھی اس کا پلہ' نہ اس کو کامل شکست ہو اور نہ اس کو کھلی ہوئی فتح' پس اس قسم کے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے کہ "یہ

وہ لوگ ہیں جنہوں نے اعمالِ صالح کو بدکاریوں میں خلط کر رکھا ہے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر توجہ فرمائے" اس کی علامت یہ ہے کہ ضعیف خواہشوں کو چھوڑ دے اور زور آور شہوات کو نہ چھوڑ سکے اور کبھی خواہشات کو چھوڑ دے اور کبھی ان کے ہاتھوں عاجز آجائے مگر اپنے مغلوب ہونے پر حسرت و افسوس ضرور کرتا اور برابر اس کوشش میں لگا رہے کہ کسی طرح نفس پر قابو حاصل ہو جائے تو بہتر ہے اس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے اور اس میں اس کو دیکھنا چاہئے کہ کہاں تک فتح حاصل کرتا ہے اگر مغلوب رہا اور قوتِ عقل کو غلبہ نہ دے سکا تو بالکل جانور کے برابر ہے بلکہ اس سے بھی گیا گزرا ہوا کیونکہ اس میں تو عقل ہی نہیں اور اس میں باوجودیکہ عقل ہے مگر چوپایہ کی طرح اپنی خواہشِ نفس کے پورا کرنے میں مصروف ہے اور اگر غالب آگیا تو کام بن گیا۔

انسان ہر حال میں صبر کا محتاج ہے

انسان اپنی تمام زندگی ہر حال میں صبر کا محتاج ہے کیونکہ دنیا میں دو ہی حالتیں ہیں اپنی مرضی کے مطابق و موافق یا مخالف و ناگوار پس اگر مرضی و منشاء کے موافق حالت ہے۔ تندرستی' خوشحالی' اولاد' عزت و شہرت سب کچھ حاصل ہے تب تو صبر کی نہایت ضرورت ہے کیونکہ اگر نفس کی باگ نہ تھامے گا تو یہ سرکش شرارت کرے گا اور تنعم و تلذّذ میں بے باکانہ قدم رکھے گا' یعنی خواہشات کے پیچھے ہو لے گا اور ابتداء و انتہا سب بھول جائے گا اسی لئے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین فرماتے ہیں کہ ہم تنگی اور فقر کے فتنہ میں ہوئے تو صابر نکلے مگر فراخی و وسعت کے فتنہ میں مبتلا ہوئے تو صبر نہ کر سکے یعنی نعمت کا پورا حق ادا نہ ہو سکا' فراخی میں صبر کرنے کا یہی مفہوم ہے کہ دل کا میلان اس دنیا کے متاع کی جانب نہ ہو بلکہ یہ سمجھے کہ جو کچھ بھی مجھے اللہ عزّوجلّ کی جانب سے عطا ہوا ہے وہ میرے پاس اس کی امانت ہے جو عنقریب مجھ سے واپس لے لیا جائے گا پس جب تک وہ میرے پاس ہے اس وقت تک مجھے شکر ادا کرنا چاہئے اور جب وہ چلی جائے تو رنجیدہ نہ ہونا چاہئے ہاں اگر خدانخواستہ غفلت اور اتباع نفس میں مشغول ہو گیا تو غافل کہلائے گا۔ دوسری

صورت یہ ہے۔ کہ اپنی خواہش کے مخالف حالت ہو اور اس کی چار قسمیں ہیں۔

(i) پہلی قسم ان طاعات پر صبر کرنا ہے جن سے نفس گھبراتا اور بھاگتا ہے مثلاً محض کسل کی وجہ سے نماز پڑھنی ناگوار ہے اور بخل کی وجہ سے زکوٰۃ دینی گراں گزرتی ہے اور کسل و بخل دونوں کی وجہ سے حج اور جہاد کرنا دشوار ہے پس نفس پر جبر کرنا او۔ طاعات پر صبر کرنا اگرچہ کیسا ہی گراں گزرے' مگر ضروری ہے کہ اس گرانی کا متحمل ہو اور نفس کو زیر کرے اور جب نفس مطیع ہو گیا تو پھر تین قسم کے صبر کا حکم ہو گا۔ اول عبادت کے شروع کرنے سے پہلے اخلاص پیدا کرنا' ریا کو دور کرنا اور نفس کے مکر و فریب سے بچنا۔ دوم حالت عبادت میں صبر کرنا ضروری ہے تاکہ آداب و سنن و مستحبات کی ادائیگی میں سستی و کاہلی نہ ہو اور عبادت میں اول تا آخر حضورِ قلب قائم رہے کہ شیطانی وسوسوں اور نفس کے خطرات ایک لحہ کے لئے بھی پاس نہ آنے پائیں سوم فراغت پانے کے بعد صبر کرنے کی جدا ضرورت ہے کہ ریا اور شہرت کے طور پر اس کا اظہار اور لوگوں سے اپنی عبادت کا ذکر نہ کرتا پھرے الغرض صبر کی ہر جگہ ضرورت ہے اور وہ ہر حالت میں نفس کو شاق گزرتا ہے۔

(ii) دوسری قسم معاصی سے صبر کرنا ہے خاص کر ایسی معصیت سے جس کا کہ نفس عادی ہو رہا ہو اور اس کا مزہ پڑا ہوا ہو کیونکہ یہاں لشکرِ الٰہی یعنی عقل و دین سے دو لشکروں کا مقابلہ ہوتا ہے ایک شیطانی گروہ اور دوسرا اس کے ساتھ اس کے مددگار یعنی عادت کا لشکر اور پھر خصوصاً" عادت بھی ایسی چیزوں کی جن کے حاصل کرنے میں سہولت ہو کہ ان میں خرچ کی بھی ضرورت نہیں مثلاً غیبت کرنا' جھوٹ بولنا' جھگڑا اور خود ستائی وغیرہ کہ ان گناہوں میں صرف زبان ہلانی پڑتی ہے پس ان سے بچنا اور صبر کرنا بڑے بہادر کا کام ہے۔

(iii) تیسری قسم ان چیزوں پر صبر کرنا ہے جو اگرچہ تمہاری اختیاری نہیں ہیں مگر ان کا تدارک اور تلافی تمہارے قبضہ میں ضرور ہے مثلاً کسی ایسے شخص سے ایذاء پہنچی جس سے تم انتقام لے سکتے ہو مگر اس پر صبر کرو اور انتقام نہ لو یہ صبر کرنا کسی

وقت واجب ہے اور کسی وقت مستحب چنانچہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تک مسلمان ایذاء پر صبر نہیں کرتا تھا ہم اس کا ایمان کامل نہیں سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شان ہے کہ کافروں کی ایذائیں برداشت کرتے اور یوں کہتے کہ ہم ان تکلیفوں پر صبر کریں گے جو تم ہمیں پہنچاؤ گے۔

(iv) چوتھی قسم وہ ہے جو بالکل غیر امتیازی ہو یعنی اس کی تلافی بھی اپنے اختیار میں نہ ہو جیسے کسی عزیز کے مرجانے یا مال کے برباد ہو جانے کی مصیبت یا کسی مرض و بیماری کا پیدا ہو جانا یا کسی عضو کا جاتے رہنا غرض تمام بلاؤں اور حوادث پر صبر کرنا چوتھی قسم میں داخل ہے اس کا بڑا درجہ ہے۔ اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ جب میں کسی بندہ کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ صبر کرتا ہے یعنی شکایت کا کلمہ زبان پر نہیں لاتا تو میں اس کا معاوضہ اس کو دیتا ہوں گوشت سے بہتر گوشت اور خون سے بہتر خون اگر تندرست کر دیتا ہوں تو گناہ معاف کر کے تندرست کرتا ہوں اور وفات دیتا ہوں تو پاک صاف کر کے اپنی رحمت کے جوار (سایہ) میں لیتا ہوں۔ غرض انسان کسی حالت میں صبر سے مستغنی نہیں ہے اور چونکہ صبر نصف ایمان ہے اور ایمان کا دوسرا نصف حصہ شکر ہے کیونکہ اس کو بھی تمام اعمال سے تعلق ہے اس لئے شکر کا بیان کرنا بھی مناسب ہے۔

(۵) شکر

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ "اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا"
سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ذیشان ہے کہ "کھانے والا شکر گزار بندہ روز دار صابر کے برابر ہے" تم نے سنا ہو گا کہ حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کثرتِ عبادت کی وجہ سے متوّرم ہو جایا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے وقت نماز کی حالت میں بہت گریہ فرمایا کرتے تھے ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تو گناہوں سے مبرّا ہیں (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر گریہ و بکاء کیوں فرماتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عائشہ (رضی اللہ عنہا)! کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ واقعی شکر کا مرتبہ نہایت عالی اور صبر' خوف' زہد اور تمام مذکورہ صفات سے بلند ہے کیونکہ جن اوصاف کا ذکر ہو چکا ہے ان میں سے کوئی صفت بھی مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ سب مقصود بالغیر ہیں چنانچہ صبر تو اس لئے مقصود ہے کہ ہوائے نفس کا قلع قمع ہو جائے اور خوف اس لئے مطلوب ہے کہ کوڑے کا کام دے کر مقامِ مقصود تک پہنچا دے اور زہد سے مقصود ان تعلقات سے بھاگنا ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے توجہ ہٹا رکھی ہے البتہ صرف شکر ایسی صفت ہے جو خود مقصود بالذات ہے اور فی نفسہ مطلوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ شکر کا وجود جنّت میں بھی ہو گا۔ توبہ و خوف اور زہد و صبر کی وہاں حاجت نہیں ہے اور شکر وہاں کی نعمتوں پر بندے ضرور ادا کریں گے چنانچہ اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ اہلِ جنّت کا آخری قول "الحمد للہ ربّ العالمین" ہو گا۔ شکر ادا کرنے کے لئے شکر کی ماہیت معلوم ہونی ضروری ہے یعنی اول علم ہونا چاہئے کہ شکر کیا چیز ہے اور جب یہ معلوم ہو گا تو ایک حالت خاص پیدا ہو گی اور پھر اس حالت خاص کے بعد عمل متفرع ہو گا۔ شکر کے تین رکن ہیں جنہیں ہم علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں۔

(i) علم یعنی نعمت اور منعم سے واقف ہونا نیز یہ سمجھنا کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی مرحمت فرماتا ہے اور جس قدر اسباب اور واسطے اس نعمت کے ہم تک پہنچنے میں پیش آئے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں کہ اس کے حکم کے بغیر نہ کوئی ذرہ حرکت کر سکتا ہے اور نہ کوئی چیز کسی کو مل سکتی ہے اور یہ سمجھنے سے دو باتیں پیدا ہوں گی ایک منعم سے خوش ہونا۔ دوم اس کی خدمت گزاری اور امتثال امر میں سرگرمی کرنا۔ انہی دو حالتوں کا نام حال اور عمل ہے۔

(ii) حال یعنی منعم کی اس نعمت پر اس وجہ سے خوش ہونا کہ منعم کا عطیہ ہے اور خضوع و تذلّل کی ہیئت ظاہر کرنا کیونکہ بادشاہ اگر کسی غلام کو گھوڑا بھیجے تو اس کی خوشی تین وجہ سے ہوتی ہے اول اس وجہ سے کہ کام کی چیز ہاتھ آئی کہ گھوڑے پر سوار ہو کر بیسیوں ضرورتیں رفع ہوں گی۔ دوم اس وجہ سے کہ یہ عطیہ بتا رہا ہے کہ بادشاہ کی اس غلام پر توجہ اور عنایت ہے جس سے آئندہ کسی بڑی اور اس سے بھی زیادہ مفید نعمت کے ہاتھ آنے کی امید ہے۔ سوم اس وجہ سے کہ گھوڑا اس کی سواری بنے گا اور اس پر سوار ہو کر اپنے منعم آقا کے حضور میں حاضر ہو کر شاہی خدمت بجا لا سکے گا ان میں سے پہلی وجہ تو کوئی چیز ہی نہیں کیونکہ وہ تو محض نعمت پر خوشی ہے۔ منعم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہیں ہے اور دوسری وجہ شکر میں داخل ضرور ہے مگر ضعیف ہے البتہ تیسری وجہ شکر کا درجہ کمال ہے کیونکہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ مرحمت فرما دے اس پر اس وجہ سے خوش ہونا کہ یہ چیز کوئی کار آمد چیز ہے ٹھیک نہیں ہے کیونکہ شکر کے یہ معنی ہیں کہ اس پر اس وجہ سے خوش ہو کر اللہ عزّوجلّ تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ ایسی نعمت پر خوشی نہ پیدا ہو سکے جس کے سبب اللہ عزّوجلّ سے غفلت پیدا ہو جائے اور ذکرِ الٰہی بھول جائے' بلکہ ایسی حالت پر رنجیدہ ہو۔ ہاں جس نعمت کے ذریعہ سے دنیاوی تفکرات رفع ہوں اور اطمینانِ قلب نصیب ہو یعنی یادِ الٰہی میں اعانت حاصل ہو اس پر خوشی و مسرت ہونی چاہئے پس جو شخص شکر کا یہ درجہ کمال حاصل نہ کر سکے تو خیر وہ دوسرا ہی درجہ حاصل کر لے باقی پہلے درجہ کو تو شکر سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔

(iii) عمل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو اس کی رضا مندی میں استعمال کرنا اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ مخلوق کی پیدائش کے اغراض و مقاصد اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ کیا چیز کس کس کام کے لئے پیدا ہوئی ہے مثلاً آنکھ اللہ عزّوجلّ کی ایک نعمت ہے اور اس کا شکر یہ ہے کہ اس کو اللہ عزّوجلّ کی کتاب قرآنِ مجید اور علم دین کی کتابوں کے دیکھنے اور آسمان و زمین جیسی بڑی مخلوق کا اس غرض سے مشاہدہ کرنے میں صرف کرے کہ عبرت حاصل ہو اور خالق برتر کی عظمت و کبریائی سے آگاہی حاصل ہو نیز ستر کے دیکھنے اور عورت پر نظر ڈالنے سے اس کو روکے رکھے' اس طرح کان ایک نعمت ہے اور اس کا شکریہ یہ ہے کہ اس کو ذکرِ الٰہی اور ان باتوں کے سننے میں استعمال کرے جو آخرت میں نفع دیں اور ہجو' لغو اور فضول کلام سننے سے روکے زبان کو یادِ الٰہی اور حمد و ثنا اور اظہار شکر میں مشغول رکھے اور تنگ دستی یا تکلیف میں شکوہ یا شکایت سے باز رکھے کہ اگر کوئی حال بھی پوچھے تو شکایت کا کلمہ نہ نکلنے پائے کیونکہ شہنشاہ کی شکایت ایسے ذلیل و بے بس غلام کے سامنے زبان سے نکلی جو کچھ بھی نہیں کر سکتا معصیت میں داخل ہے اور اگر شکر کا کلمہ زبان سے نکل گیا تو طاعت میں شمار ہو گا۔ قلب کا شکریہ ہے کہ اس کو فکر و ذکر اور معرفت و اخلاص میں استعمال کرے اوصاف حمیدہ سے اس کو آراستہ کرے اور خصائل رذیلہ سے پاک اوصاف رکھے غرض ہاتھ پاؤں تمام اعضاء اور مال و متاع و عزت و جاہ سب کا شکر یہی ہے کہ ان کو اللہ عزّوجلّ کی طاعت میں مشغول رکھا جائے۔

اِتباعِ سنّت اور محبوب کے جلوے :۔

دراصل کمال درجہ کا شکر تو وہی بندے ادا کر سکتے ہیں جن کا شرح صدر ہو چکا ہو اور جن کے دلوں میں اللہ عزّوجلّ نے حکمت و معرفت کا نور بھر دیا ہے کہ وہ ہر چیز کے رموز اور اسرار سے واقف ہیں اور ہر شے میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھتے ہیں اور جس کو یہ درجہ حاصل نہ ہو اس کو سنت کا اِتباع اور حدودِ شریعت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے یعنی اس کو اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر مثلاً کسی محرم پر نظر ڈالی تو آنکھ کی

نعمت کا کفران ہوا نیز سورج اور تمام ان نعمتوں کی ناشکری ہوئی جن کو بصارت میں دخل ہے اور جن کے بغیر کچھ نظر نہیں آسکتا کیونکہ آنکھ کے بغیر بینائی کام نہیں دے سکتی اور سورج کے بغیر آنکھ بے کار ہے چنانچہ سب جانتے ہیں کہ اندھیرے میں آنکھ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی اور سورج اپنے وجود میں آسمان کا محتاج ہے پس آنکھ کی بدنظری کے گناہ سے گویا آسمان و زمین سب ہی کا کفرانِ نعمت ہو گیا۔

خلافِ شریعت امور بھی کفرانِ نعمت ہی ہیں :۔

یہی حال تمام گناہوں کا ہے کیونکہ تمام نعمتوں کا باہم تعلق ہے اور ایک کو دوسرے سے اور دوسرے کو تیسرے سے ایسا علاقہ ہے جو ذرا غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے یہاں سمجھانے کے لئے ایک مثال بیان کئے دیتے ہیں اور یہ وہ ہے کہ اللہ عزّ و جلّ نے ثمن یعنی سکہ روپیہ وغیرہ کو بمنزلہ حاکم کے بنایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے تمام اموال کی قیمت قرار پائے اور اشیائے مختلف کے ارزاں و گراں ہونے کا باہمی فرق و امتیاز ظاہر ہو پس اگر ثمن نقد یعنی چاندی و سونا نہ ہو تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے' کہ کپڑا زعفران کے بدلے کیونکر خریدا جائے اور اناج گھوڑے کے عوض کس طرح فروخت کیا جائے اس لئے کہ ان میں باہم کوئی مناسبت نہیں ہے اگر ہے تو صرف یہی ہے کہ نفس مالیت دونوں میں مشترک ہے یعنی ثمنیت اور نقدی جس کو چاندی و سونا کہتے ہیں کم و بیش دونوں میں پائی جاتی ہے اور یہی تمام چیزوں کی مقدار کا معیار ہے پس اگر کپڑا ایک روپے میٹر ہے اور زعفران پچاس روپے کلو تو اس سے اندازہ ہو گیا کہ پچاس میٹر کپڑے کے بدلے کلو بھر زعفران خریدنی چاہئے اور پچاس میٹر کپڑا کلو بھر زعفران کے مساوی ہے غرض یہ ثمن و نقدی نہ ہو تو جملہ معاملات میں رد و بدل ہوجائے اور جملہ اشیاء میں گڑ بڑ مچ جائے۔ اس لئے اگر کسی شخص نے اس کو اکٹھا کر کے زمین میں گاڑ دیا یا خزانہ بنا کر مقفل کر دیا تو گویا حاکم کو مسندِ حکومت سے اتار کر محض بیکار بنا دیا اور جس شخص نے اس کے برتن بنا لئے مثلاً پانی پینے کا گلاس اور سالن اتارنے کی رکابی تو گویا حاکم کو جولا ہے اور کاشت کار کے کام میں لگا دیا' حالانکہ یہ اوسط درجے کا کام دوسرے ادنیٰ درجے کے خدمت گزار بھی کر سکتے

تھے پس یہ سزا قید سے بھی زیادہ سخت ہوئی اور جس شخص نے سود لینا شروع کر دیا اور روپیہ کی لین دین کو مالی ترقی اور تکثیر مال کا ذریعہ بنا لیا کہ صرافہ کے ذریعہ سے چاندی سونے کی ذات کو مقصدِ تجارت ٹھہرا لیا تو اس نے گویا حاکم کو اپنا غلام بنا لیا تاکہ وہ گھاس کاٹ کر لایا کرے اور جھاڑو دے دیا کرے حالانکہ یہ سب صورتیں صریح ظلم ہیں اور حکمت الٰہی میں تغیر و تبدل کا پیدا کرنا گویا اللہ تعالیٰ سے عداوت ہے جس کی بنا پر محاسبہ و جنگ کا پیام دیا گیا غرض جس شخص کو نُورِ معرفت حاصل نہیں اور یہ رموز اس کو نظر نہیں آتے تو وہ شریعت کی زبان سے صورت تو سمجھ ہی لے گا اگرچہ معنی نہ سمجھے پس اس کو احکام شرعی سنائے جائیں گے کہ دیکھو اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ جو لوگ چاندی اور سونے کا خزانہ بناتے اور جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو قیامت کے دن جمع کئے ہوئے مال سے ان کے منہ اور پیٹھوں پر داغ دیئے جائیں گے اور سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس شخص نے چاندی یا سونے کے برتن میں پیا گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ کے گھونٹ اتار رہا ہے اللہ عزّ و جلّ فرماتا ہے کہ "جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ تو قیامت کے دن قبروں سے اس طرح اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ (بخاری و مسلم) ان آیات و احادیث سے معلوم ہو گیا کہ اموال اور اشیائے عالم کے حاکم یعنی زرِ نقد کا جمع کرنا اور برتن بنانے اور سود پر چلانے یعنی صرافہ کرنا تینوں حرام اور خلاف مقتضائے حکمتِ الٰہی ہیں ہاں اتنا فرق ہے کہ اہلِ بصیرت ان رموز و اسرار سے چونکہ واقف ہوتے ہیں لہٰذا ان کا علم دلائل اور احکام شرعیہ سے دوبالا ہو کر نُورٌ علیٰ نُور کا مصداق بن جاتا ہے اور نیک مسلمان جو ان اسرار تک نہیں پہنچ سکتے وہ حدود شرعیہ پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور جو لوگ اندھے اور جاہل ہیں وہ دونوں ہی سے محروم رہتے ہیں، سو ایسے ہی لوگوں سے جہنم بھری جائے گی۔

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ "اے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پر نازل کئے گئے احکامات کو جو شخص حق جانتا ہے وہ اور راہِ مستقیم سے اندھا شخص کیا برابر ہو سکتے ہیں ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "جس نے میری نصیحت سے اعراض کیا

اس کو تنگ معیشت ملے گی اور بروزِ قیامت اندھا اٹھایا جائے گا تب وہ پوچھے گا کہ مجھے اندھا کیوں اٹھایا' تو میں جواب دوں گا کہ میری نشانیاں تجھ تک پہنچی تھیں پس تو نے ان کو بھلا دیا تھا سو آج میں بھی تجھے اسی طرح بھلا دوں گا اور نشانیوں سے مراد یہی حکمت و مصلحت اور رموز ہیں جو ہر چیز کے پیدا کرنے میں ملحوظ ہیں اور جن انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ سے لوگوں کو مطلع کر دیا گیا کہ ہر زمانے میں حاملانِ شریعت علماء و فقہاء ان کو مفصّل بیان کرتے رہے پس یاد رکھو کہ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس میں حکمت اور رمز و خاصیت نہ ہو۔ پس جو شخص انہیں سمجھ جاتا ہے وہ تو سمجھ جاتا ہے اور جو نہیں سمجھتا وہ ان کا انکار کرنے لگتا ہے اور یہ انکار کرنا شکر کے خلاف ہے اور چونکہ شکر کا کامل درجہ وہی حاصل کر سکتا ہے جس میں سچا اخلاص ہو اور کسی عمل میں ماسوی اللہ کی نیت کا شائبہ بھی نہ ہو لہٰذا مناسب ہے کہ اخلاص اور صدق کا ذکر کر دیں۔

(۶) اخلاص اور صدق

اخلاص کا دارومدار مسلمان کی نیت پر ہے کیونکہ نیت ہی میں اخلاص ہوا کرتا ہے اور اخلاص کا کمال صدق ہے اور اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ نیت میں کسی شے کی آمیزش نہ ہو اس لئے ان تینوں رکنوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جاتا ہے۔

(ا) نیّت:۔

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ اے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پاس سے انہیں علیحدہ نہ کریں جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں درآنحالیکہ اسی کی ذات کو چاہتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ عمل سے اللہ عزّوجلّ کی ذات مقصود ہو۔ سرورِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ کچھ لوگوں کے اعمال نامے پیش ہوں گے تو اللہ عزّوجلّ فرمائے گا کہ ان کو پھینک دو کیونکہ ان اعمال سے اس شخص کو میری ذات مقصود نہ تھی اور کچھ لوگوں کا نامہ اعمال پیش ہو گا تو حکم ہو گا کہ فلاں فلاں عمل اور درج کر دو' فرشتے عرض کریں گے کہ یا الٰہی! وہ اعمال تو اس نے کئے ہی نہیں تھے حکم ہو گا کہ ان اعمال کی اس نے نیت تو کی تھی اور اس کا مجھے علم ہے (بخاری و مسلم) سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ذیشان ہے کہ آدمی چار قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جسے اللہ عزوجل نے مال بھی دیا اور علم بھی دیا اور بہ مقتضائے علم اس مال کو اللہ عزّوجلّ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو اس شخص کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اگر اللہ عزّوجلّ مجھے بھی مال اور علم مرحمت فرمائے تو میں بھی اسی طرح خیرات کروں یہ دونوں شخص اجر میں مساوی ہیں۔ تیسرا وہ شخص جس کو صرف مال عطا ہوا اور علم عطا نہیں ہوا اور یہ شخص جہالت کے سبب گڑ بڑ کرتا اور بے جا مال اڑا رہا ہے اور چوتھا شخص وہ ہے جو اس کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اگر مجھے مال مل جائے تو میں بھی اسی طرح مزے

اڑاؤں اور عیش کروں پس یہ دونوں شخص گناہ میں برابر ہیں۔

بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کا قصہ ہے کہ قحط سالی میں ریت کے ٹیلے پر اس کا گزر ہوا اور وہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ اگر یہ ریت کا ٹیلا اناج بن جائے تو میں اس کو لوگوں میں تقسیم کر دوں' اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے نبی علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اس شخص سے کہہ دو کہ اللہ عزّوجلّ نے تمہاری خیرات قبول کی اور نیک نیتی کی قدر فرمائی اور اسی قدر ثواب عطا فرمایا جتنا ٹیلا کی مقدار اناج کے مساکین پر خیرات کر دینے میں ملتا' خوب سمجھ لو کہ نیت کو عمل میں بڑا دخل ہے سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص عورت سے کسی مقدار مہر پر نکاح کرے اور اس کے ادا کرنے کی نیت نہ رکھتا ہو تو یہ نکاح نہیں بلکہ زنا ہے اور جو شخص کسی سے قرض لے کہ اس کے دینے کا قصد نہ ہو تو یہ قرض نہیں بلکہ چوری ہے۔
(طبرانی)

نیت کے معنی ارادہ اور قصد کے ہیں کہ جس سے کسی کام پر قدرت پیدا ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ہر کام کے لئے اول علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم کے بعد اس کے عمل میں لانے کا قصد و ارادہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ہاتھ پاؤں ہلانے اور اس کام کے کرنے کی قدرت پیدا ہوتی ہے گویا قدرت قصدؔ و ارادہ کی خادمہ ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ تمہارے اندر کھانے کی خواہش رکھی ہوئی ہے مگر وہ ایسی دبی ہوئی ہے کہ جیسے کوئی سویا ہوتا ہے اور جس وقت تمہاری نظر کھانے پر پڑی اور طعام کا علم ہوا اسی وقت وہ جاگ اٹھی اور اس کے کھانے کا قصد ہوا' اس کے بعد اس کی طرف ہاتھ بڑھے گا اور وہ قوت اپنا کام کرے گی جو خواہش طعام کے اشارے کی مطیع بنائی گئی ہے غرض آنکھ کے مشاہدے سے معرفت و علم حاصل ہو گا اور معرفت کی وجہ سے خواہش بیدار ہو گی اور قصد پیدا ہو گا اور یہ قصد خداداد قوت کے ذریعہ سے ہاتھ کو حرکت دلائے گا اور کھانا کھلائے گا اسی طرح تمہارے اندر ان لذتوں کی بھی خواہش رکھی ہوتی ہے جو تمہیں آخرت میں ملنے والی ہیں اور جن کا علم عقل اور شرع کے ذریعہ سے ہوا ہے اور قدرت چونکہ اس خواہش و میلان کی بھی خادم ہے

لہٰذا وہ اعضاء کو حرکت دے گی اور خواہش کو پورا کرے گی پس وہی عزم اور پختہ میلان جس نے وقت کو ہاتھ پاؤں ہلانے پر آمادہ کیا نیت کہلاتا ہے مثلاً جہاد میں جانے والا شخص اپنے گھر سے نکلا تو دیکھو کہ اس کو گھر سے باہر نکالنے کی محرک کیا چیز ہے یعنی اگر ثوابِ آخرت ہے تو بس یہی اس کی نیّت ہے اور اگر اس کا باعث مال غنیمت یا شہرت و نیک نامی کو حاصل کرنا ہے تو اسی کو اس کی نیّت کہا جائے گا۔

مسجد میں بیٹھتے وقت سات کاموں کی نیّت:۔

جب نیت کی فضیلت ضرورت اور تاثیر تمہیں معلوم ہو گئی تو اب ہر ہر عمل میں کئی کئی ثواب اللہ عزّوجلّ سے لینے کی کوشش کرنی چاہئے کیونکہ ممکن ہے کہ ہر عمل میں کئی نیتیں ہوں مثلاً مسجد میں جانا اور بیٹھنا ایک عبادت ہے مگر اس میں سات کاموں کی نیت ہو سکتی ہے۔

(i) یہ سمجھنا کہ مسجد اللہ تبارک وتعالیٰ کا گھر ہے اور یہاں آنے والا شخص گویا اللہ عزّوجلّ کی زیارت کو آتا ہے پس آتے وقت تم یہی نیت کرو کیونکہ سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص مسجد میں آیا وہ اللہ عزّوجلّ کی زیارت کو آیا ہے اور چونکہ زیارت کو آنے والے شخص کی عزت ہوا کرتی ہے لہٰذا اللہ عزّوجلّ اپنے زائر کو جتنی عزت و شان عطا فرمائے گا اسے تم خود سمجھ سکتے ہو کہ کیا کچھ ہو گا۔

(ii) ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی نیت کرو یعنی انتظار کرو کہ اللہ عزّوجلّ کی محافظت کے لئے خود کو محبوس بنائے ہوئے گویا وقف کئے ہوئے ہو پس اللہ عزّ و جلّ کے حکم **ورابطوا** کی تعمیل ہو گی اور اس کا اجر جداگانہ ملے گا۔

(iii) اعتکاف کی نیت کرو اور اعتکاف کے معنی یہ ہیں کہ آنکھ' کان' زبان' ہاتھ' پاؤں وغیرہ تمام اعضاء کو ان کی معمولی اور معتاد حرکات سے روک لیا جائے اور یہ بھی ایک قسم کا روزہ ہے۔ حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ میری امت کی رہبانیت یہی ہے کہ وہ مساجد میں آبیٹھیں۔

(جیسا کہ احیائے صلوٰۃ و سُنّت کی عالمگیر تحریک دعوتِ اسلامی کا ہر مبلغ مسجد میں اپنے بیان

کے آغاز ہی میں تمام شرکاء اجتماع کو سنّتِ اعتکاف کی نیت کرواتا ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو رفتہ رفتہ تمام نمازیوں کی عادت بن جاتی ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوتے ہی سنّت اعتکاف کی نیت فرمالیں۔)

(iv) خلوت کی نیت کرو کہ مشاغل مرتفع ہونے سے فکر آخرت کی استعداد پیدا ہو اور ذکر الٰہی کے سننے اور سنانے کے لئے تجرد و عزلت حاصل ہو۔ سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص مسجد کی جانب اس لئے روانہ ہو کہ اللہ عزّوجلّ کا ذکر کرے یا سنے تو وہ اللہ عزّوجلّ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی مثل ہے۔ (ابن ماجہ)

(v) اس کی نیّت کرو کہ جو لوگ بے نمازی ہیں ان کو تنبہ ہوگی اور نماز کو بھولے ہوئے لوگ بھی تمہاری دیکھا دیکھی نماز کو اٹھ کھڑے ہوں گے۔ پس تمہارا نماز کو جانا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بن جائے گا کہ کار خیر کی ترغیب دی اور گناہوں کے ارتکاب سے روکا اس وجہ سے ان کے ثواب میں تم بھی شریک ہوئے۔

(vi) مسجد میں جانے سے دوسرے مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ اخری فائدہ حاصل ہو گا جو تمہارے لئے زیادہ آخرت کا ذخیرہ بنے گا۔

(vii) اللہ عزّوجلّ کے گھر میں بیٹھو گے تو کچھ حیا و شرم آئے گی اور گناہ کی جرات کم ہو جائے گی کہ حاکم کی یاد اس کی مخالفت سے روکا کرتی ہے لہٰذا اس کی بھی نیت کرو' غرض اسی طرح ہر عمل میں کئی کئی نیتیں ہو سکتی ہیں جن کی بدولت گنتی کے چند عمل تمہارے حق میں ہزاروں نیکیاں بنیں گے اور حضراتِ مقربین کے اعمال کے ساتھ شامل ہو جاؤ گے' اسی طرح یہ بھی یاد رکھو کہ عمل میں معصیت کی نیت سے ایک گناہ کئی کئی گنا بن کر شیطان کے اعمال کے مساوی ہو جاتا ہے مثلاً مسجد میں آکر بیٹھنے سے فضول باتیں بنانی مقصود ہوں یا مسلمانوں کی ہتک و آبرو ریزی یا ہنسی ہی اڑانے کی نیت ہو یا عورتوں و بے ریش لڑکوں کا نظارہ مقصود ہو جو نماز کے لئے آئے ہیں یا تفاخر اور مناظرہ یا زبان درازی سے اپنے حریف کو ساکت کر کے حاضرینِ مسجد کے دلوں میں اپنی وقعت پیدا کرنی مقصود ہو یا اور کسی برے کام کی نیت ہو تو یہی ایک

فعل کئی گناہوں کا مجموعہ ہو جائے گا لہٰذا مناسب ہے کہ مباح کام کے اندر بھی اچھی نیت کر لینے سے غفلت نہ کی جائے کیونکہ امت کے غم خوار شافع روزِ شمار صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بروزِ قیامت بندے سے اس کے ہر کام کی باز پرس ہو گی حتیٰ کہ آنکھ میں سرمہ لگانے اور کسی کپڑے کو چھونے اور انگلیوں سے مٹی کریدنے تک کا سوال ہو گا کہ کیوں کیا تھا۔

مباح کام میں نیت :۔

مباح کام میں نیّت کرنے کی یہ صورت ہے کہ جمعتہ المبارک کے روز اگر خوشبو لگائی تو یہ نیت ہو گی کہ اپنی مالی خوشحالی ظاہر ہو یا یہ مقصد ہو گا کہ خوشبو سے نفس کو لذّت ملے گی یا یہ ہو کہ بن سنور کر جاؤں گا تو عورتیں میری طرف متوجہ ہو کر گرویدہ ہوں گی تو یہ سب نیتیں فضول اور بیکار ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ نیت ہو کہ جمعتہ المبارک کے روز خوشبو لگانا اِتباع سنت ہے' مسجد یعنی اللہ تعالیٰ کے گھر کی تعظیم ہے اور جمعتہ المبارک کا احترام ہے نیز اسلامی بھائیوں کو بدبو سے تکلیف سے بچانا اور اچھی خوشبو سے انہیں راحت پہنچانا اور غیبت کے دروازے کا بند کرنا ہے کہ لوگ بدبو سونگھیں گے تو دوسروں سے غیبت کرتے پھریں گے کہ فلاں شخص کے کپڑوں سے بڑی بدبو آتی تھی انہی دونوں طریقوں کی جانب حدیث مبارکہ میں اشارہ ہے کہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اللہ عزّوجلّ کے واسطے خوشبو لگائی وہ بروز قیامت ایسی حالت میں آئے گا کہ مشک سے زیادہ خوشبو اس سے مہک رہی ہو گی اور جو اللہ عزّوجلّ کے سوا کسی دوسری غرض سے خوشبو لگائے گا وہ ایسی حالت پر اٹھے گا کہ مردار سے زیادہ بدبو پھوٹ رہی ہو گی۔ (ابو الولید الصفاء مرسل)

(ب) اخلاص نیت :۔

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ لوگوں کو اسی کا حکم ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کریں مخلص بن کر اور وہی لوگ نجات پانے والے ہیں جنہوں نے توبہ کی اور اپنی حالت سنواری اور اللہ کو مضبوط تھاما اور اپنے دین میں اللہ کے واسطے اخلاص کیا۔

سرکارِ دو عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس شخص نے چالیس دن اخلاص کے ساتھ کوئی نیک عمل کر لیا تو اللہ عزوجل اس کے دل و زبان سے حکمت کے چشمے بہا دے گا۔ اخلاص کے معنی صرف یہ ہیں کہ نیت صرف ایک ہی شئے کی ہو یعنی عمل کا محرک یا تو صرف ریا ہو اور یا پھر محض رضائے الٰہی۔ ان دونوں پر اخلاص کے لغوی معنی صادق آتے ہیں کیونکہ خالص اسی شئے کو کہتے ہیں جس میں کسی دوسری جنس کی آمیزش نہ ہو مگر شرع کی اصطلاح میں اخلاص کے یہ معنی ہیں کہ محض اللہ عزوجل کی ذات مقصود ہو کیونکہ ماسوی کی جانب میلان اور قصد کرنے پر شرعاً" اخلاص کا اطلاق نہیں ہوتا جس طرح الحاد کے معنی مطلق میلان کے ہیں خواہ بھلائی کی جانب یا برائی کی طرف مگر شرعاً" صرف باطل کی جانب مائل ہونے کا نام الحاد ہے اسی طرح عبادت سے مقصود اگر محض عبادت ہے تب تو اخلاص کہلائے گا اور اگر اس میں ریا اور دکھاوے کی آمیزش ہے یا عبادت کے ضمن میں دنیا کے کسی فائدہ کا بھی ارادہ شامل ہے تو اس کو اخلاص نہیں کہیں گے مثلاً روزہ رکھنے سے مقصود یہ بھی ہو کہ روزہ رکھنا عبادت ہے اور یہ بھی مقصود ہو کہ کھانے پینے کا پرہیز کرنے سے بیماری کو بھی نفع ہو گا پس ایک کام میں دو نیتیں شامل ہوئیں تو اس کو اخلاص نہ کہیں گے یا مثلاً غلام کے آزاد کرنے سے یہ بھی مقصود ہو کہ یہ عبادت ہے اور یہ بھی مقصود ہو کہ اس طرح غلام کے کھانے کپڑے کے بوجھ سے سبکدوش ہو جائیں گے یا مثلاً حج سے یہ بھی مقصود ہو کہ وہ نیک کام اور عنداللہ محبوب ہے اور یہ بھی نیت ہو کہ حج کرنے سے سفر میں حرکت ہو گی اور حرکت سے مزاج، صحت و اعتدال پر آجائے گا یا اہل و عیال کی ذمہ داری سے چند روز کے لئے خلاصی مل جائے گی یا دشمنوں کی ایذاؤں سے کچھ دنوں کے لئے نجات حاصل ہو گی یا ایک جگہ رہتے رہتے دل اکتا گیا ہے پس سفر میں دل بھی بہل جائے گا یا مثلاً وضو کیا مگر اس نیت سے کہ لطافت حاصل ہو اور بدن کا میل کچیل دور ہو جائے یا مثلاً اعتکاف کیا تاکہ گھر کے کرایہ سے سبکدوش ہو یا کسی بیمار کی عیادت کی مگر اس نیت سے کہ تمہارے بیمار ہونے پر وہ تمہاری عیادت کو آئے یا مثلاً فقیر کو اس نیت سے کچھ دیا کہ

وہ سر ہو رہا اور غل مچا رہا تھا پس اس کا شور رفع ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ یہ سب خیالاتِ اخلاص کے منافی ہیں اور ان کا رفع ہونا دشوار ہے۔

اس لئے بعض اہلِ بصیرت کا قول ہے کہ اگر ایک ساعت بھی اخلاص حاصل ہو جائے تو نجات مل جائے حضرت سلیمان دارانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں مبارک ہو اس کو جس کا ایک قدم بھی ایسا اٹھا جس سے مقصود اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہو۔ حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ اپنے نفس کو مارتے اور فرمایا کرتے تھے کہ اے نفس اخلاص پیدا کر تاکہ خلاصی ہو مگر ہاں یہ ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ ان تینوں کی آمیزش کئی طرح ہوا کرتی ہے یعنی کبھی تو یہ نیتیں عبادت کی نیت پر غالب ہو جایا کرتی ہیں اور کبھی مغلوب رہتی ہیں اور کبھی مساوی ہوتی ہیں پس اگر مباح کاموں کے اندر رضائے الٰہی کا قصد کچھ بھی شامل ہو جائے گا تو اس کا بھی ثواب ضرور ملے گا مگر عبادت کے اندر اخلاص کا حکم ہے لہٰذا یہاں عبادت کی نیت کے ساتھ اگر دوسرے مقصود کی کچھ بھی آمیزش ہو گی تو اخلاص باطل ہو جائے گا اور اگر وہ آمیزش غالب ہے اور قصدِ عبادت مغلوب ہے تب تو عبادت بالکل ہی باطل اور بیکار ہے۔

(ج) صدق :۔

صدق ہی اخلاص کا کمال ہے اور یہ نیت کا تیسرا رکن ہے۔ اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ ہمارے بندے ہیں جو اپنے عہد میں سچے ثابت ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ انسان سچ بولتا اور اسی کا جویا بنا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ عزّوجلّ کے یہاں صدیق لکھا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت اللہ عزّوجلّ نے صدیق فرمائی ہے اور صدق کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ صدیقین کا درجہ ہے۔ صدق کے چھ درجے ہیں اور جو شخص چھیوں میں کمال حاصل کرتا ہے وہ صدیق کے خطاب کا سزاوار ہوتا ہے صدق کی قسمیں درج ذیل ہیں۔

(i) پہلا درجہ قول صدق کا ہے کہ ہر حالت میں سچ بولے اور اس کے کمال دو ہیں۔ اول تعریض سے خلافِ واقع مضمون سمجھتا ہے لہٰذا اس سے بھی احتراز کرے کیونکہ جھوٹ بولنے کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قلب کی صورت

میں کجی آتی ہے اور وہ حق کی تجلی کے قابل نہیں رہتا چنانچہ ایسے شخص کو خواب بھی سچا نظر نہیں آتا اور تعریض کا اگرچہ یہ ثمرہ نہیں ہوتا' تاہم اس کی صورت چونکہ جھوٹ کے مشابہ ہے اس لئے اندیشہ ضرور ہے پس صدیق کی شان کے مناسب یہی ہے کہ بلا ضرورت خاص دوسرے کو تعریض کے ذریعہ سے بھی واقع کے خلاف امر کا دھوکا نہ دے۔ دوسرے کمال یہ ہے کہ ان اقوال میں بھی صدق کا لحاظ رکھے جو اللہ عزوجل کے سامنے عرض کرتا ہے مثلاً نماز میں زبان سے کہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اللہ عزوجل کی طرف متوجہ کرتا ہوں' پس اگر ان کے دل میں بھی ماسوی اللہ عزوجل کا خیال نہیں ہے تب تو وہ قول میں سچا ہے ورنہ جھوٹا مثلاً کہتا ہے **ایاک نعبد وایاک نستعین ○** کہ میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں پس اگر دل کے اندر زر کی طلب اور مال کی محبت موجود ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے کیونکہ اظہار تو اللہ تعالیٰ کے معبود اور اپنے بندہ ہونے کا کر رہا ہے اور دل مال و دنیا کا غلام بنا ہوا ہے۔

(ii) دوسرا درجہ نیت میں سچا رہنے کا ہے یعنی ایسا اخلاص کہ جس میں عبادت اور فعل خیر کے قصد کے سوا کسی دوسرے قصد کی مطلق آمیزش نہ ہو۔

(iii) تیسرا درجہ عزم میں سچا بننے کا ہے' انسان اکثر عزم کرتا ہے کہ اگر مجھے مال ملا تو اتنی خیرات کروں گا یا مثلاً خیال ہوتا ہے کہ حکومت ہاتھ آئے تو عدل کروں گا اس کا نام عزم ہے مگر بعض لوگوں کے عزم میں پختگی ہوتی ہے۔ بعض میں تردد و تذبذب اسی طرح صدیقین کے عزم بھی متفاوت ہوتے ہیں جن میں اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اگرچہ جان جاتی رہے مگر عزم میں تذبذب نہ آنے پائے جیسے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری گردن اڑا دی جائے تو یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ اس گروہ پر حاکم بنوں گا جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں پس عزم کے قوی اور مضبوط ہونے ہی کا نام عزم صادق ہوتا ہے۔

(iv) چوتھا درجہ عزم کے پورا کرنے میں سچائی کا ہے کیونکہ اکثر انسان کا عزم تو پختہ ہوتا ہے مگر پورا کرتے وقت کاہل اور سست بن جاتا ہے مثلاً مال ہاتھ آیا تو

صدقہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور حکومت ملی تو عدل و انصاف نہ ہو سکا حالانکہ امتحان کا یہی وقت ہے کیونکہ دل میں عزم کر لینا تو کچھ دشوار نہ تھا۔ تکلیف اٹھانے کا موقع تو اس عزم کے پورا کرتے وقت ہی پیش آیا ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض شخص ایسے بھی ہیں جو اللہ عزّوجلّ سے عہد کر چکے تھے کہ اگر ہمیں مال عطا ہوا تو ضرور خیرات کریں گے مگر جب اللہ عزّوجلّ نے اپنے فضل سے ان کو مال مرحمت فرمایا ہے تو بخل کرنے اور منہ پھیرنے لگے انجام یہ ہوا کہ اللہ عزّوجلّ نے ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا۔

(v) پانچواں درجہ ظاہر و باطن یکساں ہو یعنی ظاہری حالت بھی وہی ہو جو واقع میں باطن کی حالت ہو مثلاً نرم چال چلے اور ظاہر کرے کہ طبیعت میں وقار ہے مگر حقیقت میں دل کے اندر وقار نہ ہو بلکہ محض لوگوں کے دکھانے کو ایسا کرے تو اس کا نام ریا ہے اور اگر مخلوق کے دکھاوے کا بھی خیال نہ ہو بلکہ محض غفلت و بے توجہی ہو تو اس کا نام اگرچہ ریا تو نہیں ہے مگر صدق بھی نہیں ہے بلکہ حالت کا دروغ اور جھوٹ ہے اس لئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ یا الٰہی میرا باطن میرے ظاہر سے بہتر بنا دے اور ظاہر حالت کو بھی صلاحیت عطا فرما۔

(vi) چھٹا درجہ دین کے مقامات اور مدارج میں سچائی کا ہے یعنی خوف و رجا اور محبت و رضا اور توکل و زہد وغیرہ کا وہ انتہائی مرتبہ حاصل کرے جو اسم بامسمیٰ بنا دے کیونکہ ابتدائی درجہ میں ان صفات کا صرف نام ہی نام ہوا کرتا ہے البتہ انتہائی درجہ میں پہنچ کر سچا خوف اور سچی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مومن وہی ہیں جو اللہ عزّوجلّ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے پھر نہ کچھ شبہ کیا اور نہ اللہ عزّوجلّ کے راستے میں اپنی جان و مال سے دریغ کیا یہی لوگ سچے ہیں۔ غرض صدق کے ان چھ درجوں میں کامل ہو جانے سے صدیق کا لقب عطا ہوتا ہے اور جس کو ان میں سے کوئی درجہ حاصل ہے اور کوئی نہیں تو اس کو اس مقدار کے موافق صدق کا مرتبہ حاصل ہو گا اور چونکہ صدق ہی کا درجہ یہ بھی ہے کہ دل اللہ عزّوجلّ کو رزاق سمجھ کر اس پر بھروسہ رکھے اور توکل کرے لہٰذا توکل کا بیان بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۷) توکل

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوگو اگر تم ایماندار ہو تو اللہ پر توکل کرو اللہ توکل کرنے والے کو محبوب سمجھتا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ اس کی تمام ضرورتوں کو کافی ہے۔ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تم کو رزق نہیں دے سکتے پس رزق اللہ ہی سے طلب کرو۔

سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر تم اللہ عزّوجلّ پر پورا توکل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح رزق دے گا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے یعنی بلا تعب و مشقت کہ صبح کو بھوکا اٹھتا ہے اور شام کو پیٹ بھرا واپس ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص اللہ عزّوجلّ کا ہو رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس طرح رزق پہنچاتا ہے کہ اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

توکل سے کیا مراد ہے؟

توکل کے معنی اس حالت کے ہیں جو اللہ عزّوجلّ کو یکتا فاعل و مختار اور تمام صفات کمالیہ میں مستقل و لا شریک سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد یہ حالت ایسے کام کراتی ہے جن سے توکل و اعتماد ظاہر ہوا کرتا ہے۔

اراکین توکل :۔

۱۔ معرفت :۔ توحید جس کا اقرار کلمۂ توحید سے ہوتا ہے کہ سوائے اللہ عزّوجلّ کے کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کا ملک ہے اور اسی کی حمد و ثنا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اس میں اس مضمون کا اقرار ہے کہ اللہ تعالیٰ قدرت' وجود اور حکمت میں وہ کمال رکھتا ہے جس کی وجہ سے حمد کا مستحق ہے پس جس نے صدق و اقرار کے ساتھ اس کا اقرار کرلیا اس کے دل میں اصل ایمان راسخ ہو گیا اور اب توکل کی حالت ضرور پیدا ہوگی بشرطیکہ دل سے اقرار کیا' صدقِ دل

کے یہ معنی ہیں کہ اس اقرار کے معنی دل پر ایسے غالب آجائیں کہ دوسرے مضمون کی اس میں گنجائش نہ رہے۔

۲۔ حال توکل :۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے کام اللہ عزّوجلّ کے حوالہ کر دو اور دل کو مطمئن رکھو کہ غیر اللہ کی طرف التفات بھی نہ کرو یعنی ایسے ہو جاؤ کہ جیسے کسی ہوشیار اور شفیق و غم خوار وکیل عدالت کو اپنے مقدمہ میں وکیل بنا کر مطمئن اور بے فکر ہو جایا کرتے ہیں کہ پھر کسی دوسرے کی جانب تمہارا دل متوجہ نہیں ہوتا کیونکہ سمجھتے ہو کہ تمہارا وکیل ہر طرح عقل مند اور تمہارا خیر خواہ ہے پس تمہارے حریف کو کبھی تم پر غلبہ نہ پانے دے گا اور مخالف سے اس کے سامنے بات ہی نہ کی جائے گی' اسی طرح جب جانتے ہو کہ رزق اور موت و حیات اور مخلوق کے چھوٹے بڑے سارے کام اللہ عزّوجلّ کے قبضہ میں ہیں کوئی اس کا شریک نہیں ہے نہ اس کی جود و سخا اور حکمت و رحمت کی انتہا ہے پھر وجہ کیا ہے کہ اپنے دل کو مطمئن نہ بناؤ۔ اگر اتنا جان کر بھی توکلؔ نہ ہو تو سمجھ لو کہ اس کا سبب دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہے یعنی یا تو پورا یقین ہی حاصل نہیں ہے اور نعوذباللہ اللہ تعالیٰ کے رزاق و باقدرت سمیع و بصیر ہونے میں کچھ شک ہے یا یقین تو ہے مگر دل پر اس علم اور یقین کا اثر نہیں ہوا بلکہ ایسی حالت ہے جیسے اس یقین کی ہوا کرتی ہے کہ اس کا یقین اور اس کا علم ہونے کے باوجود کہ ضرور ایک دن مرنا اور دنیا کو چھوڑنا ہے ایسے نڈر ہیں کہ اس کا کچھ فکر نہیں کرتے سبب اس کا صرف یہی ہے کہ دل پر اس یقین کا پورا اثر نہیں ہے یا دوسرا سبب یہ ہے کہ تمہارا دل پیدائشی طور پر ضعیف و کمزور واقع ہوا ہے اور تم بزدل ہو کہ کمزور دل کی وجہ سے تمہارا دل ایسے اوہام کا محکوم و مطیع ہو گیا ہے جو یقیناً باطل اور محض لاشئے ہیں جس طرح مردہ کے پاس اس کے بستر پر لیٹ کر سونے سے اکثر ڈر معلوم ہوتا ہے حالانکہ معلوم ہے کہ یہ مردہ ہے اور کچھ نہیں کر سکتا مگر پھر بھی اس کے بستر پر لیٹ کر نیند نہیں آتی اور ڈر معلوم ہوتا ہے تو یہ واہیات توہمات ہی کی تو اطاعت ہے جس نے کمزور دل کو یقین پر عمل کرنے نہ دیا مثلاً بعض آدمیوں کو شہد کے کھانے سے نفرت ہونے لگتی ہے

محض اس وہم کی وجہ سے کہ اس کا رنگ گوبر کے رنگ کے مشابہ محسوس ہوتا ہے حالانکہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ شہد ہے گوبر نہیں اور محض رنگ کی مشابہت کوئی چیز نہیں ہے مگر پھر بھی اس کو کھا نہیں سکتا اور یہ وہم ہی کا اثر ہے جس سے انسان کا بچنا دشوار ہے اسی طرح ممکن ہے کہ توحید کا یقین کامل ہو اور نام کو بھی شبہ یا شک نہ ہو مگر اسباب کے اختیار کرنے میں نفس مجبور ہو جائے اور اعتماد کامل جس کا نام توکل ہے حاصل نہ ہو سکے۔

۳۔ اعمال :۔

جاہلوں کا خیال ہے کہ توکل تو محنت اور مزدوری اور کسب کے چھوڑ دینے کا نام ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیکار بیٹھ جائے اگر بیمار ہو تو علاج نہ کرے سوچے سمجھے بغیر خود کو خطرات اور ہلاکت میں ڈال دیا کرے کہ کہیں آگ میں گھس جائے اور کہیں شیر کے منہ میں ہاتھ دے دے تب متوکل کہلائے حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا شرعاً" حرام ہے اور شریعت ہی توکل کی خوبیاں بیان کر رہی ہے' پھر بھلا جس بات کو شریعت ہی خود حرام بتائے اسی کی رغبت اور حرص دلائے گی یہ کیونکر ہو سکتا ہے اصل بات یہ ہے کہ انسان کی سعی اور کوشش اکثر چار وجہ سے ہوا کرتی ہے یعنی یا تو کسی ایسی نافع چیز کے حاصل کرنے میں سعی ہوتی ہے جو حاصل نہیں ہے یا موجودہ نفع کی حفاظت میں سعی ہوتی ہے یا کسی آنے والے نقصان کے روکنے میں یا موجودہ نقصان کے روکنے میں پہلی صورت جلب منفعت کہلاتی ہے اور اس کے تین سبب ہیں کہ یا تو سبب اختیار کرنے میں نفع کا حصول یقینی ہو یا اس کا غالب گمان ہو یا محض موہوم ہو' یقینی کی مثال یہ ہے جیسے کوئی شخص بھوکا ہو اور کھانا بھی اس کے سامنے رکھا ہو مگر وہ ہاتھ نہ بڑھائے اور نوالہ بنا کر منہ تک نہ لے جائے اور کہے کہ میں متوکل ہوں یا مثلاً بیٹے کا طالب ہو مگر بیوی سے جماع نہ کرے یا مثلاً غلہ کا خواہاں ہو مگر بیج کھیت میں نہ ڈالے سو ایسا خیال تو محض جہالت ہے کیونکہ ان اسباب پر مسبب کا وجود یقینی ہے جن کو اللہ عزّوجلّ نے قاعدہ کے طور پر تجویز فرما دیا ہے اور اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا' پس اس بات کا اختیار کرنا شرعاً" ضروری ہے

البتہ ان اسباب میں توکل کرنے کی دو صورتیں ہیں اول اس کا خیال رکھے کہ طعام اور ہاتھ اللہ عزّوجلّ کے عطا کردہ اور کھانے کی قدرت بھی اس کی عطا کی ہوئی ہے اسی طرح بیج اور کھیتی کرنے کی استعداد اسی نے عطا فرمائی ہے' اسی طرح بیوی اور نطفہ اور جماع کی طاقت سب اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ دوم یہ کہ ان اسباب پر بھی دل سے بھروسہ نہ ہو' بلکہ دل سے خالق ہی پر بھروسہ رہے کیونکہ دل سے اسباب پر بھروسہ کرنا سراسر بے وقوفی ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ ابھی ہاتھ پر اگر فالج کا اثر ہوجائے یا مثلاً کھانا زمین ہی پر گر جائے یا بیج کو کیڑا لگ جائے یا اولہ گر پڑے یا گرمی کھا جائے تو مقصود کی صورت بھی نظر نہ آئے' الغرض ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھ کر سعی اور کوشش کرنے اور اسباب کے اختیار کرنے میں ہمیں نہ کچھ مضائقہ ہے اور نہ اسباب کا اختیار کرنا توکل کے خلاف ہے۔ دوسری حالت مسبب پر مرتب ہونے کے متعلق غالب گمان کی تھی' مثلاً جنگل کا سفر کرتے وقت توشہ ساتھ رکھنا کہ اگر توشہ نہ لیا جائے تو مرنا یقینی تو نہیں ہے تاہم گمان یہی ہے کہ زادِ راہ کے بغیر جنگلوں کا سفر سببِ ہلاکت ہے تو ایسے سبب کا اختیار کرنا خلافِ توکل نہیں بلکہ سلف کا طریقہ اور صلحاء کا معمول رہا ہے البتہ اعتماد اللہ تعالیٰ ہی کے فضل پر ہونا چاہئے اگر زادِ راہ کو چوری اور ڈاکہ سے محفوظ اور گلنے سڑنے سے بچائے گا اور زندگی قائم رکھ کر اس کے کھانے کی قوت کو بحال رکھے گا تو یہ کھانا استعمال میں آئے گا۔ اور سبب قوت و حیات بنے گا ورنہ کچھ بھی نہیں۔ تیسری حالت موہوم کی ہے (یعنی مسبب کے سبب پر مرتب ہونے کا وہم ہو) مثلاً زیادہ معاش کے حاصل کرنے میں حد سے زیادہ کوشش کرنا کہ کوشش و محنت زیادہ کریں گے تو مال زیادہ ملے گا یہ حالتِ حرص و طمع کہلاتی ہے اور اس کی بدولت بسا اوقات مشتبہ مال حاصل کرنے کی نوبت تک آجاتی ہے نیز یہ صورتِ توکل کے بھی خلاف ہے چنانچہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ توکل کے جو اوصاف ارشاد فرمائے ان میں یہ نہیں فرمایا کہ وہ شہروں میں نہیں رہتے یا کسب و حرفت نہیں کرے۔

جن اسباب سے مسبب کا حاصل ہونا موہوم نہ ہو بلکہ غالب یا یقینی ہو جیسے سفر

میں توشہ رکھنا یا پیٹ بھرنے کے لئے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا اور چبانا وغیرہ یہ سب خلافِ توکل نہیں ہے۔ دوسری صورت یعنی آئندہ کے نفع کی سعی اور کوشش کرنا ہے کہ جس کو تدبیر کہتے ہیں اور منجملہ اسباب و تدابیر کے اناج بھر لینا یا آئندہ کے لئے ذخیرہ جمع کر رکھنا ہے لیکن اگر متوکل کو مال عطا ہو اور وہ سال بھر یا زیادہ کے لئے ذخیرہ جمع کرے تو توکل جاتا رہے گا اور اگر ایک دن کی خوراک رکھ کر باقی سب بانٹ دے تو توکل میں کامل سمجھا جائے گا اور اگر چالیس دن کا انتظام کرے تو اس میں اختلاف ہے۔ حضرت سہل تستری رحمتہ اللہ علیہ یونہی فرماتے ہیں کہ توکل کے خلاف ہے اور بعض دیگر صلحاء نے اس کو خلافِ توکل نہیں سمجھا البتہ اگر یہ شخص عیال دار ہو تو جن متعلقین کا نان و نفقہ اس کے ذمہ ضروری ہے ان کے لئے سال بھر کا ذخیرہ کر لینا خلاف توکل نہیں ہے تو ایسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ازواجِ مطہرات کو سال بھر کا نفقہ مرحمت فرما دیا ہاں اپنی ذاتِ مبارکہ کے لئے ہمیشہ یہ حالت رکھی کہ اگر صبح کو مل گیا تو شام کے لئے جمع کر کے نہ رکھا اور شام کو ملا تو صبح کے لئے کچھ نہ رکھا اور سال بھر سے زیادہ کا انتظام کرنا بیوی بچوں کے لئے بھی توکل کے خلاف ہے کیونکہ اول تو دوسرے وقت کا انتظام طویل خواہش ہے کہ زندگی کا بھروسہ گھنٹہ بھر کا بھی نہیں ہے' پھر دوسری بھوک کے لئے جمع کرنا کیسا؟ اور یہی وجہ ہے کہ جتنا کسی کو اس طویل خواہش سے بعد ہو گا اسی قدر اس کا درجہ بڑھا ہوا ہو گا مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی عادتِ جاریہ یوں قرار پائی ہے کہ ہر سال اپنی مخلوق کے لئے نیا رزق اور نیا دانہ مرحمت فرماتا ہے لہٰذا ایک عطا سے لے کر دوسری عطا کے وقت تک کے لئے ذخیرہ فراہم رکھنے کی بضرورت عیال داری گنجائش نکل آئی کہ ضعیف لوگوں کے ساتھ ہے کہیں پریشانی لاحق ہ ہ باقی سال بھر سے زیادہ کے لئے جمع کرنا قناعت ورجہ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔ البتہ گھر کا سامان یعنی برتن آب خورہ لوٹا وغیرہ چونکہ ہر سال نیا پیدا نہیں ہوتا اور اس کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے' لہٰذا اس کے سال بھر سے زیادہ کے لئے ذخیرہ جمع کر لینے میں کچھ حرج نہیں ہے مگر کپڑے کا آئندہ سال کے لئے رکھ

چھوڑنا بیشک توکل کے خلاف ہے کیونکہ اس کی ہر وقت ضرورت نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ جاڑے کا کپڑا گرمی میں کام نہیں دیتا اور گرمی کا کپڑا جاڑے میں بیکار ہے اور اسی بنا پر سرکار دو عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درویش کی بابت فرمایا کہ قیامت کے دن ایسا اٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہو گا لیکن اس کی عادت یہ تھی کہ جب جاڑ آتا ہے تو گرمی کے کپڑے آئندہ سال یعنی دوسری گرمی کے لئے رکھ چھوڑا کرتا تھا پس اگر یہ عادت نہ ہوتی تو اس کا چہرہ چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح دمکتا تیسری صورت یعنی موجودہ تکلیف یا آنے والے نقصان کے دفع کرنے کی کوشش کرنا ہے مثلاً درندہ کو دیکھ کر بھاگ جانا یا جھکی ہوئی دیوار کے پاس سے ہٹ جانا کہ گر نہ جائے یا مرض کا علاج کرنا کہ جاتا رہے اور صحت حاصل ہو جائے سو اس کے بھی مختلف مراتب ہیں جن کو مذکورہ بالا مضمون پر قیاس کر کے تم خود سمجھ سکتے ہو کیونکہ اسباب پر مسبب کا حصول یقینی ہو گا یا بظن غالب یا مذموم اور ہر ایک کا حال تمہیں معلوم ہو چکا ہے پس ہر صورت کا علم معلوم کر لو۔

مضبوط اور کمزور دل لوگوں کا توکل :۔

جن لوگوں کی نظر وسیع، قلب مضبوط و مستحکم، یقین کامل اور اذعان قوی ہوں تو ایسے لوگوں کے یہی شایانِ شان ہے کہ اگلے دن کا بھی ذخیرہ جمع نہ کریں جبکہ کمزور دل لوگوں کو زیبا نہیں کہ ان کی حرص کریں بلکہ اگر ایسی حالت ہو کہ ذخیرہ فراہم کرنے سے قلب کی پریشانی کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کے لئے اس توکل کو ترک کرنا اور ذخیرہ مہیا کرنا ضروری ہے تاکہ قلب کو فراغ و سکون حاصل ہو اور عبادت صحیح ہو سکے کیونکہ طبیعت کے فکر و انتشار میں جس نقصان کا اندیشہ ہے اس کی اصلاح سب سے مقدم ہے، ہاں جن لوگوں کو قوتِ ایمان اور قلبی اطمینان حاصل ہے ان کو تو زادِ راہ لئے بغیر سفر کرنا بھی جائز ہے بشرطیکہ سات روز تک بھوک پر صبر اور گھاس پات پر قناعت کر سکیں کیونکہ گھاس پات تو جنگل میں بھی ملنا غالب ہے لیکن ضعیف الایمان شخص اگر ایسا کرے گا تو گناہ گار ہو گا کیونکہ وہ جس صورت کو اپنے خیال میں ہلاکت سمجھتا ہے اس میں اپنے قلب کو ڈال رہا ہے اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں

ڈالنا حرام ہے۔

اسی طرح قوی الایمان شخص کو بھی پہاڑ کی کھوہ میں جا بیٹھنا کہ وہاں نہ گھاس پات ہو نہ کسی بشر کا گزر ہو جائز نہیں ہے کیونکہ ایسی جگہ رزق پہنچانا اگرچہ قدرت الٰہی میں داخل ہے مگر عادت کے خلاف ہے اور اسی لئے اگر کسی شخص کو ایسی جگہ رزق ملا ہے تو وہ اس کی کرامت کہلائی اور چونکہ بندہ کو زیبا نہیں ہے کہ آقا کو عادت کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرے لہٰذا یہ صورت قوی الایمان کے لئے جائز نہیں ہے جنگل میں توشہ لئے بغیر سفر کرنا تو اس وجہ سے جائز تھا کہ اللہ عزّوجلّ کی عادت کریمہ یوں جاری ہے کہ جنگل گھاس سے خالی نہ ہو اور آدمیوں کا بھی وہاں سے اکثر گزر ہوتا رہتا ہے کہ جب قوت ایمان حاصل ہے تو ایسی صورت میں ہلاکت غالب نہیں لہٰذا گناہ بھی نہیں ہے مگر ویران اور سوکھے پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھنا تو عادت الٰہی کے توڑنے کی خواہش کرنا ہے اور یہ جائز نہیں ہے خلاصہ یہ ہے کہ اگر معاش کے روشن اور واضح اسباب کی طرف سے توجہ ہٹا کر جنگل کی گھاس پر قناعت کرے اور اللہ عزّوجلّ کے لطف و حکمت پر بھروسہ رہے تو بہتر ہے۔

(۸) محبت

اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ اللہ نیک بندوں سے محبت کرتا ہے اور نیک بندے اللہ سے محبت کرتے ہیں اور حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ جب تک تمہارے نزدیک اور اللہ عزّوجلّ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہوں اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہ ہو گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو اللہ عزّوجلّ کی محبت کا مزہ آجاتا ہے اس کو دنیا کی طلب بالکل ہی نہیں رہتی اور وہ آدمیوں سے وحشت کھانے لگتا ہے' اہل کلام و فلسفی چونکہ اللہ عزّوجلّ کی محبت کے معنی نہیں سمجھے اس لئے وہ اس کے منکر ہو کر یوں کہنے لگے کہ جس ذات کا کوئی مثل نہیں ہے اس کو ہماری طبیعت کے ساتھ مناسبت پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ ہماری عقل اس کا پورا ادراک کر سکتی ہے لہٰذا اس کی محبت کے بجز اس کے کوئی معنی نہیں کہ اس کے احکام کی تعمیل اور ارشاد کی تعمیل کی جائے۔ یہ بے چارے چونکہ حقیقت سے ناواقف ہیں' ان کا خیال ہے کہ محبت اپنے ہم جنس ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے ان کی عقل و فہم حقیقت کو معلوم نہ کر سکی۔ ہم اس جگہ مختصر طور پر محبت کی حقیقت بیان کرتے ہیں تاکہ اصل بات معلوم ہو سکے' جاننا چاہئے کہ ہر لذیز چیز انسان کو محبوب ہے اور محبوب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ طبیعت اس کی طرف کھینچتی اور نفس اس کی جانب مائل ہوتا ہے یہی میلانِ طبیعت بڑھ جاتا ہے تو عشق کہلانے لگتا ہے اسی طرح کسی چیز کے ناپسند اور مبغوض ہونے کے یہ معنی ہیں کہ طبیعت اس سے نفرت کرتی ہے اور دل تکلیف پاتا ہے پس جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب غور کرو کہ جتنی چیزیں تم اپنے حواس کے ذریعہ سے ادراک کر سکتے ہو یا وہ تمہاری طبیعت کے موافق ہوں گی اور یا مخالف ہوں گی اور یا ایسی ہوں گی کہ نہ مخالف ہیں نہ موافق۔ پس جو چیزیں طبیعت کے موافق ہیں وہ محبوب و لذیذ ہیں اور جو طبیعت کے مخالف ہیں وہ مبغوض و ناگوار ہیں اور جو چیزیں طبیعت کے موافق ہیں نہ مخالف ان میں نہ لذّت آتی ہے اور نہ ان سے نفرت ہوتی

ہے بلکہ ایک سی (مساوی) حالت رہتی ہے اور لذت ہمیشہ ادراک کے بعد حاصل ہوا کرتی ہے مگر ادراک دو قسم کے ہیں ایک ادراک ظاہری اور ایک ادراک باطنی۔ پس ظاہری ادراک تو حواس خمسہ کے ذریعہ ہوا کرتا ہے مثلاً آنکھ کو حسین و خوبصورت کے دیکھنے سے لذت آتی ہے اور کان کو موزوں اشعار اور خوش الحان کے گانے اور سریلی آواز کے سننے میں مزہ آتا ہے اور زبان و ناک میں چکھنے اور سونگھنے کا حس رکھا ہوا ہے مزے دار کھانوں اور خوشبو دار پھولوں میں لذت حاصل ہوتی ہے اور تمام بدن کی قوتِ لامسہ (چھونے کی) کو نرم و ملائم اور نازک چیز کے چھونے میں مزہ آتا ہے اور یہی چیزیں نفس کو محبوب ہیں یعنی بالطبع نفس ان کی جانب مائل ہوتا ہے اسی طرح انسان کو ایک چھٹی حس اور بھی مرحمت ہوئی ہے جو ادراک باطنی کہلاتی ہے اور اس کی جگہ قلب ہے اس چھٹی حس کو کبھی عقل کہہ دیتے ہیں کبھی نور اور کبھی چھٹا حاسہ غرض نام جو کچھ بھی ہو مقصود یہ ہے کہ باطنی ادراک بھی حواسِ ظاہری کی طرح اپنے موافق اور مناسب چیز سے لذت حاصل کرتا ہے۔

چنانچہ سرکارِ دو عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں میری محبوب بنائی گئیں یعنی خوشبو، عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے اور ظاہر ہے کہ خوشبو سے قوت شامہ کو لذت ملتی ہے اور خوبصورت عورت سے قوتِ باصرہ اور قوتِ لامسہ کو، مگر نماز کی لذت حواسِ خمسہ ظاہری میں سے کسی حس کو بھی نہیں ملتی ہاں اس کی لذت اسی چھٹی حس کو ملتی ہے جو باطنی ہے اور جس کا مقام دل ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس کا دل بیکار ہے وہ نماز میں کبھی لذت نہیں پا سکتا۔ اس لذت کا ادراک سلیم القلب شخص ہی کو ہو سکتا ہے اور انسان کی خصوصیت اسی چھٹی حس کی وجہ سے ہے۔ وجہ حواس ظاہری میں تو تمام حیوان مشترک ہیں چنانچہ جانوروں کو بھی اچھی صورت اور عمدہ آواز اور ذائقہ اور کھانے اور خوشبو سونگھنے اور نازک چیز کے چھونے کی رغبت ہوتی ہے البتہ انسان حُسنِ ظاہری کا آنکھوں کی بصارت سے حسین عورتوں کی لذت حاصل کرتا ہے بصیرت سے باطنی خوب سیرتوں کا مزہ اٹھاتا ہے بشرطیکہ قلب کی آنکھوں میں بینائی بھی ہو مگر

شاید تم باطنی خوب سیرتی اور اس کی لذت کو نہ سمجھ سکو کہ کیا چیز ہے لہٰذا میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنے نفس کو ٹٹولو اور دیکھو کہ اس میں انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اولیاء کرام رحمتہ اللہ علیہم اجمعین اور علماء کرام کی محبت ہے یا نہیں؟ نیز اگر بادشاہ منصف و بہادر اور سخی و عاقل اور اپنی رعیت پر مہربان ہو اور دوسرا ظالم و بزدل بخیل ناسمجھ اور اپنی رعیت کے ساتھ سخت دل اور بدمزاج ہو تو ان دونوں میں تمہارا دل کچھ امتیاز اور فرق کرتا ہے یا نہیں اگر کرتا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک کی جانب دل کھنچتا ہے اور دوسری طرف نہیں کھنچتا بلکہ نفرت کرتا ہے اگر غور کرو گے تو سمجھ لو گے کہ یہ وہی باطنی ادراک ہے جو باطنی خوب سیرتی میں لذت پا رہا ہے اسی طرح جس وقت مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت اور بہادری یا ظل اللہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیاست و عمل داری یا خلیفتہ الحق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سچائی و جاں نثاری کے قصے سنتے ہو تو ایک امنگ اور مسرّت اور ان مثالی ہستیوں کی طرف ایک قسم کا ایسا میلان پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اظہار نہیں ہو سکتا، اس سے زیادہ صاف بات سمجھو تو غور کرو کہ لوگوں کو اپنے مقتدائے مذہب اور صاحبِ شریعت امام کے ساتھ اتنا تعلق ہو جاتا ہے کہ جان اور مال کے خرچ کرنے میں ان کو مطلق دریغ نہیں ہوتا حالانکہ ان کی آنکھوں نے ان کی صورت بھی نہیں دیکھی اور اگر دیکھتے بھی تو شاید اتنی محبت نہ ہوتی کیونکہ آنکھ کی لذّت دوسری قسم کی ہے اس لذت میں اس لذت میں بہت فرق ہے اور اگر محبت ہوئی بھی تب بھی یہ محبت جو ان اوصافِ حمیدہ کے ذریعہ سے ہوئی ہے محل گفتگو ہوئی کہ بتاؤ یہ لذت کس حاسہ سے ادراک کی گئی ظاہر ہے کہ یہ وہی چھٹی حس ہے جس کی جگہ دل میں ہے کیونکہ دل ہی تو ہے جس نے ان پیشواؤں میں وہ باتیں پائیں جن سے دل کو لذّت حاصل ہوئی ہے۔

محبّت کے اسباب :-

اب اگر ان اوصاف کو تلاش کرو گے جن کی وجہ سے یہ محبت حاصل ہوئی ہے تو وہ تین وصف نکلیں گے یعنی قدرت اور بے عیب ہونا کیونکہ مقتدایان دین کو اللہ

تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل ہے اور وہ اللہ عزّوجلّ کے پیغمبروں کی شریعت کے وقائق اور حقائق سے واقف ہیں۔ دوم انہوں نے اللہ عزّوجلّ کی دی ہوئی قدرت سے کام لیا کہ اپنے نفس کو مغلوب بنایا اور نفسانی شہوتوں کو مٹایا اور حق کی سیدھی راہ پر قائم اور جمے رہے نیز طاقت کو کام میں لا کر اللہ عزّوجلّ کے برحق دین کی تلقین کر کے لوگوں کو سیدھا راستہ بتایا اور عیوب باطنی سے پاک صاف نظر آئے کہ جہالت سے بخل سے حسد سے کینہ سے اور بغض و عداوت سے غرض تمام بدخلقیوں سے بے عیب اور تمام عمدہ عادتوں اور اخلاق حسنہ سے متصف پائے گئے۔ یہی تین اوصاف ہیں جن کی وجہ سے ان میں وہ حس پیدا ہوا جس کو حیوانات نہیں سمجھ سکتے یہ انسان ہی کی خصوصیت ہے کہ قلب کی چھٹی حس سے اس باطنی حسن کا ادراک کرتا اور اس میں لذت پاتا ہے غرض تمہیں جب ان اوصاف کی وجہ سے پیشوایانِ مذہب یعنی اماموں کے ساتھ محبت ہو گئی تو ظاہر ہے کہ سرکارِ مدینہ سرور قلب و سینہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ کمالاتِ بدرجہ اتم موجود ہیں لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کے ساتھ جو محبت ہو گی وہ دنیا بھر کے علماء کرام و اولیاء کرام رحمتہ اللہ علیہم و انبیاء کرام علیہم السلام سے بڑھی ہوئی ہو گی۔ اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول بنانے والی اور پیدا کرنے والی ذات پر نظر ڈالو جس نے تم پر اپنے احسان فرمائے کہ ہزارہا انبیاء علیہم السلام تبلیغ کے لئے بھیجے اور پھر اپنا محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تمہاری طرف مبعوث فرمایا۔

اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کے علم ازلی پر نظر ڈالو تو ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے کہ کہیں اس کا کنارہ ہی نہیں کوئی ذرہ بھی اس کے علم کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا، آسمان و زمین، عرش و کرسی، لوح و قلم، شجر و حجر غرض جو شئے خیال یا ذہن میں بھی نہیں آسکتی وہ اس علام الغیوب کے علم ازلی میں موجود ہے۔ غرض انبیاء علیہم السلام میں جو کچھ بھی صفات نظر آتی ہیں وہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا عکس ہوتی ہیں پھر جب دھوپ کی جانب باوجود اس کے عارضی اور آفتاب کے سایہ ہونے کے تمہارا

نفس میلان کرتا ہے تو اس کے مبداء ومصدر یعنی ابتداء کی جگہ (آفتاب) کی جانب کیوں مائل نہ ہو گا اور جب مستعار صفات کی جانب سے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اس قدر محبت ہے تو مبداء صفات یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کیوں نہ ہو گی۔

محبّت کا ادنیٰ درجہ :۔

اس پر بھی اگر تمہاری باطنی بصیرت اللہ تبارک وتعالیٰ کے جلال و جمال کا ادراک نہ کر سکے اور عشق نہ پیدا ہو تو کم سے کم اتنا تو ضرور کرو کہ اس کے احسانات و انعامات کو شمار کرو کہ کس قدر ہیں اور ظاہر ہے کہ تم ان کو ہرگز شمار نہ کر سکو گے تو کیا اس سے گئے گزرے ہوئے کہ اس کو اپنا محسن ہی سمجھ کر محبوب سمجھو اور نفس کو اس کی جانب مائل و متوجہ کرو' دنیا کی جس چیز میں بھی تمہیں لذّت حاصل ہوتی ہے اسے سوچو اور غور کرو کہ اس کا دینے والا باقی رکھنے والا کون ہے' ذرا سی توجہ سے معلوم ہو جائے گا کہ کوئی لذت' کوئی مزہ اور کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا دے سکے' پھر کیا اپنے محسن کے ساتھ تمہیں محبت نہیں ہوا کرتی اگر ہوتی ہے تو اللہ عزّوجلّ کے ساتھ اصلی محبت کا ہونا ضروری اور مقدم ہے اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر فرشتوں کی طرح تمہیں اللہ عزّوجلّ کے ذاتی جلال و جمال کی وجہ سے اس کی محبت نہ ہو تو عام مخلوق کی طرح اس کو اپنا محسن ہی سمجھ کر اس سے محبت کرو کہ اس حدیث کا منشا پورا ہو جائے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرو کہ وہ تمہیں غذا دیتا ہے اور مجھ سے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے محبت فرماتا ہے (ترمذی و حاکم) یہ محض ضعیف اور کم درجے کی ہے کیونکہ احسانات کے کم و بیش ہونے سے محبت بھی کم و بیش ہوتی رہے گی سو اس قسم کی محبت کرنے والا شخص اس غلام کے مثل ہے جو اپنے مطلب کی محبت رکھے اور اس نیت سے خدمت کرے کہ مزدوری ملے گی اور اپنا پیٹ بھرے گا۔

محبتِ الٰہی:-

اصل اور کامل محبت یہ ہے کہ اللہ عزّوجلّ کے ساتھ ان صفاتِ محمودہ اور جلال و جمال کی وجہ سے محبت ہو جس میں اس کی ذات لاشریک ہے اور کوئی اس کا ہم پلہ نہیں، اسی لئے اللہ عزّوجلّ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی جانب وحی فرمائی تھی کہ مجھے سب سے زیادہ پیارا وہ بندہ ہے جو میری عطا اور احسان کے بغیر محض حق ربوبیت ادا کرنے کی غرض سے میری عبادت کرے اور زبور میں درج ہے کہ اس سے زیادہ کون ظالم ہے جس نے جنت کی طمع یا دوزخ کے خوف سے میری عبادت کی پس اگر میں دوزخ اور جنت کو نہ پیدا کرتا تو کیا عبادت کا مستحق نہ ہوتا؟ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چند ایسے لوگوں پر گزر ہوا کہ جو خلوت میں بیٹھے عبادت کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہم جنت کی امید رکھتے ہیں اور دوزخ کا ڈر، روح اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہیں مخلوق کی ہی طمع ہے اور مخلوق ہی کا خوف ہے۔ ہائے! افسوس کہ خالق کے لئے کچھ بھی نہیں۔ آگے جا کر چند دوسرے لوگوں پر گزر ہوا جو خلوت نشین تھے اور کہتے تھے کہ ہم تو محض اللہ عزّوجلّ کی محبت اور اس کے جلال کی وجہ سے اس کی عبادت کر رہے ہیں آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے ولی و مقرب ہو اور مجھے تمہارے ہی پاس بیٹھنے کا حکم ہوا ہے۔

محبتِ الٰہی کی علامتیں بے شمار ہیں کہ ان کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہاں بعض علامتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہیں کہ انسان نفس کی خواہش پر اپنے محبوب یعنی اللہ عزّوجلّ کے حکم کو ترجیح دیتا اور اس کی محبت کو سب کاموں پر مقدم سمجھتا ہے یعنی متقی و پرہیز گار بنتا ہے اور حدودِ شرعیہ کا ہر وقت لحاظ رکھتا ہے، دوم اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شائق ہوتا ہے اور موت سے گھبراتا نہیں اور اگر زندگی چاہتا بھی ہے تو محض اس لئے کہ معرفت حق جتنی بھی زیادہ حاصل ہو اتنی ہی بہتر ہے تاکہ محبوب کے وصال میں لذت زیادہ حاصل ہو کیونکہ معرفت مشاہدہ جمال کا بیج ہے پس جتنا زیادہ پڑے گا اسی قدر پیداوار بھی زیادہ ہو گی، اسی طرح جس قدر معرفت کامل ہو گی اسی قدر مشاہدہ جمالِ حق میں لذت زیادہ حاصل ہو گی سوم حکمِ الٰہی اور

قضا و قدر پر راضی رہنا ہے کہ گوارا اور ناگوارا جو کچھ بھی پیش آتا ہے اس پر زبان یا دل سے شکوہ نہیں کرتا اب مناسب ہے کہ رضا برقضا کا بھی کچھ بیان کر دیں تاکہ انسان کو دھوکا نہ ہو اور اس خوش فہمی میں کہ مجھے محبتِ الٰہی حاصل ہو گئی ہے مغرور ہو کر نہ بیٹھ جائے کیونکہ محبتِ الٰہی کا حاصل ہونا کوئی آسان چیز نہیں ہے بلکہ نہایت دشوار ہے۔

(۹) رضا بر قضا

رضا بر قضا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لکھے یعنی فیصلے (تقدیر) پر راضی ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی شان میں فرمایا ہے کہ اللہ (عزّوجلّ) ان سے راضی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ذیشان ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی بندہ کو محبوب بناتا ہے تو اسے کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے پس اگر وہ صابر بنا رہتا ہے تو اس کو منتخب کرتا ہے اور اگر اس کی قضا پر راضی ہوتا ہے تو اس کو برگزیدہ کر لیتا ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے فرمایا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم مومنین مسلمین ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے انہوں نے عرض کیا کہ مصیبت پر صبر کرتے ہیں راحت پر شکر کرتے ہیں اور قضا پر راضی رہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "واللہ! تم سچے مومن ہو"

حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اے داؤد (علیہ السلام)! تم ایک کام کا ارادہ کرتے ہو اور میں بھی ارادہ کرتا ہوں مگر ہوتا وہی ہے جو میں ارادہ کرتا ہوں پس اگر تم میرے ارادہ و مشیت پر راضی رہے اور مطیع و فرمانبردار بنے تب تو میں تمہارے گناہ کی تلافی بھی کروں اور تم سے خوش بھی رہوں گا اور اگر میرے ارادہ پر راضی نہ ہوئے تو تمہیں مشقت و تکلیف میں ڈالوں گا اور آخر کار ہو گا وہی جو میں چاہوں گا باقی مفت کی پریشانی تمہارے سر پڑے گی۔

رضا کا انکار:۔

ایک فرقہ رضا کا منکر ہے اور اس کا خیال جس کو وہ دلیل سمجھے ہوئے ہے یہ ہے کہ جو چیز اپنی خواہش کے خلاف ہو گی اس پر خوش اور راضی ہونے کے کوئی معنی

ہی نہیں ہیں البتہ ناگوار پر صبر ضرور ہو سکتا ہے مگر یہ خیال ناسمجھی اور کم عقلی کی علامت ہے یاد رکھو کہ جس طرح وہ لوگ محبتِ الٰہی کے سمجھنے سے قاصر رہے اسی طرح رضا برقضا کی صورت کو نہیں سمجھ سکے۔

تکلیف پر رضا کی عقلی وجوہات:۔

اے طالبینِ حق اور مبلغین اسلام سنو اور غور کرو کہ تکلیف پر راضی ہونا اور خواہش نفس و طبیعت کے خلاف پر راضی ہونا تین وجہ سے ممکن ہے۔

(i) دنیا کی مخلوق ہی میں دیکھ لو کہ فرطِ محبت اور جوشِ شوق میں انسان کو اکثر تکلیف اور درد محسوس نہیں ہوا کرتا چنانچہ معشوق مارتا ہے مگر اسے تکلیف نہیں ہوتی اور محبت کا درجہ تو بلند ہے انسان کی حالت غلبۂ شہوت اور غصہ کے جوش میں بھی ایسی ہو جاتی ہے کہ بدن پر زخم آجاتا ہے اور سر پھٹ جاتا ہے' خون بہنے لگتا ہے اور جسم لہولہان ہو جاتا ہے مگر اس وقت کچھ تکلیف بھی نہیں ہوتی اسی طرح تم نے اپنی حالت پر کبھی نظر ڈالی ہو گی کہ جس وقت کسی مرغوب چیز کی ہوس اور شوق میں محو و مستغرق چلے جا رہے ہو اور کانٹا چبھ جائے تو اس وقت اس کا درد محسوس میں ہوتا ہاں جب غصّہ رفع اور شوق ختم ہو جاتا ہے مثلاً مرغوب شئے مل جاتی یا اس کے حصول میں ناامیدی ہو جاتی ہے تو اس وقت چوٹ اور کانٹا چبھنے کی تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے۔ پس جب ذرا سی محبت میں یہ حالت ہوتی ہے کہ تکلیف محسوس نہیں ہونے پاتی تو زیادہ محبت میں تو کسی بڑی تکلیف کا بھی حس نہ ہو گا اور جب یہ حالت دنیا میں موجود ہے کہ خون اور گوشت سے بنے ہوئے اس انسان کے عشق میں یہ حالت ہے کہ جس کے پیٹ کے اندر منوں نجاست بھری ہوئی ہے اور صورت کی ناپائیدار معمولی خوبی نے اتنا اثر پیدا کر دیا ہے کہ آنکھوں کی بینائی بھی اس قدر غلطی کرنے لگی اور عیوب محاسن بن کر خوبیاں دکھائی دینے لگے تو رب جمیل کے جمال ازلی کا عاشق اگر ناگوار کو گوارا اور ناپسند کو پسند کرنے لگے تو کیا بعید ہے حالانکہ قلب کی بصیرت آنکھوں کی بصارت سے ہر طرح مقدم اور اولیٰ ہے اسی بنا پر حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت فرمایا کہ کیا

محب کو بھی بلا کی تکلیف ہوتی ہے آپ رحمتہ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ ہرگز نہیں' اگر ستر مرتبہ بھی تلوار سے مارا جائے تب بھی تکلیف نہ ہو ایک عارف کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے سبب مجھے اس کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے محبت ہے یہاں تک کہ اگر دوزخ کو محبوب بنائے تو میں دوزخ میں ہی جانا محبوب سمجھوں' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت کی وجہ سے آگ میں جلنے کی بھی تکلیف محسوس نہ ہو گی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے لئے کوئی خوشی باقی نہیں رہی ہاں' اگر ہے تو بس اللہ عزّوجلّ کے قضا و قدر پر راضی ہونا رہ گیا ہے' جو مجھے ہر وقت حاصل ہے ایک صوفی کا حال لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کا چھوٹا بچہ تین دن تک گم رہا ان سے کہا گیا کہ اگر آپ دعا مانگتے تو اللہ عزّوجلّ بچہ کو لوٹا دیتا اور گمشدگی کی یہ تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ بچہ کے گم ہونے سے زیادہ تکلیف میرے لئے یہ بھی تھی کہ میں اللہ تعالیٰ پر اس کے حکم پر اعتراض کرتا۔

(ii) دوسری وجہ قضا پر راضی ہونے کی یہ ہے کہ تکلیف کی صورتوں میں تکلیف تو محسوس ہو مگر چونکہ عقل نے ان کو بہتر انجام یعنی ملنے والے اجر و ثواب پر مطلع کر دیا ہے اس لئے طبیعت اس تکلیف کو بلا کلفت گوارا کرتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب کسی مریض کو پینے کے لئے تلخ دوا بتائے یا فصد کھلوانے کی ہدایت کرے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس تلخ دوا کا پینا اور فصد کھلوانا تکلیف کی باتیں ہیں مگر چونکہ اس کے ساتھ ہی اس کے عمدہ نتیجہ یعنی صحت و تندرستی سے مریض کو آگاہی حاصل ہے لہٰذا وہ ان تکلیف دہ باتوں کے بتانے والے طبیب سے راضی اور خوش بلکہ اس کا احسان مند و ممنون رہتا ہے' اسی طرح سوداگر اپنے سفر تجارت کی گوناں گوں صعوبتوں اور مشقتوں پر راضی ہوتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ طبیعت اس تکلیف کو ناگوار سمجھتی ہے مگر چونکہ عقل نے اس مشقت کا اچھا نتیجہ و انجام سمجھا دیا ہے اسی لئے وہ ناگواری رضا اور رغبت سے بدل جاتی ہے۔ پس حب دنیا کے ناپائیدار فائدوں کی یہ حالت ہے کہ ان کی وجہ سے مشقت نہیں معلوم ہوتی

تو اخروی سعادت کے حاصل کرنے میں بلا و تکلیف اور خلاف طبع مصیبتوں پر راضی ہونے سے کیوں تعجب ہوتا ہے۔ ایک پارسا عورت کو ایک مرتبہ ٹھوکر لگی اور پاؤں کا ناخن کٹ کر گر پڑا' اس تکلیف سے بجائے ہائے واویلا مچانے کے ایک نیک بی بی مسرور ہوئیں اور خوب مسکرائیں لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا تمہیں تکلیف نہیں ہوئی۔ عورت نے جواب دیا کہ چوٹ لگنے پر جو اجر آخرت میں ملے گا اس کی حلاوت نے تکلیف کی تلخی کو چاٹ لیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص سچے دل سے اس کا یقین کئے ہوئے ہے کہ دنیا کی ہر تکلیف پر اللہ عزّوجلّ کی طرف سے اجر مرحمت ہو گا اور ہر مصیبت و صدمہ پر اس قدر ثواب عطا ہو گا' جس کے مقابلہ میں اس عارضی تکلیف کی کچھ حقیقت نہیں ہے تو وہ تکلیفوں پر ضرور مسرور اور شاداں ہو گا۔

(iii) تیسری وجہ قضا پر راضی ہونے کی یہ ہے کہ اللہ عزّوجلّ کے معاملات میں عجیب عجیب رموز و اسرار مخفی ہیں اور ہر واقعہ عجیب و حادثہ جدیدہ میں ایک کیا بیسیوں لطائف پوشیدہ ہیں جن پر راضی ہونا صاحبانِ بصیرت ہی کا منصب ہے پس ان مصلحتوں اور لطیفوں پر نظر کرنے سے تکلیف' تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس عالمِ فانی میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور جس کو جاہل و احمق شخص تشویش و اضطراب سمجھے ہوئے ہے اور تعجب کرتا ہے اس کو صاحبانِ بصیرت سمجھ جاتے ہیں کہ یہ تعجب ایسا ہی ہے جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ رہ کر ان واقعات کا تعجب ہوا تھا جس کا مفصل قصہ سورۂ کہف میں مذکور ہے کہ دونوں ایک کشتی میں بیٹھے تو حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ پھاڑ دیا' حضرت موسیٰ علیہ السلام تعجب کے ساتھ اعتراض کرنے لگے کہ یہ زیادتی کیوں کی؟ پھر آگے چلے اور ایک بستی میں پہنچے کہ وہاں کے رہنے والوں نے ان کے کھانے تک کی خبر نہ لی۔ صبح ہونے پر دونوں اس قصبہ میں نکلے ایک دیوار پر نظر پڑی جو جھکی ہوئی تھی حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو سیدھا کر دیا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پھر تعجب ہوا کہ ایسی بے مروت قوم کے ساتھ جس نے مسافروں کے خورد و نوش کی بھی خبر نہ لی مفت احسان نہ کرنا چاہئے تھا' غرض جب تین مرتبہ اعتراض ہو چکا تب حسب قرارداد

حضرت خضر علیہ السلام سے مفارقت ہو گئی' یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان واقعات پر تعجب کرنا محض اس وجہ سے تھا کہ ان اسرار و رموز سے واقف نہ تھے جو ان واقعات میں مخفی تھے چنانچہ جب حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان سے مطلع کر دیا کہ کشتی غریب ملاحوں کی تھی اور بادشاہ وقت ظلماً" صحیح و سالم کشتیوں کو ضبط کر رہا تھا لہٰذا میں نے اس کشتی کو عیب دار کر دیا تاکہ مسکینوں کی صورت معاش ضبط نہ ہو جائے اور وہ نابالغ بچہ جسے میں نے قتل کیا فطرتاً" بددین پیدا ہوا تھا اور غالب اندیشہ تھا کہ بالغ ہو کر اپنے مسلمان ماں باپ کو گمراہ کرے گا کہ وہ شفقت مادری و پدری کی وجہ سے اس کے خلاف نہ کر سکیں گے لہٰذا اس کا کام تمام کر دیا تاکہ اس کے بدلے صابر ماں باپ کو دوسری اولاد ملے جو صالح و سعید ہو اور ذریعہ آخرت بنے اور دیوار دو یتیم بچوں کی تھی جن کا نیک بخت باپ اس دیوار کے نیچے خزانہ دبا کر چھوڑ گیا اور اس کو اللہ عزّوجلّ کے حوالے کر کے مرا تھا لہٰذا اسے میں نے سیدھا کر دیا تاکہ بالغ ہو کر اپنا مال قبضہ میں لائیں اور دیوار گر جانے سے خزانہ ظاہر ہو کر حق داروں کے علاوہ دوسروں کے ہاتھ نہ لگنے پائے پس اس وقت حضرت موسیٰ کا تعجب رفع ہو گیا۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ وہ جنگل میں رہتے تھے اور انہوں نے ایک گدھا پال رکھا تھا جس پر اسباب لادتے تھے اور ایک کتّا رکھ چھوڑا تھا جو مکان کی حفاظت کیا کرتا تھا اور ایک مرغ پال رکھا تھا جو اذان دے کر صبح ہی سب کو جگا دیا کرتا تھا' اللہ کی شان کہ ایک دن لومڑی آئی اور مرغ کو پکڑ کر لے گئی ان کی بیوی رونے لگی کہ ہائے مرغ جاتا رہا بزرگ نے فرمایا کہ رو مت اسی میں بہتری ہو گی' اس کے بعد بھیڑیا آیا اور گدھے کو مار گیا اس وقت بیوی پھر رنجیدہ ہوئی تو بزرگ نے فرمایا اسی میں خیریت تھی' رونے کی کوئی بات نہیں' اس کے بعد دفعتاً" کتّا مر گیا اور بیوی پھر غمگین ہوئی تو اس وقت بزرگ نے پھر یہی فرما دیا کہ غم نہ کرو اسی میں بھلائی تھی۔ بار بار یہ سن کر بیوی کو تعجب ہوا کہ صریح نقصان ہو رہا ہے اور خاوند بھلائی بھلائی پکار رہا ہے غرض صبح ہوئی تو دفعتاً" غنیم کا ایک لشکر اس میدان میں لوٹنے کے لئے

آپڑا اور جتنے بھی گھروں کا انہیں پتہ چلا سب کو لوٹ لیا اور ان بزرگ اور ان کی بیوی کے علاوہ سب ہی کو گرفتار اور باندی غلام بنا کر لے گئے اور مکان کا پتہ نشان دشمن کی فوج کو اس سے چلا کہ کسی کے دروازے کا کتّا آہٹ پا کر بھونکنے لگے اور کسی کا گدھا رینگ رہا تھا اور کسی کا مرغ اپنی بانگ بلند کر رہا تھا۔ اس وقت ان بزرگ نے اپنی بیوی سے فرمایا کہ دیکھا کہ آج اس بادیہ نشین قوم کی بربادی کا سبب یہی جانور بن گئے' پس اللہ عزّوجلّ کا کتنا فضل تھا کہ ہمارے تینوں جانور پہلے ہی مر گئے' اگر آج وہ زندہ ہوتے تو ہم بھی دوسروں کی طرح دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہوتے۔ ایک نبی علیہ السلام کسی پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھے ہوئے عبادت کر رہے تھے اور پہاڑ کے قریب ایک سوار آیا اور اس نے نقدی کی ہمیانی تو کمر سے کھول کر زمین پر رکھ دی اور پانی پینے لگا اس کے بعد وہاں سے چلا گیا اور تھیلی وہیں بھول گیا' تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص آیا اور تھیلی کو وہاں پڑا دیکھ کر اس کو اٹھا لیا اور لے کر چل دیا' اس کے بعد ایک غریب مزدور سر پر لکڑیوں کا گٹھا لادے ہوئے آیا اور گٹھا زمین پر ڈال کر آرام لینے کے لئے چشمہ کے کنارے بیٹھ گیا اتنے میں وہ سوار جس کی تھیلی رہ گئی تھی گھبرایا ہوا آیا اور تھیلی کو نہ پایا اِدھر اُدھر دیکھا جب کوئی آدمی نظر نہ آیا تو اس بیچارے مزدور کے سر ہو گیا ہر چند اس نے انکار کیا کہ میں نے تھیلی کو دیکھا بھی نہیں مگر سوار کو یقین نہ آیا' یہاں تک کہ اس نے تلوار میان سے نکالی اور غریب مزدور کی گردن اڑا دی اس کے بعد پشت پھیری اور چلا گیا' یہ حال دیکھ کر پیغمبر (علیہ السلام) نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ الٰہی یہ تیرا واقعہ بھی کتنا عجیب ہے کہ تھیلی کس نے لی اور مارا گیا کوئی حکم ہوا کہ تم اپنا کام کرو تمہیں ہمارے ملکوتی اسرار میں دخل دینے کی حاجت نہیں بات یہ ہے کہ اس مزدور نے اس سوار کے باپ کو مارا تھا لہٰذا آج اس کا قصاص لیا گیا کہ مقتول کے بیٹے نے اپنے باپ کے قاتل کو مار دیا اور اس سوار کے باپ نے ایک مرتبہ اس شخص کے مال میں سے ایک ہزار دینار لے لئے تھے جو کہ تھیلی لے گیا ہے لہٰذا آج اس کی تلافی کی گئی کہ لینے والے شخص کی میراث ہی سے ایک ہزار دینار کی تھیلی اس کو دلا دی گئی۔ غرض مطلب یہ ہے کہ جو

شخص اسرارِ کونیہ پر ایمان لائے ہوئے ہے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام قضا و قدر پر ہرگز تعجب نہ کرے گا اپنے تعجب پر تعجب ہو گا کہ شہنشاہی مصلحتوں کے راز نہ سمجھنے پر غلام کو تعجب کیوں ہوا؟

امر بالمعروف ترک نہ ہو:۔

شاید تم یہ کہو کہ کافر اور گنہگار جو کفر اور گناہ کر رہے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حکم و ارادہ سے کر رہے ہیں تو ان کاموں پر راضی ہونے کے کیا معنی ہوں گے جبکہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے اور کافر و گناہگار کو مبغوض سمجھنا بغض فی اللہ میں داخل ہے جو شرعاً" محمود ہے اس لئے ہم تمہیں رضا بر قضا کا مطلب سمجھاتے ہیں تاکہ خلجان باقی نہ رہے۔ دراصل امر بالمعروف فرض ہے اور اس کا چھوڑنا رضا بر قضا نہیں کہلا سکتا کیونکہ رضا اور کراہیت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دو متضاد چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ ظاہر ہے کہ جس کام کو تم ناگوار اور برا سمجھو گے اس سے نفرت ضرور کرو گے اور جن کو اچھا سمجھو گے ضرور اس سے خوش ہو گے اور ناگواری و خوشی دونوں ایک کام پر ایک حیثیت سے ہرگز نہیں ہو سکتیں البتہ دو اعتبار سے ہو سکتی ہیں مثلاً ایک شخص تمہارا دشمن ہو اور تمہارے دشمن کا بھی دشمن ہو تو اس کو قتل کرنا اس اعتبار سے گوارا اور پسند ہو گا کہ وہ تمہارا دشمن ہے مگر اس اعتبار سے ناگوار اور ناپسند ہو گا کہ وہ تمہارے دشمن کا بھی دشمن ہے کیونکہ دشمن کے دشمن کی بھی زندگی مطلوب ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی دشمنی کی وجہ سے تمہارے دشمن کو نقصان پہنچاتا رہے اسی طرح کفر گناہ گاری میں بھی دو حیثیتیں ہیں' ایک تو یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ذرہ بھی نہیں ہل سکتا۔ پس اس اعتبار سے تو اس کو قضا اور تقدیر کہتے ہیں اور اس حیثیت سے اس پر ناگواری بھی نہ ہونی چاہئے بلکہ رضا ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا جو بھی کام ہے وہ مصلحت سے ہے البتہ اس گناہ میں دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ کفر و گناہ کافر اور گناہ گار شخص کا عمل اور کسب ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے دشمن اور نافرمان ہونے کی علامت ہے پس اس اعتبار سے بے شک ناگواری و

بغض ہونا چاہئے کیونکہ اللہ عزّوجلّ نے حکم دیا ہے کہ جس بندہ پر ہماری مخالفت کی علامتیں دیکھا کرو تو اس سے بغض رکھا کرو' پس اللہ عزّ و جلّ کے حکم کی تعمیل کرنا اور کافر سے بغض رکھنا بھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہوا' اس کی مثال ایسی سمجھو کہ مثلاً تمہارا پیارا معشوق تم سے کہے کہ میں تمہارے عشق و محبت کا امتحان لوں گا اپنے غلام کو مجبور کروں گا کہ وہ مجھے گالی دے اور پھر اس کو مار دوں گا کہ مجھے گالی کیوں دی تو جو شخص میرے اس غلام سے بغض رکھے گا اس کو اپنا محب اور عاشق صادق سمجھوں گا اور جو اس سے محبت کرے گا میں اس کو اپنا دشمن سمجھوں گا اب فرض کرو کہ ایسا ہی ہو یعنی غلام نے تمہارے محبوبؐ کو گولی دی اب تم ہی بتاؤ کہ اس غلام سے تم محبت رکھو گے یا بغض و عداوت اور جس وقت اس کی زبان سے محبوب کو گالیاں دیتے ہوئے سنو گے تو راضی ہو گے یا ناراض۔ ظاہر بات ہے کہ گالیاں تو اس وجہ سے ناگوار ہی گزریں گی کہ ان سے تمہارے محبوب کی بات کی ہتک ہوتی ہے اور کسی شخص کا ایسا کرنا تمہارے معشوق کے دشمن ہونے کی علامت ہے اور محبوب کا دشمن کہ جس پر دشمنی کی علامتیں بھی موجود ہوں بے شک بغض اور عداوت ہی کے قابل ہے مگر اس اعتبار سے کہ یہ تمہارے ہی محبوب کی تدبیر سابق کے موافق ظہور ہو رہا ہے کیونکہ جو کچھ غلام سے صادر ہوا ہے وہ محبوب ہی کے ارادہ اور قصد سے صادر ہوا کچھ بھی ناگواری نہ ہو گی بلکہ محبوب کی قدرت کا یقین ہو گا کہ اس نے اپنے غلاموں سے جو بھی کام لینا چاہا لے لیا حتیٰ کہ اپنی محسن ذات کے لئے اپنے ادنیٰ غلاموں کی زبان سے گالیاں نکلوانی چاہیں تو اس میں بھی کسی کو سرتابی اور حکم کی مخالفت و عصیان کی مجال نہ ہوئی اسی طرح کافر کو کفر سمجھو کہ چونکہ اللہ عزّوجلّ ہی کے ارادہ اور مشیت سے ہو رہا ہے لہٰذا اس اعتبار سے تو ناگوار گزرنے کا سبب ہو نہیں سکتا مگر اس کے ساتھ ہی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کی رضا اس پر نہیں ہے بلکہ کفر کرنا اللہ تعالیٰ کے دشمن اور مبغوض ہونے کی علامت ہے لہٰذا اس اعتبار سے تو ناگوار گزرے گا' اسی وجہ سے اس کو نصیحت بھی کی جاتی ہے اور تبلیغ حق بھی کی جاتی ہے کیونکہ اپنے حقیقی محبوب کا دشمن اپنا ہی دشمن معلوم ہوا کرتا ہے۔

کیا دعا مانگنا یا تدبیر کرنا چھوڑ دیا جائے؟

اسی طرح رضا برقضا کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ دعا کا مانگنا بھی چھوڑ دیا جائے اور تیر انداز نے جو تیر تمہاری طرف پھینکا ہے باوجودیکہ اس کو ڈھال پر روک سکتے ہو مگر اس کو نہ روکو اور اپنے بدن پر لگنے دو اور یوں سمجھو کہ قضا پر راضی رہنا چاہئے ایسا سمجھنا بھی جہالت اور خام خیالی ہے کیونکہ دعا مانگنے اور شر سے محفوظ و تدبیر کرنے کا تو شرعاً" حکم ہے اور محبوب کے حکم سے سرتابی نہیں ہو سکتی لہٰذا یہاں رضا برقضا کے معنی یہی ہیں کہ اللہ عزّوجلّ نے کسی شے کے حاصل ہونے کے لئے جو اسباب مقرر فرما دیئے ہیں ان کو اختیار کرو تاکہ محبوب تمہیں اپنے انتظام کا پابند دیکھ کر تم سے راضی ہو کہ اگر اسباب کا اختیار کرنا چھوڑ دو گے تو محبوب کے مخالف اور رضائے محبوب کے دشمن کہلاؤ گے مثلاً کوئی پیاسا آدمی پانی پائے مگر اس کی جانب ہاتھ نہ بڑھائے اور یوں گمان کرے کہ میں تو پیاس پر راضی ہوں کیونکہ پیاس اللہ عزّوجلّ کے حکم اور قضا و قدر سے ہے اور قضا پر راضی رہنا چاہئے تو یہ شخص بے وقوف کہلائے گا اور اس کو سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے اسباب اور عادات جاریہ میں رخنہ ڈالتا ہے یا حدود شریعت سے باہر نکلنا چاہتا ہے تو نے جو کچھ سمجھا ہے یہ تو رضا کے ہرگز معنی نہیں ہیں رضا کے تو صرف یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ظاہر و باطن اور زبان یا دل دونوں میں سے کوئی بھی کسی حالت پر اعتراض نہ کرے اور اس کے ساتھ ہی اس کے حکم کی بھی تعمیل ہو اور جو انتظام اس نے عالم کے لئے تجویز فرما دیا ہے اس سے باہر نہ نکلے بلکہ شرعی احکام کا پورا پابند ہو اور جس طرح اللہ عزّوجلّ کی مرضی ہے اس کے گزرنے کا سبب ہو نہیں سکتا مگر اس کے ساتھ ہی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کی رضا اور اس پر نہیں ہے بلکہ کفر کرنا خدا کے دشمن اور مبغوض ہونے کی علامت ہے لہٰذا اس اعتبار سے تو ناگوار گزرے گا' اسی وجہ سے اس کو نصیحت بھی کی جاتی ہے اور تبلیغ حق بھی کی جاتی ہے کیونکہ اپنے حقیقی محبوب کا دشمن اپنا ہی دشمن معلوم ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح رضا برقضا کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ دعا کا مانگنا بھی چھوڑ دیا جائے

اور تیز انداز نے جو تیر تمہاری طرف پھینکا ہے باوجودیکہ اس کو ڈھال پر روک سکتے
ہو مگر اس کو نہ روکو اور اپنے بدن پر لگنے دو اور یوں سمجھو کہ قضا پر راضی رہنا
چاہئے ایسا سمجھنا بھی جہالت اور خام خیالی ہے کیونکہ دعا مانگنے اور شر سے حفاظت و
تدبیر کرنے کا تو شرعاً" حکم ہے اور محبوب کے حکم سے سرتابی نہیں ہو سکتی لہٰذا یہاں
رضا برقضا کے معنی یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کے حاصل ہونے کے لئے جو
اسباب مقرر فرما دیئے ہیں ان کو اختیار کرو تاکہ محبوب تمہیں اپنے انتظام کا پابند دیکھ
کر تم سے راضی ہو کہ اگر اسباب کا اختیار کرنا چھوڑ دو گے تو محبوب کے مخالف اور
رضائے محبوب کے دشمن کہلاؤ گے مثلاً کوئی پیاسا آدمی پانی پائے مگر اس کی جانب
ہاتھ نہ بڑھائے اور گمان کرے کہ میں تو پیاس پر راضی ہوں کیونکہ پیاس اللہ تعالیٰ
کے حکم اور قضا و قدر سے ہے اور قضا پر راضی رہنا چاہئے تو یہ شخص بے وقوف
کہلائے گا اور اس کو سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے اسباب اور
عادات جاریہ میں رخنہ ڈالتا ہے یا حدود شریعت سے باہر نکلنا چاہتا ہے اس نے جو کچھ
سمجھا ہے یہ تو رضا کے ہرگز معنی نہیں ہیں رضا کے تو صرف یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ
پر ظاہر و باطن اور زبان یا دل دونوں میں سے کوئی بھی کسی حالت پر اعتراض نہ کرے
اور اس کے ساتھ ہی اس کے حکم کی بھی تعمیل ہو اور جو انتظام اس نے عالم کے لئے
تجویز فرما دیا ہے اس سے باہر نہ نکلے بلکہ شرعی احکام کا پورا پابند ہو اور جس طرح
اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے اس کے حاصل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی ایجاد نہ کرے
مثلاً جب دعا کا حکم ہوا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی تعمیل ہو تاکہ خشوع و خضوع اور
دل میں رقت کا اثر آئے اور وہ لیاقت و استعداد حاصل ہو جس کی وجہ سے دل پر
انوار و تجلیات کا ظہور ہو سکے اسی طرح اسباب کو بھی اختیار کیا جائے تاکہ سبب
حاصل ہو البتہ اگر سبب کے بعد بھی مسبب حاصل نہ ہو تو نہ کوئی خلجان پیدا ہونا
چاہئے اور نہ رنجیدہ ہونا چاہئے بلکہ راضی رہے اور یوں سمجھے کہ سب تو فی الحقیقت
موثر تھا لیکن اللہ عزّوجلّ کا ارادہ یوں تھا کہ یہ مسبب مجھے حاصل نہ ہو پس قضا و
قدرِ الٰہی پر مجھے راضی رہنا چاہئے لہٰذا اگر وہ شئے باوجود وسائل و اسباب اختیار کرنے
کے بھی حاصل نہیں ہوئی تو وہ میرے حزن و غم یا شکوہ و شکایت کا باعث نہیں ہو سکتا

(۱۰) فکر موت

اس باب میں اب تک ہم جن نو امور پر کلام کر چکے ہیں سب ایک مرتبہ کے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو مقصود بالذات ہیں جیسے مقام رضا و محبت مقصود بالغیر (یعنی کسی اور وجہ سے مقصود ہونا) ہیں مثلاً توبہ و خوف اور صبر و زہد کیونکہ مقصود درحقیقت قربِ الٰہی ہے اور یہ تمام مقامات راہ قرب کے معین ہیں خود قریب نہیں کیونکہ قرب تو معرفت اور محبت سے حاصل ہوتا ہے اور معرفت و محبت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ غیر اللہ کی محبت قطع نہ کر دی جائے اور غیر اللہ کی محبت خوف و صبر اور زہد و توبہ ہی کے ذریعہ سے قطع ہو سکتی ہے لہٰذا ان کی بھی ضرورت ہوئی اور چونکہ منجملہ ان امور کے جن سے قرب الٰہی میں اعانت حاصل ہوتی ہے موت کا یاد رکھنا بھی ہے' لہٰذا اس کا تذکرہ کرنا بھی مناسب ہوا کیونکہ موت کے ذکر سے دنیا کی محبت دل سے جاتی رہتی ہے اور جب یہ علاقہ قطع ہو گا تو اللہ عزّوجلّ کی محبت حاصل ہو گی۔ اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ "موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تم سے مل کر رہے گی"

"سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ لذّتوں کو توڑنے والی چیز یعنی موت کا کثرت سے ذکر کیا کرو (ترمذی و حاکم) اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بروز محشر شہداء کے ساتھ اور بھی کوئی اٹھے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں وہ شخص جو دن رات میں بیس مرتبہ موت کو یاد کر لیتا ہے۔ (طبرانی) سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ موت جیسا کوئی واعظ نہیں ہے (طبرانی) یعنی نصیحت کرنے کو تو موت ہی کافی ہے اور اگر جانوروں کو موت کا اتنا علم ہو جتنا کہ بنی آدم کو ہے تو کوئی فربہ (موٹا) جانور کھانے کو نہ ملے (بیہقی) ایک اور جگہ فرمایا کہ میں تم میں دو واعظ چھوڑے جاتا ہوں کہ ایک خاموش واعظ ہے یعنی موت اور دوسرا ناطق یعنی گویا واعظ ہے یعنی قرآنِ حکیم

موت کی ہولناکی:۔

موت بڑی ہولناک چیز ہے اور اس کے بعد کے واقعات اس سے بھی زیادہ خوف ناک ہیں اور ان کا ذکر کرنا اور یاد رکھنا دنیا کو منغض بناتا ہے اور اس دار ناپائیدار کی محبت کو دل سے نکال لیتا ہے اور دنیا کی محبت ہی ہر گناہ کی جڑ ہے پس جب دنیا سے قلب کو نفرت ہوگی تو سب کچھ مل جائے گا اور دنیا سے نفرت اس وقت ہوگی جب کہ موت کا فکر اور خیال ہو گا کہ عنقریب ہم پر کیا آفت آنے والی ہے۔

فکر موت کس طرح ممکن ہے؟

فکر کا طریقہ یہ ہے کہ کسی وقت خلوت میں بیٹھ کر سارے خیالات کو دل سے نکال دو اور قلب کو بالکل خالی کر کے توجہ اور عزم کے ساتھ موت کا دھیان کیا کرو۔ اول اپنے ان دوستوں اور اعزاء اقارب کا تصور کرو جو دنیا سے گزر گئے اور یکے بعد دیگرے ایک ایک کا دھیان کرتے جاؤ کہ یہ صورتیں کہاں چلی گئیں یہ لوگ کیسی کیسی امیدیں اپنے ساتھ لے گئے حرص و خواہشات نے ان میں اپنا کتنا زور دکھایا؟ جاہ و مال کی کیا کچھ تمنائیں اور آرزوئیں ان کے دلوں میں رہیں مگر آج وہ سب خاک میں مل گئے اور منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں کہ کوئی شخص ان کا کبھی نام بھی نہیں لیتا اس کے بعد مرنے والوں کے بدن اور جسم کا دھیان کرو کہ کیسے حسین اور نازک بدن تھے مگر اب پارہ پارہ ہو گئے گل گئے' سڑ گئے' پھٹ گئے اور کیڑے مکوڑوں کی غذا بن گئے اس کے بعد ان کے اعضاء اور جوارح میں سے ایک ایک عضو کا دھیان کرو کہ وہ زبان کیا ہوئی جو کسی وقت چپ ہونا جانتی ہی نہیں تھی وہ ہاتھ کہاں گئے جو حرکت کیا کرتے تھے دیکھنے والی آنکھیں اور ان کے خوبصورت حلقے کس کیڑے کی خوراک بن گئے غرض اسی طرح دھیان کرو گے تو سعید بن جاؤ گے کیونکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ سعید وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے افسوس کہ ہم موت جیسی ہولناک چیز سے غافل ہیں اس زمین پر

کہ ہم جسے پاؤں سے روند رہے ہیں ہم سے پہلے سینکڑوں آئے اور چل دیئے مگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ یہیں رہیں گے' موت کا خطرناک سفر درپیش ہے مگر ہمیں کچھ پرواہ نہیں اس قدر غفلت طول امل نے پیدا کر رکھی ہے۔ اگر یہ جہالت رفع ہو تو موت کا دھیان آئے اسی لئے شفیع معظم نبیٔ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو نصیحت فرمائی کہ صبح ہو تو شام کا فکر نہ کرو اور شام ہو تو صبح کا خیال نہ لاؤ اور دنیا میں آئے ہو تو زندگی میں موت کا سامان اور تندرستی میں موت کی فکر کرو کیونکہ اے عبداللہ (رضی اللہ عنہ) ! کیا خبر کل تمہارا کیا نام ہو گا یعنی زندوں میں ہو گا یا مردوں میں؟ جس شے کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں اس کی فکر تو ہر وقت ہونی چاہئے پس اپنی امیدوں پر خاک ڈالو اور آرزوؤں کو بڑھنے نہ دو اللہ جانے گھنٹہ بھر میں کیا ہوتا ہے (ترمذی) حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے سو دینار میں دو مہینہ کے وعدہ پر ایک کنیز خریدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسامہ (رضی اللہ عنہ) کی حالت پر تعجب کرو کہ زندگی کا بھروسہ ایک دن کا بھی نہیں اور دو مہینہ کے وعدہ پر کنیز خریدی ہے یہی طولِ امل ہے اللہ عزّوجلّ کی قسم ہے کہ میں نوالہ منہ میں رکھتا ہوں اور یقین نہیں کرتا کہ حلق سے نیچے اترے گا ممکن ہے کہ نوالہ کے کھاتے ہی اچھو پڑ جائے پھندا لگ جائے اور دم نکل جائے' لوگو اگر تمہیں عقل ہو تو خود کو مردوں میں شمار کرو' قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے کہ جو کچھ وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور آنے والا ہے اور جو آنے والا ہے وہ بہت قریب ہے اگر تمہیں جنّت میں داخل ہونے کی خواہش ہو تو دنیا کی لاطائل امیدوں کو کم کرو اور موت کو ہر وقت پیش نظر رکھو اور اللہ عزّوجلّ سے شرماؤ جیسا کہ شرمانے کا حق ہے انشاء جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ (ابن ابی الدنیا)

اس باب کی ضروری ہدایات

جو کچھ اب تک ہم نے بیان کیا ہے اس میں ہم تمہیں بیدار اور متنبہ کر چکے اور اللہ عزّوجلّ کی جانب چلنے کا شوق دلا چکے' پس اگر اب بھی کان نہ لگاؤ گے یا ایسا سنو گے جیسا کہ قصے کہانیاں سنا کرتے ہو تو اپنا ہی کچھ کھوؤ گے کسی کا کیا نقصان کرو گے اللہ عزّوجلّ فرماتا ہے کہ اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس کو پروردگار کی آیتوں سے نصیحت کی گئی اور اس نے منہ پھیر لیا اور بھول گیا کہ بروز قیامت نجات کے لئے کیا بھیجا؟ اور اگر توجہ کے ساتھ دل کے کانوں سے سنو گے تو بے شک نفع پاؤ گے اور جو چیزیں صراط مستقیم سے روکے ہوئے ہیں انہیں چھوڑ دو گے۔

اصلاح قلب اور حب دنیا:۔

یاد رکھو کہ سلوک سے روکنے والی چیز دنیا کی محبت ہے اسی نے اللہ عزّوجلّ کی طرف سے غفلت پیدا کر رکھی ہے اور کبھی قیامت اور محشر کو یاد نہیں آنے دیتی لہٰذا اگر روزانہ صبح کی نماز کے بعد جو کہ صفائی ذہن اور معدہ کے خالی ہونے کا وقت ہے چند منٹ تنہا بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کیا کرو اور ابتداء و انتہاء کو سوچا کرو اور نفس سے حساب لیا کرو تو بہت نفع ہو اور اس کی صورت یہ ہے کہ نفس کو مخاطب کر کے کہا کرو کہ اے نفس میں مسافر ہوں تاجر ہوں ابدی سعادت اور اللہ عزّوجلّ کا قرب میرا منافع ہے اور دائمی بدبختی اور اللہ تعالیٰ سے حجاب میرا خسارہ ہے اور میری عمر میری کل پونجی ہے کہ ہر سانس ایک بیش قیمت جوہر اور گویا بھرپور خزانہ ہے جس سے ابدی سعادت حاصل ہو سکتی ہے اور جب عمر پوری ہو گئی تو تجارت ختم ہو گئی اور مایوس ہونا پڑے گا۔ آج کا دن میری تجارت کا دن ہے اور اللہ عزّوجلّ نے مجھے فرصت دی ہے کہ اگر چاہوں تو تجارت میں نفع اٹھاؤں اگر اللہ تعالیٰ مجھے دنیا سے اٹھا لیتا تو میں خواہش کرتا کہ کاش دنیا میں لوٹا دیا جاؤں۔

محاسبہ نفس اور مراقبہ کی کیفیت :۔

اے نفس وہ دن آج کا ہے جو تجھے اللہ عزّوجلّ کی طرف سے مہلت کا عطا ہوا ہے اب تو اپنا وعدہ پورا کر اور دیکھ کہ کیا کر رہا ہے اگر اس مہلت کو تو نے غنیمت سمجھا اور آج کا کام کل پر نہ رکھا تو آج کی تجارت کا منافع تجھے مل گیا اور حسرت نہ ہوئی اور اگر تو کل بھی زندہ رہے تو پھر یہی خیال کر غرض جب تک زندہ ہے اس وقت تک ہر دن کو نیا سمجھ اور اللہ عزّوجلّ کے عفو سے دھوکا مت کھا کیونکہ یہ تیرا گمان ہی گمان ہے ممکن ہے کہ غلط نکلے اللہ تعالیٰ کی معافی کچھ ضروری یا تیرا حق نہیں ہے جس کا مطالبہ اور ایفاء و ادا لازمی ہو اور اگر مطابق ہوئی تب بھی نیک بندوں کے ثواب سے محروم ہی رہے گا اور اگر مرنے کے بعد حسرت کرے گا تو اس سے کیا نفع ہو گا جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ایک ایک سانس غنیمت اور بے بہا موتی ہے۔ اس کے بعد اگر نفس پوچھے کہ اچھا بتاؤ کیا عمل کروں اور کیوں کر وقت کی قدر کروں تو اس کو جواب دے کہ جو چیز موت کی وجہ سے جدا ہو جانے والی ہے اس کو چھوڑ دے اور جو شئے پائیدار ہے اور کسی وقت بھی تیرا ساتھ نہ چھوڑے گی اس پر قبضہ کر یعنی اللہ عزّوجلّ کی معرفت حاصل کر اور اللہ عزّوجلّ کی یاد سے مانوس ہو پھر اگر نفس کہے کہ بھلا دنیا کس طرح چھوٹ سکتی ہے اس کے علاقے تو قلب میں مضبوط اور مستحکم ہو گئے اور ان کا ٹوٹنا دشوار ہے تو اس کو جواب دے کہ قلب ہی کے اندر سے دنیا سے علاقے کاٹ دے اور تلاش کر کہ دنیا کا کون سا علاقہ مستحکم ہے پس اس کی اول جڑ کاٹ یعنی اگر مال کی محبت زیادہ ہے تو اس کو نکال اور جاہ کی طلب قوی ہے تو اس کو چھوڑ دسیوں مہلک امراض کی تشریح اور علاج بیان ہو چکا ہے ان کو دیکھ اور اللہ عزّوجلّ کے کرم پر بھروسہ رکھ کر مستعد ہو جا کمر باندھ آمادہ ہو اور جس چیز کی نفس کو خواہش ہو اس کے خلاف کر پھر دیکھ کہ خلاصی ملتی ہے یا نہیں۔ اے نفس تو بیمار ہے اور یہ عمر تیرے پرہیز کا زمانہ ہے اور روحانی طبیب یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی راستی و سچائی سے تو بھی آگاہ ہے یوں فرمایا ہے کہ ذائقہ اور لذتیں تیرے لئے مضر ہیں اور کڑوی دوائیں تیرے لئے نافع اور مفید ہیں کیا تجھ سے سفر کی

مصیبتیں اس امید پر برداشت نہیں ہو سکتیں کہ منزل پر پہنچ کر آرام ملے گا پس اگر راستہ کی تکلیف سے اکتاتا ہے تو یاد رکھ کہ قافلہ نکل جائے گا اور تو جنگل میں پڑا رہے گا کہ یا تو کوئی درندہ تجھے پھاڑ کھائے گا یا یوں ہی بھٹکتا ہوا ہلاک ہو جائے گا۔

اے نفس بتا تو سہی کہ تجھے دنیا میں کس چیز سے رغبت ہے۔ پس اگر تو مال چاہتا ہے تو مان لے کہ اچھا وہ مل بھی گیا اور تو بڑا مال دار اور متمول سیٹھ بن بھی گیا مگر پھر کیا اگر تو نظر اٹھا کر دیکھے گا تو بے شمار یہودی اور عیسائی ایسے ملیں گے جن کے پاس تجھ سے زیادہ مال موجود ہو گا اور اگر تو عزت اور جاہ کا طلب گار ہے تو اچھا فرض کر لے کہ یہ طلب ٹھکانے لگی اور تجھے عزت و جاہ حاصل بھی ہوئی مگر اس کا انجام اور حاصل کیا ہے اگر آنکھیں کھول کر دیکھے گا تو سینکڑوں احمق اور جاہل کافر اور اللہ عزّوجلّ کے نافرمان اور ذلیل اور کمینے بندوں کو ایسے حال میں دیکھے گا کہ ان کی عزت دنیا میں تجھ سے زیادہ ہو رہی ہے۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے منصبِ حکومت اور مسند جلال و دبدبہ پر بیٹھے نظر آئیں گے جو تجھے بھی قید کر کے جیل خانے پہنچا سکتے ہیں۔ پس اے نفس اگر تو ان آفتوں اور مصیبتوں سے نہیں گھبراتا جو عزت و جاہ کے حاصل کرنے میں اٹھانی پڑتی ہیں اور ان بلاؤں سے بھی نہیں ڈرتا جو عزت حاصل ہوئے پیچھے سر پڑا کرتی ہیں تو ان ذلیل اور کمینے شریکوں ہی کا خیال کر کہ کیسے کم تر لوگوں کا ساتھی بننا چاہتا ہے کیا ایسی بے وقعت اور حقیر چیز بھی حاصل کرنے کے قابل ہے جس کو ہر خسیس سے خسیس اور رذیل سے رذیل شخص بھی حاصل کر سکتا ہے بلکہ حاصل کئے ہوئے اور اتنے حاصل کئے ہوئے ہے کہ اگر تو پچاس برس بھی کوشش کرے گا تو تجھے کو نصیب نہ ہو گا اور اے نفس اگر تو دنیا سے اعراض کر کے آخرت کی جانب متوجہ ہو گا تو یاد رکھ کہ یگانہ روزگار اور یکتائے زمانہ بن جائے گا تیرا ثانی ہفت اقلیم میں بھی نہ مل سکے گا۔ پس اے نفس اب تو ہی بتا کہ کیا چیز حاصل کرنے کے قابل ہے' اے نفس خوب یاد رکھ کہ تجھ سے زیادہ تیرا خیر خواہ کوئی نہیں ہے تو کسی کے کہنے یا سننے پر نہ جا بلکہ دنیا اور دین دونوں کے انجام پر خود غور و فکر کر کے جواب دے کہ تیری رغبت کس چیز میں ہے۔

اسی طرح اگر تم اپنے نفس سے مباحثہ و مناظرہ کرتے رہے تو ایک دن یہ نفس تمہارا مطیع بن جائے گا اور تمہیں راہ مستقیم پر لے چلے گا۔ پس اگر تم عقل مند ہو تو سمجھ لو کہ یہ نفس کے ساتھ مباحثہ کرنا بدعتیوں اور معتزلہ بلکہ دنیا بھر کے تمام مذاہب باطلہ کے ساتھ مناظرہ کرنے کی بہ نسبت زیادہ ضروری ہے کیونکہ دوسروں کی غلطیاں اور خطائیں تمہیں کچھ بھی نقصان پہنچانے والی نہیں ہیں۔ اور اپنی خطا و غلطی کا ضرور اپنے ہی اوپر وبال ہے کہ اس کا خمیازہ تم ہی کو بھگتنا ہے پس پہلو میں بیٹھے ہوئے خون کے پیاسے دشمن کو سب سے پہلے قتل کرنا چاہئے اور جب اس سے نجات مل کر اطمینان حاصل ہو جائے تب دوسروں کی خبر لینی مناسب ہے تعجب ہے کہ اس دشمن کی جانب کبھی توجہ نہیں ہوتی بلکہ یہ جو کچھ بھی مانگتا ہے وہی اس کو دیا جاتا ہے اور جو بھی یہ حکم دیتا ہے فوراً اس کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اس کی درخواستوں کے منظور اور خواہشوں کے پورا کرنے میں غور و فکر اور عقل کے گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں اور حیلوں اور تدبیروں سے کام لیا جاتا ہے بھلا سوچو تو سہی اگر کوئی شخص اپنے دامن کے نیچے ایک زہریلا کالا سانپ چھپائے بیٹھا ہو جو پھنکار مار رہا ہو اور اس کے ڈسنے اور ہلاک کرنے کی ٹوہ میں لگا ہو مگر یہ شخص اس کی تو پروا نہ کرے اور دوسرے شخص کے منہ سے مکھیاں اڑانے اور پنکھا جھلنے میں مشغول رہے تو اس سے زیادہ احمق اور بے وقوف کون ہو سکتا ہے؟ یہی تمہارا حال ہے کہ دوسرے کے ساتھ مباحثہ کرنے اور غیروں کے سیدھے راستہ پر لانے کی فکر میں سرگرم ہو مگر اپنے نفس امارہ کے ساتھ مناظرہ کرنے اور اس تباہ کرنے والی شریر دشمن دین و ایمان کو زیر کرنے کی جانب مطلق توجہ نہیں کرتے۔

نفس کتے کی طرح ہے:۔

خوب سمجھ لو کہ جب تک نفس کے ساتھ ایک عرصہ دراز تک اسی طرح مباحثہ نہ رکھو گے اس وقت تک یہ کبھی سیدھا نہ ہو گا اور جب تک یہ سیدھا نہ ہو گا اس وقت تک نہ تم سے اللہ عزّوجلّ کی یاد ہو سکے گی اور نہ مناجات میں لذت آئے گی، سلوک کی طرف توجہ ہو گی اور نہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی فکر ہوگی لہٰذا ا ھرہ لو

اپنے اوپر واجب و فرض سمجھو اور اکثر نفس کے ساتھ یہ مباحثہ شروع کر دیا کرو اور جب نفس تمہاری مخالفت کرے تو اس کو ڈانٹو' جھڑکو اور ایسی سزا دو جو کارگر اور باا ثر ہو کیونکہ نفس کی خاصیت کتّے کی سی ہے کہ جب تک مار نہ کھائے گا اس وقت تک ادب نہ پائے گا پھر اگر تمہیں نفس کے ساتھ مناظرہ کرنے کی خواہش ہو تو احیاء العلوم کی کتاب المحاسبہ والمراقبہ دیکھو کہ اس مختصر کتاب میں ان ابواب کے بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے اب آخر میں دعا کرو کہ اللہ عزّوجلّ اپنے حبیب سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ و وسیلۂ جلیلہ سے مجھے اور تمہیں اپنی بے پناہ عطاؤں سے ڈھانپ لے اور کرم و فضل کی بارش فرمائے جن باتوں کا اس نے ہمیں علم عطا فرمایا ہے ان پر عمل کی توفیق بخشے اور جو کچھ ہم نے پڑھا سنا اور سیکھا اس کو حال بنا دے کہ ہم اپنے نفس پر گزری اصل کیفیت بھی دیکھ لیں۔ (آمین بجاہ النبی طٰہٰ ویٰسین (صلی اللہ علیہ وسلم)

مؤلف

ڈاکٹر سیّد محمد عامر گیلانی

شبّیر برادرز ○ ۴۰ بی۔ اُردو بازار ○ لاہور

تصانیف علامہ عالم فقری

اللہ میری توبہ
اللہ سے دوستی
اللہ کی معرفت
اللہ کا فقیر
منازل ولایت
خزینہ اخلاق
اخلاقِ حسنہ
ہمارا اخلاق
تزکیۃ القلوب
فقری وعظ (حصہ اوّل)
سُنّی بہشتی زیور
سُنّی فضائلِ اعمال
پیغامِ مصطفےٰ
خزینہ درود شریف
آدابِ سُنّت
احکامِ نماز
" طہارت
" زکوٰۃ
" روزہ

احکامِ حج
اذکارِ قرآنی
اولیائے پاکستان (اوّل دوم)
گلزارِ صوفیاء
آفتابِ زنجان
تذکرہ علی احمد صابر کلیری
اقوالِ تصوّف
رُوحانی عملیات
رُوحانی ڈائری
برکاتِ درود
قصص الاولیاء
نماز کی کتاب
رُوحانی اعتکاف
اسمِ اعظم
فقری مجموعہ وظائف
نمازِ حنفی
پیارے رسولؐ کی پیاری دُعائیں
نمازِ مترجم

ناشر: شبیر برادرز اردو بازار ○ لاہور